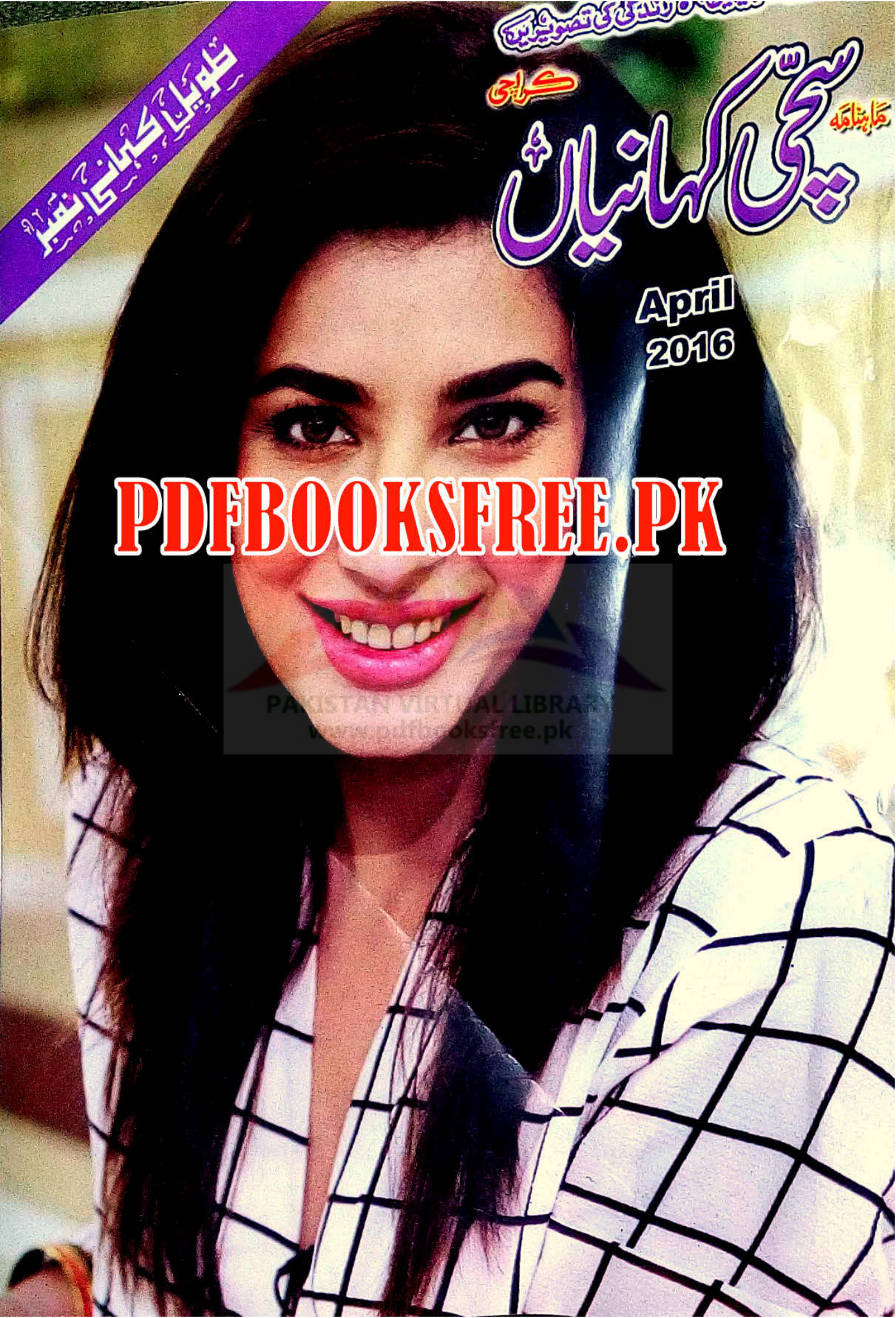




پیشہ ورانہ زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

مقامی نامہ

April
2016

PDFBOOKSFREE.PK

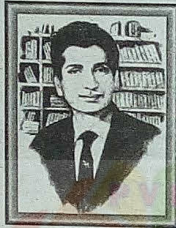
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

طویل کتنا خوب

ماہنامہ سچی کہانیاں

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



منیجر مارکیٹنگ

021-35893121

منیجر سرکولیشن

0333-2269932

مدیرہ اعلیٰ : منظرہ سہام

مدیر : کاشی چوہان / دانیال شمسی

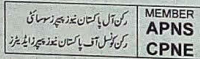
انکم ٹیکس ایڈوائزر

منحدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123



خط و کتابت کا پتہ: II-C-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کرشل

ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے * جلد: 33 - شمارہ: 04 * اپریل: 2016ء

ایڈیٹر، پبلشر: منظرہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پہلی کیشز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور کچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

07

تبدیلی

ممنون سہام



لائف بوائے

اسماء اعجاز

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو
اپنے انداز کا مایابی کے راز بھائی کی ہیں

تم مل گئے ہو

مصطفیٰ حسن لٹاری

قسمت کی تاباں یوں سے جڑی
ایک بہت خاص داستان

پتھر میرا نصیب

عائشہ طاز

اُس عورت کی درمانگی کا قصہ
جسے ہر بار قدرت نے زبرد کردیا تھا

چندر سے عبدالرحمن تک

نجیسہ سعید

اُس نوجوان کا قصہ عجیب جسے قدرت
گمراہی سے حق کی جانب لے آئی تھی

ایک تصویر ایک کہانی

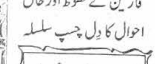
دانیال شمسی

آکھ کے کمرے میں نمودار ہو جانے والے
ان مناظر کو آپ فراموش نہیں کر سکتے

08

احوال

کاشی چھان



کرم کے فیصلے

عبدالغفار عابد

اُس دوشیزہ کی داستان جس نے
شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر غلطی

اندھیرے درپے

روشنائے عبدالغفور

اُس عورت کا قصہ بلا تیز جس نے
گمراہی میں کوئیل بنا کر نہ بھیا

پھر صبح ہوگی

محمد سلیم اختر

لچیز لکھناری کی طرف سے، شہری
پسند منظر پر ایک یادگار داستان

دو کوڑی کی عورت

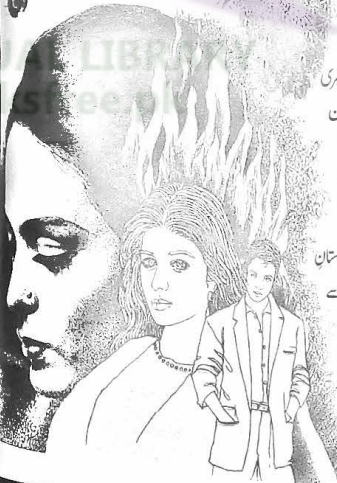
عقلمند حق

خاص نمبر کے لیے ایک بہت خاص داستان
حال بہت خاص معنوی کی جانب سے

ہم شکل

ایم اے اہت

گہری کہانیاں میں پہلی بار برصغیر
کے نامور قلم کار کا شہسختی خیز سلسلہ



فون: 021-35893121-35893122 / پرنسپل حسام الدین بھٹائی کی مشین پر لکھا OB-7 تالیپور روڈ سے کراچی

156

پکا پھل

نہایت حسین ضیاء

اُس مرد کا قصہ محبت جو بیٹوں کو
مستقبل کی پوچھی بھجتا تھا

اپنا خون

ششمال کھوسہ

اُس شخص کا قصہ جسے اپنے خون
پر بھروسہ نہ تھا

حسرت ناقص

محمدا احمد

اُس دوشیزہ کی زندگی ایک
حسرت ناقص بن کر رہ گئی تھی

گردش

جاوید اعلیٰ

ایک ایسی دینیٹی کی واردات جو
آپ کو کبھی نہ بھولے گی

مسئلہ یہ ہے

ادارہ

آپ کا مسائل کا حل، سچی
کہانیاں کا لازوال سلسلہ

تیرنیم کش

فائزین

قارئین کی سخن مہنی کو
آزماتا ایک دلچسپ سلسلہ

162

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

بیوٹی گائیڈ

معتز اسحاق

حسن کی نگہداشت سے جڑی وہ باتیں
جو قریباً آپ کی ضرورت ہیں

168

بائبل

منزل خان

اُن مردوں کے لیے آئینہ خیر جو مہنی
زحمت تقویر کرتے ہیں

بھارت میں بلیک

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے
باک قلم سے سفر نامہ بھارت

بادبان

معمان اسحق

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی
کے ایک نئے جذبے کا سفر کا ہے

زہرِ عشق

کاشی چھان

خوف اور رگوں میں ابو جمادینے
والے مناظر سے بھرپور ناول سلسلہ

ہائیڈ پارک

ذکی خان

زندگی کے رنگوں سے آلودہ گوشے
جسے قارئین خود تہیب دیتے ہیں

دوستی

دوستی کہاں کہاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ ”سچی کہانیاں“ کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برستے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ ”سچی کہانیاں“ کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سچی کہانیاں پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے ”سچی کہانیاں“ آپ سچیاں لکھتے ہیں، عزائم، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلیں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین دیر کے درمیان دلچسپ لوگ جو تک احوال۔ سب کچھ زندگی میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ

ماہنامہ سچی کہانیاں پیرل پبلی کیشنز: II-C-88 فرسٹ فلور، خیابان جلی کرشل، ڈیفنس

ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز-7، کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

تبدیلی

خان صاحب نے تبدیلی کا نعرہ لگایا اور لوگ جوق در جوق ان کے ساتھ چل پڑے۔ کیونکہ ہر شخص تبدیلی چاہتا تھا ہر پاکستانی ملک میں جاری فرسودہ نظام میں تبدیلی دیکھنے کا خواہاں تھا۔ یوں خان صاحب کا قافلہ بڑھتا چلا گیا۔ دور دراز علاقوں سے لوگ خان صاحب کی ایک آواز پر لبیک کہتے آگے بڑھنے لگے۔ دوسری سیاسی جماعتوں کے لیے بھی تبدیلی کا یہ نعرہ خطرے کی گھنٹی ثابت ہوا۔ خان صاحب ویسے بھی ہر طرح کی شخصیت کے مالک ہیں پھر تبدیلی کے نعرے نے ان کا سیاسی قد بہت اونچا کر دیا۔ مگر جلد ہی لوگوں کو ان ناچنے کا تے ہل بازی کرتے جالوں میں جا کر اندازہ ہو گیا کہ جس تبدیلی کے خواہش مند خان صاحب یا ان کی پارٹی ہے وہ درست نہیں۔ اکثریت کا یہ ماننا ہے کہ سیاست میں سنجیدگی ضروری ہے۔ سیاست دان کا بھی سنجیدہ اور بردبار ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سیاست اور سیاست دان ہی دنیا کے سامنے پاکستان کا مثبت چہرہ لانے کے ذمہ دار ہیں۔ لہذا کھیل تماشے سیاست میں ناقابلِ قبول ٹھہرے۔ تبدیلی ضرور آئی جاوے مگر تبدیلی منثور خان صاحب کی پارٹی کا تھا مگر تبدیلی آگئی ان لیک میں۔ وہ لوگ جو خان صاحب کی طرز سیاست سے نالاں تھے ان لیک میں آنے والی تبدیلی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ تبدیلی بھی ایسی جس نے دور جہالت کے تمام بُت توڑ ڈالے۔ وہ بُت جو لوگوں نے اپنے ذہنوں میں بھی بنائے تھے وہ بھی پاش پاش ہو گئے۔ سربراہ وقت نے اپنے جانشین کے طور پر اپنے بیٹے کو نہیں بلکہ بیٹی کو منتخب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مریم نواز وزیراعظم پاکستان کی جانشین ثابت ہوں گی۔ اس کو کہتے ہیں تبدیلی جو صرف نعرے کی حد تک محدود نہ ہوں بلکہ عملی طور پر بھی ثابت ہوں۔ میں بطور پاکستانی عورت نواز شریف صاحب کی اس نوازش کا خیر مقدم کرتی ہوں۔

ہم مائیں ہم بہنیں ہم بیٹیاں منزہ سہام قوموں کی عزت ہم سے ہے

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور ان کے جواب

پیارے ساتھیو! کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ ہم سب ملیں۔ اکٹھے ہوں۔ محفلیں سجائیں۔ جس بھری باتیں کریں۔ سادہ جیسی امیدوں کی ناک کو زات کے سمندر میں اتار دیں اور بس آپ ہوں اور ہم ہوں۔ کہنے کو بہت کچھ ہے مگر..... صرف کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ لفظ لفظ جمع کر کے احوال کی ابتداء کر رہا ہوں مگر..... یہ لفظ سمنے ہی نہیں۔ ہر لفظ تھوڑی تھوڑی دیر بعد تپتی کی صورت ورق سے آزاد ہو کر اڑنے لگتا ہے۔ بہار کی جستجو میں میں اپنے الفاظ اڑنے دیتا ہوں۔ کاش کہ میں ٹھنڈیوں کی اس زمین پر محبت کی آبادیاں آباد کر سکوں میری خواہش ہے کہ سب انسان آپس میں انسان بن کر رہیں۔ جب ہم انسان بن کر رہیں گے تب ہی تو امن کا قیام بھی ممکن ہوگا۔ اور ساتھیو! جب امن کا قیام ممکن ہوگا تب ہی تو ہم اکٹھا ہوں گے۔ محفلیں سجائیں گے۔ رس بھری باتیں کریں گے اور ہماری امیدوں کے سادہ محبت کرنے والوں کی مقدس پتھریاں جگمگوں دیں گے۔ میں نے تو اپنے دل کی باتیں کر دی ہیں۔ کیا آپ لوگ بھی میری اس امید کے لیے یقین نہیں گے..... آئیے ساتھیو! محبت کی کوئے سے ماتھے روشن کرتے، تختیوں کے رنگوں کو آنکھوں میں بسائے احوال کی ابتداء کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں سب سے پہلے ہمارے احوال کے مہمان کون ہیں۔

✉: کراچی سے مومینہ بٹول رضا ہماری سب سے پہلی مہمان ہیں۔ لکھتی ہیں۔ کچھ مصروفیات زندگی نے رابطہ کرنے میں سستی دکھائی اور تقریباً دو ماہ سے حاضر محفل نہ ہو سکی مگر مطالعہ ضرور جاری ہے۔ کاشی تمہاری محبت خود سے بول رہی ہے۔ کہانیوں کا معیار اور بہتر ہو رہا ہے۔ احوال محفل بھی اچھی جا رہی ہے تمام دوستوں کو سلام محبت۔ اس مرتبہ بھی تبصرے جاندار ہیں۔ جنوری فردوری کے دونوں شمارے بہت اچھے لگے اور دل سے تمہارے لیے دعا نکلی۔ اس مرتبہ ایڈیٹر صاحب کی ایک خبر اور بازی لے گئی کیونکہ یہ آج کل ہمارے معاشرے کی زندہ حقیقت ہے..... کاش..... ایم یعقوب صاحب کی 'آستین کے سانپ' نے کوئی تاثر نہ چھوڑا نہ ہی نعمان اسحاق صاحب کی 'بادبان' نے متاثر کیا۔ باقی کاوشیں اچھی

رہیں اور جناب آپ کی کاوش زہر عشق بھی۔ محویت قائم کر دیتی ہے۔ ایتھے جارہے ہو کاشی۔ گر
 بُرا نہ مانو تو عرض ہے کہ 'لائف بوائے' والا سلسلہ اب کچھ پور کرنے لگا ہے۔

☆: اچھی بہن! سلامت رہے۔ آپ کی تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ باقی دیگر تجاویز کے لیے عرض یہ ہے کہ کچھ پروفیشنل چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ سو.....

طاہرہ طاہرہ! گاؤں سیداں کمال۔ راولپنڈی سے یہ پہلی آمد ہے۔ طالبہ داؤد کی۔ لکھتی ہیں۔ میرا نام طاہرہ داؤد ہے میں گاؤں سیداں کمال میں رہتی ہوں۔ مجھے کہانیاں پہلے بہت اچھی لگتی تھیں میں اچھی تھی۔ لیکن پھر جو کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ کہانی میں نے پہلی بار آپ کے ذرا تجسٹ میں لکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میری کہانی پسند آئے گی اور ضرور شائع ہوگی۔ میں خیم کلاس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ اب میرے امتحان ہونے والے ہیں۔

☆: اچھی گڑیا! خوش آمدید! کہانی پڑھ کر رائے دیں گے۔ احوال میں ضرور شرکت کرو۔ یہ رابطوں کی کہنشاں ہے۔

✉: کراچی سے قسیم سحر نے ہمیں یاد کیا ہے۔ لکھتی ہیں۔ اب عرض یہ کرنا ہے اگر کوئی آپ کو کہانی بھیجتا ہے اور اگر وہ قابل اشاعت ہے تو آپ شائع کر دیں اور اگر نہیں ہے تو پھر فون کرنے پر منادیں کہ نہیں چھپ سکتی تاکہ انتظار کی اذیت ختم ہو جائے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ مختلف موضوع پر لکھوں لیکن آپ لوگ حوصلہ افزائی ہی نہیں کرتے۔ عورت کو صرف یہ مسئلہ نہیں ہے کہ اس کو ماموں یا چچا کے بیٹے نے پسند نہیں کیا۔ عورت کو بے شمار مسائل ہیں اور ہمیں ان کو اجاگر کرنا چاہیے اور یہ کام آپ لوگ بہت بہتر کر سکتے ہیں۔ خیر مزید کہانیاں بھیج رہی ہوں امید کرتی ہوں آپ کو پسند آئیں گی۔

☆: اچھی بہن! ہم نے تجی کہانیاں کے علاوہ دوشیزہ میں بھی آپ کو شائع کیا۔ اگر ہم حوصلہ افزائی نہ کرتے تو پھر نئے راسخو کی کھپ کوں نظر آ رہی ہوتی۔ احوال سے دوری آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی مثال ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ فون پر آپ کو سراہا ہے حوصلہ افزائی کی ہے مگر آپ کا گلہ..... بلند کہانیاں اشاعت کے مراحل طے کر رہی تھیں۔

✉: زیر غازی خان سے ہماری بہت اچھی بہن ارم خان عرض گزار ہیں۔ آپ کا بے حد شکریہ کہ میری کہانی کو ایورڈ یافتہ کہانیوں میں شامل کیا مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میری کہانی یہ مقام حاصل کر سکتی ہے۔ بھیجا ہی ہے حد شکریہ۔ اب آتی ہوں شہار کے کی طرف۔ رسالہ ملت ہی اپنے من پسند سلسلے احوال کی طرف دو دو لگاڑی ہر ماہ کی طرح اس بار بھی کچھ نئے لوگوں کو احوال میں شامل پایا۔ خوش آمدید۔ اب ذکر ہو جائے ان پیارے پیارے بہن بھائیوں کا جنہوں نے مجھے یاد رکھا۔ منزل خان آپ کے مشورے پر عمل نہ کریں کیسے ہو سکتا ہے۔ غلطی شکور بہنوں کو شکریں نہیں کہتے۔ سونیا خان، اچھی بھائی صائمہ مجید، بیانی سہیل ملازم حسین شیرازی، مجید احمد جانی، راشد لطیف، ڈاکٹر خادم

سانحہ ارتحال

ہمارے بہت عزیز لکھاری اور شاعر ساتھی عبدالعزیز جی آ کی والدہ گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں عبدالعزیز جی آ کے ساتھ ہے۔ اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

تبصرہ کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ تو خود اپنی مثال آپ ہیں۔ آخر وہ ایم اے راحت اور کاشی چوان جیسے بڑے ادیبوں کے قلم کی کاوش ہے۔

☆: پیاری بہن! کہانیاں جلد شائع ہوں گی۔ مہمان داری سے بڑی ذمہ داری اور کیا ہوگی بھلا۔ ایوارڈ آپ کا حق تھا۔

✉: ہماری ساتھی لکھاری کرن شبیر کراچی سے ایک عرصے بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ سلام سر! امید کرتی ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ بہت عرصے بعد احوال میں احوالی بن کے آئی ہوں۔ خوش آمدید نہیں کہیں گے۔ لیکن ایک قاری کی حیثیت سے ہمیشہ ساتھ ہوں۔ سرورق ہمیشہ کی طرح لا جواب تھا۔ احوال سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے اسماء اعوان کے لیے 'لائف بوائے' ایوارڈ تو بتاتا ہے۔ سلیم اختر صاحب کا تحفہ خاص واقعی اس شارے کا شاہ کار تھی۔ 'ناسور' ڈراپ سین، عمدہ رہیں۔ 'فاطمہ گل' میرے کشمیر کی ننھی شہزادی پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ شمیمہ فیاض فرسودہ معاشرے کی روایات کی عکاسی کرتی نظر آئیں۔ ایم یعقوب، ضرغام محمود اچھے انداز میں آئے، ایم اے راحت سر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ جس کہانی کو پڑھ کے ایک پل دل کی دھڑکن رک گئی وہ تھی ایڈیسن ادریس کی 'ایک خبر اور ارم ناز، فوزیہ، حنا بشری ہمیشہ کی طرح خوب سے خوب تر رہے۔ بھارت میں بلیک لسٹ، محمود شام زبردست، مقصود احمد بلوچ، شانی خامان، نوشاہہ صدیقی، ثناء کنول، ریکسہ خالد، الماس فاطمہ تمام لوگوں کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ زہر عشق پہلی قسط سے جو سحر میں جکڑا اس کی گرفت اب تک مضبوط ہے۔ جاوید راہی، بیک وقت خوف تجسس سے بھری کہانی لے کر حاضر ہوئے۔ نعمان اسحاق 'بادبان' کے ساتھ تشریف لائے اس پر تبصرہ ادھار۔ بابا جی خلیل خدا کے جیسے کام آ رہے ہیں اس کا اجر انہیں دعاؤں میں ملے گا۔ خدا ہمیشہ انھیں تندرست رکھے آمین۔ ہم جیسے بہت سے نوآموز لکھاریوں کے لیے 'جی کہانیاں' ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔

☆: پیاری کرن! گڑیا ویکم بیک ٹو۔ اب تم آگئی ہو تو بس اب آمد مستقل بناؤ اور انشاء اللہ کہانیاں بھی جلد اشاعت پذیر ہوں گی۔

✉: جہانیاں منڈی، ضلع دہاڑی سے پہلی پہلی آمد ہے ایم عاصم بوٹا صاحب کی۔ لکھتے ہیں۔ جناب میں تقریباً عرصہ 10 سال سے میں اپنے قلم کو حرکت دے رہا ہوں۔ ماہنامہ 'جی کہانیاں' کا تعارف، تحریری انداز میں بہت سارے دوستوں سے ہو چکا تھا۔

حسین کھڑا۔ اچھے بہن بھائیو میرے تبصرے کو پسند کرنے کے لیے اور مجھے یاد رکھنے کے لیے بے حد شکریہ۔ جس طرح مجھے آپ سب یاد رکھتے ہیں اسی طرح دعاؤں میں بھی رکھا کریں۔ ایم یعقوب بھائی میں ٹھیک ہوں اور ہر ماہ جی کہانیاں میں حاضر ہوتی ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔ اللہ پاک آپ کو اچھی صحت نوازے آمین۔ کہانیوں میں 'یہ دوستی ہے' ڈراپ سین، 'ناسور' فاطمہ گل، قسمت کے ٹھیلے نرالے ہیں کوئی خوشیاں لادے روایات کی دلدل' آپ اپنے دام میں 'قاتل' تلاش' بلند بخت' ذرا سی غلطی' ایک چھوٹی سی نیکی' ازالہ وہ کون تھی' پڑھی زبردست۔ بھیا جی بے حد شکریہ آپ نے میری دوسری کہانی کو بھی جی کہانیاں میں جگہ دی ایک بار پھر بے حد شکریہ۔ حبیب الرحمن بھائی معذرت کیوں؟ بھائی بہنوں سے معذرت کر کے بہنوں کو شرمندہ نہیں کرتے۔ اللہ پاک آپ کو بہت جلد رہائی دے گا انشاء اللہ۔ وہ بڑا ہی رحم کرنے والا ہے اس کے بندے کے مانگنے میں دیر ہے اس کے عطا کرنے میں نہیں۔ پراسرار کہانیوں میں ستر ہواں مسافر، مجھے معاف کر دو رقم نمبر 607، بھوک، عرش کون تھی، ہانڈی، سرخ لیموں، تمہارے ساتھ ساتھ دوسری دنیا کا عشق اچھی کہانیاں تھیں جن کے نام نہیں لکھ سکا ان تمام سے معذرت۔ اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

☆: پیاری ارم! مارچ کے شمارے میں اپنی کہانی دیکھ کر یقیناً تم خوش ہو گئی ہوگی۔ تبصرے کا شکریہ۔ بیٹا تم سب کی محبت پر پچے کو چار چاند لگاتی ہیں۔ خوش رہو، خوشیاں بانٹتی رہو۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن تسلیں غزالہ نبیاء کی لکھتی ہیں۔ میری کہانی 'دکینہ' شائع کرنے اور ایوارڈ کے لیے منتخب کرنے کا بہت شکریہ۔ پچھلے دو مہینوں سے بہت مصروفیت رہی۔ خاندان میں شادیاں۔ نئے مہمانوں کی آمد اور جرمی سے آئے ہوئے بیٹے بھوک مہمان داری سے اتنا وقت نہیں ملا کہ تنجیدگی سے 'جی کہانیاں' کا مطالعہ کر سکتی۔ بس جلدی جلدی میں پڑھ لیا۔ اب سب تقریبات ختم ہوئی اور مہمانوں کے جانے کے بعد فردری کا شمارہ تفصیل سے پڑھنے کے بعد آپ کو خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت، بیماروں کے لیے دعائے شفا اور جن کو خوشی نصیب ہوئی ان کو مبارک باد کے بعد سب سے پہلے منہ سہام مرزا کا 'اسمارٹ فون' پڑھا واقعی سچ کہا منہ نہ۔ اس کے بعد اسماء اعوان صاحبہ لائف بوائے شیمو سے رشتوں ناتوں کی دھول صاف کرتی نظر آتی ہیں۔ جیسے لائف بوائے شیمو سے بال دھل کر صاف ستھرے سکی اور شائیں نظر آتے ہیں اسی طرح آپس میں جڑے رشتے بھی صاف شفاف اور پر خلوص کر کے دکھارہی ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ محمد سلیم اختر کی یہ دوستی ہے بہت اچھی لگی۔ اقبال بانو صاحبہ کا 'ڈراپ سین' بہترین کہانی تھی۔ ریکسہ خالد صاحبہ کی 'ایک چھوٹی سی نیکی' نے بھی بڑا متاثر کیا۔ اسی طرح ممتاز احمد صاحب کا 'ازالہ' بھی بہت اچھا لگا۔ ثناء کنول کی 'ذرا سی غلطی' نے بھی متاثر کیا۔ باقی سب کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ 'جی کہانیاں' میں اچھی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہم شکل، اور زہر عشق، پر ہم جیسے طفل کتب

دوستوں نے اس میں لکھنے کی رائے سے بھی نوازا تھا۔ خاص کر جناب محترم رفعت محمود صاحب نے 'جی کہانیاں' میں لکھنے کا بھرپور انداز میں کہا ہے۔ ایک شام میں دن بھر کی مصروفیات کے بعد جہانیاں منڈی سے ماہ جنوری کا پرچہ خریدا جیسے ہی مطالعہ کے لیے ورق گردانی کی تو بہت سارے چہرہ دل کو اپنی جان پہچان والے پایا۔ کاشی چوہان صاحب اس بار ایک لیبر کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہوں۔ امید ہے میری اس کوشش کو ردی کی نوکری کی نظر کر کے حوصلہ شکنی نہیں کرو گے۔ زندگی نے وفا کی تو بہت جلد ایک کاوش لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔

☆: پیارے بھائی یونا عاصم! خوش آمدید۔ آپ کا تعارف تو ہو گیا۔ اب ذرا دیکھیں آپ کی تحریر میں کتنا دم ہے۔ انتظار رہے گا۔

✉: سرگودھا سے ہمارے بہت ممتاز لکھاری ممتاز احمد شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔ مارچ کا شمارہ پراسرار نمبر موصول ہوا اس بار نائل بہت ہی دلنشین اور جاذب نظر تھا۔ ادارہ میں منظرہ بہانے "الفاظ کھو گئے" کے عنوان سے مرحومہ فاطمہ ثریا بیجا کو خراج عقیدت کے ساتھ اُن سے وابستہ اپنی بے پناہ محبتوں کا ذکر کیا۔ احوال میں کاشی بھائی نے بھی اُن کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ ماشاء اللہ جی کہانیاں دن بدن خوب سے خوب تر ہوتا جا رہے ہیں۔ یار کاشی ایک بات تو بتائیں پراسرار نمبر پڑھ کر مجھے تو اب یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ آپ میں کی جن کی روح تو نہیں آگئی؟ اتنا کام اور پھر دن بدن احوال میں دوستوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ پاک آپ کو نظر بد سے ہمیشہ بچائے۔ آمین۔ احوال سب دوستوں، بہن بھائیوں کے خوب صورت خطوط اور تبصروں سے جگمگا رہا تھا۔ سب سے پہلے میں تہہ دل سے انتہائی ممنون و مشکور ہوں۔ اُن تمام بھائیوں اور بہنوں کا جنھوں نے میرے خطوط اور کہانی کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ کنول عمران خان شادی کی سال گرہ مبارک ہو۔ زینہ جو نیچو، سنبھل، بہن، نازہ یہ بتول رضا بہت بہت شکر یہ خیر مبارک۔ بہت ہی پیاری بہن ام دل احوال میں آپ کا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ محترم حبیب الرحمن، محترم ملازم حسین شیرازی صاحب آپ سب کی دعاؤں میں شامل ہیں۔ ہماری قابل صدا احترام بہن محترمہ پروفیسر صفیہ سلطانہ ایک عرصے کے بعد تشریف لائیں۔ آپ کا خوب صورت اشعار سے مزین خط احوال کی زینت بنا آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ عمارہ ناز کو احوال میں خوش آمدید آپ کا بے حد شکر یہ جو آپ میری کہانیاں سب سے پہلے اور شوق سے پڑھتی ہیں۔ لائف یو آئے کمرشل کہانی حسب معمول زبردست رہی۔ محترم سلیم اختر کی کہانی "ستر ہوا مسافر" کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ حنا بشر کی "مجھے معاف کر دو" پراسرار نمبر کی واقعی خاص اور لاجواب کہانی تھی۔ روم نمبر 607، گم شدہ چہرہ، بھوک، عرش کون تھی، ہانڈی، سرخ لیمن، دوسری دنیا کا آخری عشق، بہترین کہانیاں تھیں۔ علی حسین تابش

مبارک باد

ہمارے دیرینہ رفیق ہرول عزیز، سدا بہار لکھاری محمد سلیم اختر صاحب کی چھوٹی بیٹی جو یہ سلیم کی شادی خانہ آبادی گزشتہ ماہ 18 مارچ کو انجام پائی۔ ادارہ اس پر مسرت مونی پو سلیم اختر ادا ان کے اہل خانہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

"سنیو لیے" نازہ یہ بتول رضا "تمہارے ساتھ ساتھ" فرح انیس کی "اٹھ کہانیاں اک کردار، نزہت نازی" ایک پل میں سب کچھ، تحسین جو نیچو کی "مہانتانگ" اچھی کہانیاں تھیں۔ کیسا راز، ہماری ادھوری کہانی، سب کچھ تیرا ہے، وہ بڑھیا کون تھی؟ نجات، مینا دے یا..... مایا، پچھل پیری، حلوہ کھاؤ گی، پراسراریت سے بھری عمدہ کہانیاں تھیں۔ بادبان ابھی نہیں پڑھ سکا۔ جاوید راہی کی "مینی باجی"، ایک عبرت انگیز کہانی تھی۔ ہائیڈ پارک میں خضر حیات، مسز نگہت غفار، ریاض حسین تبسم، فرح انیس اور صائمہ بشیر کے انتخاب بہت بہترین اور لاجواب تھے۔ محمد قاسم خان بلوچ، علی حسین تابش اور روبینہ ناز رو کی شاعری بہت شاندار تھی دل میں اتر گئی۔ شامہ اختر اور حنا لطیف کے لطیف مزے کے تھے۔ آخر میں سب دوستوں کو خلوص بھرا سلام اب اجازت چاہوں گا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو.....

☆: اچھے بھیا! تبصرے کا، اتنے مزیدار تبصرے کا شکر..... امید ہے آپ ان نقطوں کی زبان سمجھ گئے ہوں گے۔ اگلی بار معافی نہیں ملے گی۔

✉: کمالیہ سے یہ آمد ہماری نئی شاعرہ بہن، عمارہ ناز کی لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے نہ صرف میری غزل اور خط کو سچی کہانیاں کے قیمتی صفات پر جگہ دی بلکہ خوش آمدید اور ویگم کیا تو اب انشاء اللہ میں بھی اپنا فرض اور وعدہ نبھانے کی اور ہر ماہ حاضری لگوانی پر ہاروں گی۔ ماہ مارچ کا پراسرار نمبر چار تاریخ کو پڑھا۔ جی بات یہ ہے کہ پراسرار جنوں جنھوں اور جاویدوں نے کہانیاں پڑھ کر بہت ڈر لگتا ہے تو آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر پڑھنا شروع کیا ہے۔ ابھی تک چند ایک کہانیاں ہی پڑھ پائی ہوں۔ سب سے پہلے ممتاز احمد صاحب کی لکھی ہوئی کہانی حسد کی آگ پر بھی جو کہ بہت ہی سبق اور نصیحت آموز تھی۔ نازہ یہ بتول رضا صاحبہ کی لکھی ہوئی کہانی تمہارے ساتھ ساتھ پڑھی۔ بہت خوب بڑی شاندار کہانی لکھی انھوں نے۔ انکل محمد سلیم اختر کی لکھی کہانی ستر ہوا مسافر بہت لاجواب، بہترین کہانی تھی۔ علی حسین تابش صاحب کی لکھی کہانی سنیو لیے بہت اچھی کاوش تھی۔ پسند آئی۔ فرح انیس کی لکھی کہانی اٹھ کہانیاں اک کردار۔ نزہت نازی کی لکھی کہانی ایک پل میں سب کچھ اور ام خان کی کہانی سب کچھ تیرا ہے بہت شاندار کہانیاں تھیں۔ تحسین جو نیچو کی مہانتانگ بھی اچھی کہانی تھی۔ بس ابھی تک اتنا ہی پڑھ پائی ہوں۔ ہائیڈ پارک میں محمد قاسم خان بلوچ، علی حسین تابش کی غزل بہت زبردست تھیں۔ پسند آئیں۔ روبینہ ناز رو کی نظم ہوا کی بیٹی بہت عمدہ کام تھا دل میں اتر گیا۔ محمد قاسم خان بلوچ صاحب

آگ بھی بے مثال تھیں۔ دونوں ہمیشہ اچھے لکھتے ہیں۔ بلکہ ہم آپ دونوں سے سیکھتے بھی ہیں۔ آخر میں ایک بات کہ سدرہ النور علی کا خوب صورت تبصرہ موجود تھا مگر پراسرار نمبر کے لیے ان کی کہانی کیوں غائب تھی؟ اجازت سے پہلے تمام احوالیوں کے لیے بہت سی دعائیں۔ سب کو سلام اور بہت پیار۔

☆ بہت اچھی حنا! تبصرہ بہت شاندار رہا۔ بالکل تمہاری کہانیوں کی طرح۔ بس بیٹا ہمیں ہر ماہ یاد کر لیا کرو۔ احوال میں سب احوال ایک دوسرے کو خوش اور غم کے شریک ہوا کرتے ہیں۔

☆ بھڈالی سے ہمارے قاری ساسی نعیم اللہ بڑے دنوں بعد احوال میں حاضر ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ چند ماہ بعد احوال میں شرکت کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق تو پراسرار کے عین مطابق بہترین لگا۔ پھر اشتہارات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے منظرہ سہام کے اداریہ پر پہنچے۔ ”الفاظ کھو گئے“ بہت خوب لکھا۔ اس کے بعد کہانیوں کی باری آئی تمام لکھاریوں نے خوب لکھا۔ ستر ہواں مسافر محمد سلیم اختر۔ مجھے معاف کر دو! خاشا شری۔ روم نمبر 607، نفیسہ سعید۔ ”گم شدہ چہرہ شانی خانام“، ”بھوک رضوان پر نس“، ”عشر کون تھی؟“، ”مازیہ ملک“، ”ہانڈی“، ”شائستہ انور“، ”ناپ کی کہانیاں“ تھیں۔ ان کی تعریف کے لیے الفاظ کم ہیں بہت خوب زبردست۔ ایک تصویر ایک کہانی، دانیال عیسیٰ، بہترین سلسلہ ہے۔ کاشی چوہان کا ناول زہر عشق اور ایم اے راحت کا ناول ”ہم شکل“ بہترین جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی کہانیاں سچی نہیں ہیں۔ امید ہے بہترین بہترین ہوں گی۔ کیونکہ بہترین کہانیاں سچی کہانیاں میں ہی ہوتی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہ نامہ سچی کہانیاں کو دن دو گنی رات چوٹی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆ پیارے نعیم! ہماری بھی اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس طرح تم نے اس بار خوب صورت تبصرہ لکھا تمہیں بہت اچھا لکھنا بھی آجائے خوش رہو۔ امید کے ساتھ۔

☆ احوال میں یہ شرکت ہے ہماری آپا سمنوید ہاشمی کی کراچی سے۔ لکھتی ہیں۔ میرے دوستوں اور ساتھیوں کیسے ہیں آپ لوگ۔ منظرہ سہام نے اسرار فنون پر بہت خوب صورت لکھا۔ کاشی چوہان کے احوال میں قدم رکھا تو ایسا محسوس کرتی ہوں کہ کہیں سے ٹھوم پھر لو ٹکرائے گھر کا جو مزہ ہوتا ہی سکون اپنوں کی محبت وہ کاشی چوہان کے احوال میں نظر آتی ہے یہ سب آپ کی محبت کا ثبوت ہے۔ میں سچی کہانیاں بھی پڑھتی ہوں اور دوشیزہ بھی۔ مگر احوال میں ماشاء اللہ تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ سنہل کی بیوی سدرہ النور علی آپ سب کو خوب صورت خطابات سے نوازتی ہو میری گڑیا میں بھی آپ کو ایک خطاب دینا چاہتی ہوں۔ ہماری (لاڈلی گڑیا) جو ہم سب کی چیت جیتی ہے۔ ذہین محبت کرنے والی لاڈلی گڑیا پسند آیا اپنا خطاب۔ اسامہ اعوان کو آنتف بوائے کو کامیاب بنانی جا رہی ہیں۔ شانی خانام کے والد کے لیے دعا گو ہوں۔ خدا ان کو صحت عطا فرمائے۔ سیم سکینہ صدف کے غم میں ہم برابر شریک ہیں۔ سب دوستوں کا شکر یہ جنھوں نے ہمیں مبارکباد پیش کی۔ یعقوب احمدانی

اب طبیعت کیسی ہے؟ سونیا اور سدرہ آپ نے یاد کیا۔ ہم حاضر۔ مجید احمد جائی بھائی اب طبیعت کیسی ہے محمد سلیم اختر اپنی دوستی بہت خوب صورتی سے تحریر کر رہے ہیں۔ اقبال بانو ڈراپ سین میں اپنا گھر بچانے کی ترکیب بتا رہی ہیں۔ ناسور میں نسرین غرور اور ٹھٹھنڈ کو نیچا دکھا رہی ہیں۔ فاطمہ گل جو بہادر بیٹی کی کہانی ہے پسند آئی۔ مازیہ بتول سوتن کی کیمپلی بتا رہی ہیں اور زندگی آسان کر رہی ہیں۔ منعم اصغر نے اپنی چابی کی محبت اور غم کو بہت خوب صورتی سے تحریر کیا۔ شبنم فیاض وٹے کی رسم پر کہانی پیش کی۔ محمد قاسم خان بدعا سے ڈراتے ہوئے نظر آئے۔ خرفام محمود نے ایک مجبور دوشیزہ کی کہانی بہت خوب صورتی سے پیش کی۔ ایم یعقوب دوست نما دشمن سے ہوشیار کراتے نظر آئے۔ ایم اے راحت کی ہم شکل، کاشی چوہان زہر عشق ڈائجسٹ کا دل ہے دل نہ ہوتا جسم میں کچھ نہیں رہتا۔ ایڈیس معاشرے کی چابی پیش کر رہے ہیں۔ ارم ناز معاشرے کی اقدار کو محسوس کرنی تحریر لائیں۔ فوزیہ احسان رانا آپ کی تحریر پسند آئی، بدھرام احسان فراموش کی کہانی، خاشا شری نے بیٹوں پر غرور، بیٹی پر انفسوس کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا۔ مقصود احمد بلوچ لاچ نے بھائی کی جان لے لی۔ تحریر پیش کی، شانی خانام اچھی تحریر تھی۔ نوشابہ، شاکول، رئیسہ خالد، الماس فاطمہ کی حکایتیں پسند آئیں۔ نعمان اسحاق پہلا حصہ چھاپا۔ ممتاز احمد پیٹ فارم پر ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت کہانی لارہے ہیں۔ ہائیڈ پارک میں سکول جی، انیس الرحمن جھانے، تیرنیم کش میں ایم افضل، اشفاق شایین، رویہ شینا پسند آئے۔ اب اجازت پراسرار نمبر میرے ہاتھ میں ہے۔ مزے لے لے کر تھوڑا ڈر ڈکرانجوائے کر کے اکی کی طرح پڑھوں گی۔ اجازت۔

☆ پیاری آما مزید ارکھنا میٹھا تبصرہ دل لے گیا۔ خوش رہیے۔ آپ کی محبتوں کے مان ہمیں میسر کرتے ہیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسے محبت کرنے والے ہمارے اپنے ہیں۔

☆ اسلام آباد سے ہماری نٹ کھٹ عظمیٰ شکور صاحبہ کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کیسے ہیں آپ! خود تو آپ مسکرا رہے ہیں اور ہماری موت کا سامان کیسے ہیں۔ اور نہیں تو کیا۔ پراسرار کہانیاں پڑھ کر کسی روز بھی ہم پراسرار کہانی بن جائیں گے۔ مارچ کا شمارہ خوفناک کھو پڑیوں، جنات پریاں لے حاضر ہوا۔ ”اُف! کانپتے ہاتھوں سے جیسے ہی کھولتے ہیں تو روح جیسے فنا ہو رہی ہے۔“ چلیں جی کہانی خوفناک ہے مان لیتے ہیں۔ اس پر طرہ کہ خوفناک تصویریں۔ یا اللہ آنکھیں بند کر کے پڑھیں کیا۔ فاطمہ ثریا بیچا کی موت واقعی ایک بہت بڑا صدمہ تھی۔ منظرہ سہام کی اُن سے محبت اُن کے لفظوں سے جھلک رہی تھی۔ آگے بڑھتے ہیں تو احوالیوں کی محفل بھی ہے۔ ہر کوئی سچی کہانیاں سے محبت میں سبقت لے جانے کو ہے۔ واہ!! ختی خوش ہو گیا۔ اُف!! آگیا وہ مرحلہ..... ہاں جی..... خوف ناک کہانیاں اور میں اکیلی جان۔ بہت سا حوصلہ جمع کر کے پڑھنا جو شروع کیا تو اسلام آباد کی ہلکی ہلکی سردی میں بھی سینے کی تھنی تھنی بوندیں پیشانی کو جگنو لگیں۔ محمد سلیم اختر صاحب پنڈی ایبٹ آباد کا سفر بھی استاطویل نہ لگا جو آج محسوس ہوا۔



آپ سچی کہانیاں کے خریدارین کو ملکہ
نرمبادلہ پیشگی

اندر دواں ملکہ = 890/ روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آئی جی ہارورڈ کے 88-C فرسٹ فلور۔ خیابان جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893124

ستر ہواں مسافر..... موت کے سائے میں لکھی گئی یہ کہانی لمحہ بہ لمحہ اپنی طرف متوجہ کرتی رہی اور اینڈ۔
موت پر کیا گیا۔ ہمیں تو لگا کہ جیسے وہ قبرستان ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ جنازشی مجھے معاف
کردو۔ قسم سے آپ ہمیں واقعی معاف کر دیں۔ نہ ڈرا یا کریں اتنی خوفناک کہانی لکھ کر۔ اُس بے
جاری کو ڈاکٹر بنا کر مار ڈالا..... کس قدر دھکی کہانی تھی۔ ابھی چھپاں کہانی کا دکھ آنکھوں سے بہہ رہا تھا
کہ گشتہ چہرہ ہوش اڑنے کو آ گیا۔ شانی خانان کے قلم سے تحریر کردہ یہ روح فرساقصہ روح
دہلا دینے کو کافی تھا۔ میرے ہی جیسی تھی بے چاری، پرانی یادوں سے محبت کرنے والی مگر بدلے
میں عمر بھر کی اذیتیں ملیں۔ نادیہ ملک کمال جی..... آپ کی اسٹوری نمبر لے گئی۔ مطلب ایک روح
کے ساتھ رہتی رہیں۔ یا اللہ! کہاں جائیں ہم۔ ڈرے کیسے چھپیں ہم، مارے دے رہا ہے یہ خوف
۔ شائستہ انور "ہانڈی" لیے تشریف لائیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ جن بہت زبردست قسم کے عاشق
ہوتے ہیں۔ مطلب قبر میں ہی ساتھ اتر گئے۔ اللہ اکبر۔ علی حسین تابش کی تحریر کردہ کہانی منہو لیے
بھی توجہ کا مرکز رہی۔ مطلب لوگوں کے دلوں میں اس قدر حسد اور نفرت پائی جاتی ہے کہ وہ انسانی
زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ حد سے حد..... بس جی مزید ہمت نہیں کھی کہانیاں پڑھنے کی۔
سو ہائیڈ پارک چلے ہم۔ دو تین لمبے سانس لینے کے بعد طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو نظروں کے
سامنے رنگ رنک کی تحریریں موجود تھیں۔ ارے..... یہاں میں بھی..... اودھ پھینکس ایڈیٹر صاحب!
آپ بہت اچھے سے چند نم زدہ شعر پڑھے اور اپنی پُرسرت زندگی میں مصروف ہو گئے ہم۔
لیں جی!!! اب ملیں گے گرمیوں میں۔ اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیے گا۔ دعائیں بہت ساری۔

☆: ارے عظمیٰ جی! آپ کے ہاں پورا سال ساون رہا اور ہم کراچی والوں نے تو فروری میں
بھی لوکے مزے لے لیے۔ ہمارے ہاں موسم گرما ہی مستقل ٹھہر گیا ہے۔ جائے سورج راجہ کو ہم
سے اتنا پیار کیوں ہے۔ تبصرہ زبردست رہا آپ کا۔

✉: پورڈی شریف، خیر پور ناٹھن شاہ سے ہماری پیاری لکھاری بہن تحسین جو نیچو عرض کرتی
ہیں۔ اب کی بار اپنے محبوب پر پے کا شدت سے انتظار رہا کہ میری بھی تحریر اس کا حصہ بننے جارہی
تھی۔ اس عنایت پر بے حد ممنون ہوں۔ کاشی بھیا! یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی تو ہوتی ہیں جو جینے کا
حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ ادارہ "الفاظ کھو گئے" ادب کی دنیا کا معتبر نام فاطمہ ثریا بیجا اب ہم میں نہیں
بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائی۔ آمین۔ سید ملازم حسین صاحب کے احوال
نامے نے بخش کی روایت میں اضافہ کیا۔ بہت خوب۔ حبیب الرحمن صاحب، عمارہ ناز جی محفل احوال
کا حصہ بننے پر خوش آمدید۔ سدرہ انور علی میری شہزادی تمہاری دعا سے میں اب الحمد للہ بالکل
ٹھیک ہوں۔ بس تم اپنا خیال رکھا کرو جانی۔ اللہ پاک تمہیں سلامت رکھے۔ اچھی صحت کے ساتھ
۔ آمین۔ منعم اصغر، سدرہ انور علی، سونیا خان اور صائمہ مجید بھائی تبصرہ پسند کرنے پر بے حد مشکور
ہوں۔ مور شاہد حسین بھائی اور اشفاق شاہین بھائی کہاں ہیں آپ؟ حاضری لگوائیے۔ کاشی بھیا

آپ کو 14 اپریل، یکم کی سال گرہ بہت مبارک ہو۔ کہانیوں میں سرخ لیون، یوسف لغاری بھائی، وہ بڑھیا کون بھی، حجاب فاطمہ آپ، حسد کی آگ، ممتاز احمد بھائی، بھوک، رضوانہ پرنس آئی، دوسری دنیا کا عشق، منعم اصغر بھائی، کیسا یہ راز ہے، ارسہ سحر چوہان، اور آدم خور ملک صندر اعوان صاحب کی بہترین کہانیاں رہیں۔ اب اجازت خدا حافظ۔

☆: اچھی حسین اخدا حسین خوش رکھے۔ لو فینچی کب اُدھار رکھتی ہے۔ بس ہمیشہ اس طرح شامل احوال رہو۔

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری آئی نفیہ فضل لکھتی ہیں۔ آپ سب کی بے انتہا کاوشوں سے وقت سے پہلے بہترین ڈائجسٹ ہمیں مل جاتا ہے۔ جزاک اللہ۔ من موہنی ہی گڑیا منزہ کو عقیدت بھر اسلام۔ آپ نے اس پرچے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اب آئی ہوں کہانیوں کی طرف ستر ہواں مسافر بھائی محمد سلیم اختر ایک بہترین لکھاری ہیں۔ زبردست کہانی ہے مگر یہ سمجھ نہ آیا کہ جب شیدا و گین میں اٹھایا کروں اس کے ساتھ تو یہ اسٹوری کیسے پتا چلی؟ دوسری کہانی مجھے معاف کر دو، حنا بشری تم نے تولد کھی کر دیا۔ نفیہ سعید روم نمبر 607، یہ شاید ہماری نئی ساتھی ہیں دلچسپ تحریر ہے، گم شدہ چہرہ شانی خانان، عرش کون بھی، نادیر ملک، ہانڈی شائستہ انور، سرخ لیون، محمد یوسف لغاری، سنیو لے، علی حسین تابش زبردست تحریریں ہیں۔ آج کل یہی سب ہو رہا ہے۔ تمہارے ساتھ ساتھ نازیہ تولد رضایہ سب ممکن ہے دوسری دنیا کا آخری عشق منعم اصغر یہ سب ممکنات ہیں مجھے بھی ایسی بہت سی اسٹوریز معلوم ہیں۔ ایک پل میں سب کچھ نہت نازیہ چ ہے۔ مہمان ناگ تحسین جو نیوز زبردست کہانی لائی ہیں۔ آدم خور صندر عباس اعوان کہانی پڑھنے سے متلی ہو رہی تھی۔ رک رک کر پوری کر رہی لی۔ ہماری اوجھری کہانی کشف اقبال تم نے تولد ہی دکھا دیا یہ حقیقت سے بھرپور کہانی رلا گئی مجھے۔ نجات ارمان فاطمہ الماس مینا دے یا مایا، سیما عروج صدیقی، پچھل پیری، بشیر احمد بھٹی، ہانڈی پارک، تیرنیم شمس، الفاظ کھو گئے منزہ سہام کی طرف سے فاطمہ ثریا بچیا کو بہترین خراج تحسین اور ایم اے راحت صاحب کی ہم شکل بہترین ناول جو کہ اختتام پذیر ہے دلچسپ ہے اور کاشی مینا زہر عشق بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔ ارے ہاں سفر نامہ مجھے ہمیشہ پسند رہا ہے اور یہ بادبان زبردست ہے۔ مگر نعمان اسحاق جب مزہ آنے لگتا ہے کہانی میں تو قسط ختم ہو جاتی ہے۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی ہیں بھوئی طور پر پراسرار نمبر بہت شاندار ہے۔

☆: اچھی آئی! تبصرہ زبردست رہا۔ حج کی رواداد انشاء اللہ اس بار خصوصی طور پر شائع کریں گے۔

✉: احوال میں یہ حاضری ہے ہماری آفت کی پڑیا۔ سدرہ انور بلوچی کی جنگ صدر سے۔ عرض کرتی ہیں۔ مارچ کا پراسرار نمبر ملا ناٹل شیک لگا۔ ادارہ منزہ سہام آئی کا الفاظ کھو گئے بوجھل

دل کے ساتھ پڑھا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ فاطمہ ثریا بچیا کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے آئین۔ احوال میں آپ زینہ جو نیچو، ملکہ احوال تحسین جو نیچو، سید ملازم حسین، صندر عباس اعوان، منزل خان، صفیہ سلطانہ منغل، مسز نوید ہاشمی، صائمہ مجید، مجید احمد جانی کے خطوط پسند آئے۔ اس کے علاوہ باقی سب نے بھی اچھا لکھا۔ لائف بوائے میں اسماء اعوان نے بہت خوب لکھا۔ انکل محمد سلیم اختر کی ستر ہواں مسافر حنا بشری کی مجھے معاف کر دو روم نمبر 607، گم شدہ چہرہ شانی خانان رضوانہ پرنس کی تحریر بھوک، نادیر ملک، عرش کون بھی؟، ہانڈی شائستہ انور محمد یوسف لغاری کی 'سرخ لیون' علی حسین تابش کی سنیو لے، نازیہ تولد رضایہ ساتھ ساتھ منعم اصغر، دوسری دنیا کا آخری عشق، فرح انیس، آٹھ کہانیاں اک کردار، نہت نازیہ، اک پل میں سب کچھ، ملک صندر عباس اعوان کی آدم خور، ارسہ سحر چوہان کی کیا راز ہے؟، ارم خان کی سب کچھ تیرا ہے، سیدہ حجاب فاطمہ، وہ بڑھیا کون تھی؟، الماس فاطمہ ارمان، نجات، سیما عروج، مینا دے یا مایا، بشیر احمد بھٹی کی پچھلی پیری، انکل جادید راہی کی مٹی باجی، یہ تمام تحریریں بہت ہی دلچسپ و سبق آموز لگیں۔ ملکہ احوال تحسین جو نیچو کی مہمان ناگ، بہت خوب صورت تحریر لگی۔ ویڈن ملکہ۔ زہر عشق قسط 13 بہت پسند آئی۔ ہانڈی پارک اور تیرنیم شمس میں بھی کے انتخاب پسند آئے۔ اب اجازت! انسانوں کا تسلسل اسی طرح قائم رہا تو پھر ہوگی ملاقات جب تک اپنا بہت سارے والا خیال رکھیے گا۔ اللہ نگہبان۔

☆: پیاری گزیا! تمہارے خط آتا ہے تو جانے کیوں اطمینان سا ہو جاتا ہے کہ ہم سے محبت کرنے والے ہمارے بہت آس پاس ہیں۔ جیو گڑیا تبصرہ شاندار رہا۔

✉: پیک نمبر 58 شانی، سرگودھا سے ہمارے پیارے بھائی فیصل ندیم بھی عرض کرتے ہیں۔ مارچ 2016ء کا پراسرار نمبر، میرے سامنے ہے ناش میں لڑکی کی نشانی آنکھیں دیکھتے ہی ان میں گم ہو گیا۔ مگر جب لڑکی کے ہاتھ کی طرف دیکھا تو آف ہم تو ڈر ہی گئے یہ بھوت بھی نہ بس۔ اگلے صفحے پر جام شیریں پیتے ہوئے۔ اربیل سے کپڑے دھوئے۔ اور پھر منزہ سہام صاحبہ کے ادارے الفاظ کھو گئے پڑھ کر بی بوجھل ہو گیا۔ احوال میں سننے آنے والے دوستوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جن میں قاسم بلوچ، عثمان بلوچ، عمارہ نازو بیگ سنگھ سے احتشام احسان اور ساجدہ لطف اللہ، امید ہے کہ ہر ماہ احوال میں آپ سے ملاقات ہو کرے گی۔ غزالہ نہت ناظم و یکم بیک۔ ممتاز احمد مسز نوید ہاشمی، راشد لطیف، سونیا خان، باجی صائمہ مجید اور مجید احمد جانی کے تبصرے شاندار تھے۔ کزہ ملک ملتان سے احوال میں شامل ہونے پر خوش آمدید تبصرہ بہت شاندار تھا اور اب کچھ تبصرہ کہانیاں پر ہو جائے۔ ستر ہواں مسافر، سلیم اختر کی پراسراریت سے بھرپور کہانی ہے۔ حنا بشری کی مجھے معاف کر دو، کہانی غیر تناک ہے۔ رضوانہ پرنس کی 'بھوک' حیران کن کہانی ہے۔ نادیر ملک عرش کون بھی عرش کا دو سال موت کے بعد واپس دنیا میں آتا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایم اے راحت کا 'ہم شکل' بہترین سلسلے کی لڑی ہے۔ سیدہ حجاب فاطمہ وہ بڑھیا کون بھی؟ قابل تعریف ہے۔ ممتاز

احمد کی 'حسد کی آگ' بہترین کہانی ہے۔ کاشی بھیا۔ آج کل مصروفیت تو بے انتہا ہے کیوں کہ مارچ کے آخر میں یونیورسٹی کا امتحان ہے تو اس کی تیاری میں مصروف ہوں۔ امتحان کی تیاری کی وجہ سے صرف اتنا ہی شمارہ پڑھ سکا۔ اب اجازت۔

☆: پیارے سے فیصل بھیا! امتحان کی کامیابی کی پیشگی مبارکباد قبول کرو۔ ہم نے تمہیں دعا دی ہے۔ اللہ ضروری ہماری گانے گا۔ بس تھوڑی سی فراغت نکال کر پرچے پر ضرور تبصرہ لکھنا۔

☆: شاہد سلیم، حسن ابدال سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ آپ کی محفل میں شریک ہونے کی سعادت کر رہا ہوں۔ میرا تلی کا آپریشن ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ سے رابطہ قائم نہ رکھ سکا۔ معذرت۔ ماہ مارچ 2016ء کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا ہے جسے پڑھ کر بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ ماشاء اللہ سبھی احباب کی تحریریں بیست تھیں۔ کہانیاں تمام دوستوں کی بہت پسند آئیں۔ سلسلے دار کہانیاں بھی بہترین جاری ہیں۔ اب انشاء اللہ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ حاضری دوں گا۔

☆: پیارے شاہد! تمہاری بیماری کا سن کر دلی رنج ہوا۔ خدا تمہیں جلد شفا کا ملہ عطا فرمائے۔ انشاء اللہ کہانیاں پڑھ کر جلد رانے دیں گے۔ ارے ہاں..... یہ تو بتاؤ تم ہمیشہ خط کے ساتھ NiC کی کاپی اور تصویروں بھیجتے ہو۔ بھیا یہ ہمارا احوال ہے کوئی تھا نہ نہیں.....

☆: یہ آمد ہے شہر قمر کی کراچی سے۔ عرض گزار ہیں۔ دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفل میں حاضر ہوں۔ یہ دوری مجھے کھل تو رہی تھی۔ لیکن کچھ مصروفیت ایسی تھی کہ قلم اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ چلیں دیر آید درست آید۔ پہلے تو سرورق کے بارے میں کہنا چاہوں گی کہ پراسرار نمبر کی مناسبت سے Beauty And Beast والی بات ہے۔ جس نے بہت زبردست لک رہی ہے۔ منظرہ بہام صاحبہ

بجا طور پر بیجا کی وفات پر ملوں ہیں وہ ایک عہد تھیں جو تمام ہوا۔ لائف بوائے کی کہانی اچھی تھی ویسے کچی کہانیاں ایک گلدستے کی مانند ہے جس میں ہر کہانی تقریباً اچھا لگتا ہے اور پتھلوں کی طرح ان کی تحریریں بھی مہکتی ہیں۔ حنا بشر کی کی معاف کردو اچھی تحریر تھیں۔ کاشی صاحب کے احوال کی باتیں تو حسب معمول اچھی ہوتی ہیں اور راجگی لگتی ہیں۔ بہت اپنائیت اور خلوص کے ساتھ

سب کو جواب دیتے ہیں اور مانو ان سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ محمد سلیم اختر صاحب کی ستر ہواں مسافر بھی منفرد تھی۔ شائستہ انور کی ہانڈی، مہنی باجی، بادبان، حسد کی آگ، پچھل پیری، سب ہی اچھی لگیں۔ محمود شام صاحب کا تو ایک نام ہے ان کی تعریف میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کاشی صاحب کی زہر عشق کا کیا کہنا اس کے علاوہ ایم اے راحت صاحب کا ناول بھی بہت عمدہ ہے۔ ہائیڈ پارک، تیرنیم کش سب ہی بہترین تھیں۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ غرض دودن میں ڈائجسٹ ختم کر لیا۔ اچھا اب سب سے اجازت چاہتی ہوں۔ دوبارہ موقع ملا تو حاضر خدمت ہو جاؤں گی۔ اللہ تمہاں۔

ایک بہت شاندار آپ بیتی

لاہور کی جیل میں سزائے موت کی سزا کاٹنے والے اُس قیدی کی زندگی کے شب روز جو اسے ایک معصوم انسان سے مجرم بننے پر مجبور کر گئے۔ اُس قیدی کی داستان عبرت جس میں آہیں بھی ہیں..... سسکیاں بھی ہیں، محبت اور نفرت کے رنگ بھی..... بہت جلد رانا حبیب الرحمن کے قلم سے ایک آتش نشانی سچی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے۔

☆: شمسہ جی! آپ کا تبصرہ شاندار رہا۔ موقع ملنے کی بات ہے تو ہم ہر ماہ آپ کی آمد کے منتظر رہیں گے تو پھر اسٹگ ماہ تبصرہ آ رہا ہے ناں آپ کا؟

☆: یہ احوال میں پہلی بار آمد ہے عرفان حسین آصف کی ملتان سے۔ لکھتے ہیں۔ کاشی بھیا! میں کافی عرصہ سے ماہ نامہ سچی کہانیاں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ماہ نامہ سچی کہانیاں میں تمام راسخ زبھانی اور ہمیشہ بہت محنت سے لکھتے ہیں۔ اللہ پاک ان کو اور سخن دے۔ آمین۔ شمارہ ہمارے ہاتھ میں ہے اور اس کی اسٹوریوں بھی بہت اچھی ہیں۔ جن میں ہمیں 'یہ دوستی ہے' ناسور ڈراپ سین، قسمت کے کھیل، روایات کی دلدل، کوئی خوشیاں لاوے میرا حسن آستین کے سانپ اور میرے اپنے اسٹوریز بہت پسند آئیں۔ ویسے تو تمام نئے پرانے راسخ حضرات بہت محنت سے لکھتے ہیں۔ مگر جو جادو کاشی بھانی اور ایم اے راحت کے ہاتھ میں ہے شاید ہی کسی کے ہاتھ میں ہو۔ ہمارے پورے کالج میں یہ دونوں ناول، زہر عشق اور ہم شکل بہت مقبول ہیں۔ کچھ ایسے طلبہ طالبات بھی ہیں جو صرف ان دونوں ناولوں کے لیے ڈائجسٹ خریدتے ہیں۔ سچی کہانیاں اور آپ کے ہم شکل اور زہر عشق کے کچھ دیوانوں کا نام لکھ رہا ہوں۔ ابراہیم، ارم ناز، شائستہ، وقاص خان اور مازہ ہیں۔ کاشی بھانی میں پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ اس میں کچھ غلطیاں بھی ہوں گی تو پلیز اسے نظر انداز نہ کرنا میں ان غلطیوں پر آئندہ قابو پانے کی کوشش کروں گا۔ اور امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے اور میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆: پیارے آصف! خوش آمدید۔ لو تمہارا تبصرہ ہوا شائع۔ اب کہانی کے بارے میں پڑھ کر ہی کچھ رانے دے سکتے ہیں۔ فی الحال تھوڑا سا انتظار۔ تمہارے کالج فرینڈز کے لیٹرز کہاں ہیں؟؟ اگلے ماہ ان سب کے تبصرے ہمارے پاس ہوں۔

☆: یہ احوال میں حاضری دے رہے ہیں ملک علی رضا۔ شمار کا لونی، فیصل آباد سے۔ لکھتے ہیں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں مارچ کا شمارہ ملا۔ میرے لیے خوشی کا باعث ہے کہ مجھے بہت سے دوستوں نے یاد کیا۔ سچی کہانیاں کی کہانیاں، غزلیں، خطوط پر لطف اور بے مثال تھے فوزیہ احسان رانا، رانا حبیب الرحمن لاہور، مجید احمد جانی، کاشی چوہان صاحب آپ نے بڑی محبت سے تمام

دوستوں کو اکٹھا کیا ہے۔ دوستوں کو ایک جگہ ملایا ہے۔ سچی کہانیاں رسالہ اب تو میرا محبوب میگزین بن گیا ہے۔ جب تک میری زندگی ہے میں ضرور پڑھتا رہوں گا۔ ارے..... جو احباب مجھے ہر وقت یاد رکھتے ہیں خاص کر آفتاب رسول، عظمت الہی، فرحان یوسف چائین، افضل آزاد اور بہت ہی اچھے دوست حکیم جاوید سکیم اور خالد فاروق سدا خوش اور آباد رہیں۔

☆ پیارے علی رضا! تم بھی ہر ماہ ہم کو یاد رکھا کرو۔ اور احوال میں حاضری یقینی بناؤ۔ تبصرے کا شکریہ۔

✉ فیصل آباد سے محمد شعیب لکھتے ہیں۔ اس خط کے ہمراہ میں کہانیاں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے یہ تحریریں سچی کہانیاں میں اپنی جگہ ضرور بنائیں گے۔

☆ پیارے بھائی! خوش آمدید! ارے یہ کیا؟؟؟ اپنی بات کی اور بس..... کچھ پرچے کے بارے میں بھی تبصرہ کرتے تو اچھا لگتا۔ اب یہ جلد بازی نہیں چلے گی۔

✉ کراچی سے فرح انیس تحریر کرتی ہیں۔ احوال میں سب ہی احوالیوں کے احوال اچھے لگے۔ تمام احوالیوں کو میری جانب سے سلام اور سب کی خیریت مطلوب ہے۔ نزابت افشال اللہ

آپ کو کامیابی دے بھائی۔ آئین۔ میرا B-A کارڈ آ گیا۔ فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔ اب ماسٹرز کی تیاری ہے آپ سب سے انتہا ہے میری کامیابی کی دعا کیجیے گا۔ ناکسل پر لڑکی اچھی لگی پر ساتھ چھوٹی سی عجیب و غریب مخلوق دیکھ کر ڈر لگا۔ منہ سہام کا الفاظ کھو گئے پڑھ کر یہی لبوں سے نکلا۔

اللہ بچیا کے درجات بلند فرمائے۔ آئین۔ حنا بھٹی کی تحریر اچھی لگی۔ برائی کا انجام برائی ہوتا ہے۔ نصیہ سعید کی تحریر بہت پیارا پیغام لے کر آئی۔ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ شانی

خامان کی تحریر میں ماہم کے عجیب و غریب شوق نے اسے اتنے بڑے نقصان سے دوچار کر ڈالا۔ رضوانہ پرنس کی تحریر میں نیلما کی بے بسی اور موت اور آخر میں رمشا، علیہ کے انجام پر خوف آیا۔

علی حسین تاش کی تحریر بھی اچھی لگی۔ حسد کی آگ بہت بڑی ہوتی ہے۔ انسان کو جلا کر خاکستر کر ڈالتی ہے۔ تازیہ بتول کی تحریر میں رضا صاحب کو داد دینے کو دل چاہا ان کی ہمت پر۔ منعم اصغر،

تادیہ ملک، تحسین جو نیو، الماس فاطمہ کی تحریریں اچھی لگیں۔ ممتاز احمد کی تحریر زبردست تھی۔ کشاف

اقبال کی تحریر پسند آئی۔ زہر عشق ماشاء اللہ زبردست جاری ہے ہر قسط کا بے صبری سے انتظار ہوتا ہے۔ کچھ تحریریں ابھی پڑھی نہیں۔ کاشی بھیا آپ کا بہت شکریہ آپ نے میری تحریر لگائی۔ آپ

جیسے بھائی ہم بہنوں کا ماں ہوتے ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ انشاء اللہ۔

☆ اچھی فرح! تبصرہ زبردست رہا۔ اپنا بہت خیال رکھنا اور ہاں احوال میں اسی طرح حاضری یقینی ہونی چاہیے۔

✉ محمد قاسم خان بلوچ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ چک نمبر 184 گ ب سے احوال میں شامل ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ پہلے کی طرح اس بار بھی آپ نے ایک نہایت عمدہ پرچہ اچھے ناکسل کی

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجربہ کار

محمود شامی ریڈیو ادارت

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ اطراف کراچی

جولائی 2014ء سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین

☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں تربیت گاہوں سے بھونٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا

☆ دنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص

☆ پاکستان کے سائنسدانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں عالمی تحقیقاتی اداروں کی

بے لاگ رپورٹیں، آسان اردو میں

☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی او کی سرگرمیوں سے سجاوہ نامہ

☆ مصوری ☆ سفارت کاری ☆ کتابیں ☆ کامیاب زندگی ☆ علمی قلمی ☆ شاعری

☆ پاکستان کے اصرار ☆ موسیقی ☆ فلم اور سنیما سے بچے ☆ شاعر و شاعرات ☆ ادبی ادوار سے آواز

☆ لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت ☆ بچوں کی تحریکات و سرگرمیاں

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہ نامہ اطراف میں ہے

Ph: 0092 21 32274661

Mob: 0300-8210636

سب سے پہلے 508 نمبر پر بلاڈنگ مارک مارا آئی آئی پرنٹر گروپ کراچی
Email: mahmoodsham@gmail.com Web Site: www.ataafmagazine.com

نہی گفت گاہ کے لئے ڈالئے

اپریل 2016ء

کتابیں برائے احوال

نام: _____

مکمل پتا: _____

اپریل 2016ء

کتابیں برائے اشاعت کہانی

عنوان کہانی: _____

نام: _____

مکمل پتا: _____

فون رسل نمبر: _____

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر ہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اول، عنوان: _____ مصنف: _____

دوم، عنوان: _____ مصنف: _____

سوم، عنوان: _____ مصنف: _____

نام: _____ شہر: _____

اپریل 2016ء

کتابیں برائے اشاعت کہانی

عنوان کہانی: _____

نام: _____

مکمل پتا: _____

فون رسل نمبر: _____

صورت میں پیش کیا۔ سب سے پہلے تو میں احوال کی جھپٹ میں پہنچا جہاں بڑی رونقیں سجی ہوتی ہیں۔ ہر ماہ کے شمارے میں کئی چہرے نئے نظر آتے۔ دلچسپ باتوں کے ساتھ نئے لوگوں کو احوال میں دیکھ کر اب یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ماہنامہ سچی کہانیاں دن دو گنی رات چو گنی ترقی کر رہا ہے۔ احوال میں نئے ساتھیوں کو محبت بھرا سلام۔ عمارہ ناز بیکل بار کمالیہ سے تشریف لے آئیں۔ دیکھ عمارہ جی۔ تحسین جو نیچو آپ نے میری کہانی پسند کی شکر ہے۔ بہن جی آپ کا۔ سرگودھا کے اچھے لکھاری ممتاز احمد جی آپ نے اچھے لفظوں میں میری ٹوٹی پھوٹی تحریر کو پسند کیا۔ میں کیسے آپ کا شکر یہ ادا کرو۔ اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں دے۔ آمین۔ آپ سب کا تہہ دل شکر ہے۔ تبصرے تمام لوگوں کے بہت پسند آئے تحریروں کی طرف آئیں تو اس بار پراسرار آئی پرچہ بہت شاندار تھا کہانیوں کے حوالے سے۔ سب سے پہلے تو محمد سلیم اختر کی کہانی ستر ہواں مسافر پڑھی۔ بہت خوب سلیم اختر۔ محمد اسامہ کی پھوٹی سی تحریر حلوہ کھاؤں گی۔ بہت پسند آئی ارم خان کی سب کچھ تیرا ہے۔ زبردست تحریر رہی۔ جاوید راہی کی مٹی باجی۔ سیدہ حجاب فاطمہ کی کہانی۔ حسد کی آگ، ممتاز احمد کی تحریر ہر لحاظ سے اچھی رہی۔ ممتاز احمد بہت اچھا لکھتے ہیں۔ باقی تحریریں ابھی زیر غور ہیں۔ آئندہ شمارے میں ان پر بھی بات ہوگی۔ ہائیڈ پارک میں انمول موتی، خوب صورت باتیں، قدرت کے رنگ غزلیں، احوال زریں، حوا کی بیٹی یہ سب پسند آئیں۔ تیرنیم کش میں شہباز خوسرو اور ارباز حسین کے شعر اچھے لگے۔ اب باتیں بہت ہو گئیں۔ انشاء اللہ آئندہ شمارے میں ڈھیروں باتوں کے ساتھ بھر حاضری دوں گا۔ آخر میں پیارے کاشی اور دوسرے سب سچی کہانیاں کے ساتھیوں کو خلوص بھرا سلام اور دعا کہ اللہ پاک ہم سب کو اپنی رحمت رکھے۔ آمین۔

☆: اچھے قاسم! تبصرہ بہتر لگا! اور سب سے اچھا تمہارا غرہمیں اسیر کرتا ہے۔ خوش رہو۔
✉: بکرن تاریخیں سندری ضلع فیصل آباد سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ پہلی بار احوال میں شامل ہو رہی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ مجھے بھی دوسرے نئے لوگوں کی طرح احوال میں شامل کیا جائے گا۔ سچی کہانیاں دو سال سے پڑھ رہی ہوں اور اس رسالے سے میں بہت محبت کرتی ہوں کیونکہ اس میں جو تحریریں شائع ہوتی ہیں وہ بہت اچھی اور شاندار تحریریں ہوتی ہیں۔ پڑھتے ہوئے بہت مزہ آتا ہے۔ اس بار مارچ کا پراسرار نمبر چار تاریخ کو می جان کے ہاتھوں سے موصول ہوا۔ کیونکہ امی جان ہی ہر ماہ سچی کہانیاں بازار سے لا کر دیتی ہیں۔ امی جان کے لیے دل سے شکریں۔ پراسرار کہانیاں پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ ہر کہانی میں پراسرار باتیں پڑھتے ہوئے اک عجیب سی کیفیت دل پہ طاری رہتی کہ آگیا ہونے والا ہے۔ اس بار کچھ کہانیاں مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آئیں۔ ستر ہواں مسافر، گم شدہ چہرہ، دوسری دنیا کا عشق، کیسا یہ راز ہے، سب کچھ تیرا ہے، آدم خور، تمہارے ساتھ ساتھ، جھوک، سنو بلی، حلوہ کھاؤں گی اور حسد کی آگ یہ

سب کہانیاں نمبر ون تھیں۔ اس شمارے کی باقی کہانیاں ابھی پڑھ رہی ہوں۔ کیونکہ نام بہت کم ہوتا ہے میرے پاس پھر بھی کچی کہانیاں شوق اور ذوق سے پڑھتی ہوں۔ ایسے خوبصورت ڈائجسٹ سے دور رہنا اب میرے لیے بہت مشکل سا ہو گیا ہے۔ کاشی بھیا آپ سے گزارش ہے کہ میرے خط کو ضرور شائع کیا جائے تاکہ میں اگلی بار بھی ایک ایتھے تبصرے کے ساتھ حاضر ہو سکوں۔ ہائیڈ پارک میں رمشا عارف کا لطیفہ اور حنا لطیف کا بے بسی، مرسلہ پڑھ کر خوب ہنسی آئی۔ غزلوں میں ڈاکٹر دانش علی غزل، مجھ کا قلم خان بلوچ کی غزل بہت پسند آئیں۔

☆: کرن! خوش آمدید! بیٹا تبصرہ تو آپ کا شامل احوال ہوا اب آپ نے ہر ماہ ہمیں احوال میں موجود ملنا ہے۔

☆: یہ تبصرہ ہمیں موصول ہوا ہے ایم افضل آزاد ساہیوال کا۔ لکھتے ہیں۔ کچی کہانیاں اس بار 5 تاریخ کو لاہور سے ملا۔ اس بار نائل تو بہت خطرناک لگا حسب عادت پہلے منرہ سہام کا الفاظ کھو گئے۔ پڑھا جہاں پر ان کے الفاظ فاطمہ ثریا کو ڈھونڈ رہے تھے۔ احوال میں بچھنے کچھ پرانے سا بھی موجود تھے۔ پراسرار اسٹوریوں میں کاشی چوہان کی اسٹوری بہت خطرناک ہو گئی ہے۔ منی باجی، جاوید راہی، نجات، الماس فاطمہ ارمان، اکمل میں سب کچھ، نہت ناز، آدم خور، ملک صفدر عباس، سب کچھ تیرا ہے، ارم خان، عرش کون بھی، نادیدہ ملک، ہم شکل، ایم اے راحت، حسد کی آگ، ممتاز احمد، بھارت میں بلیک لسٹ، معاف کردو، حنا بشری، سپنر لیلے، علی حسین تابش، ہانڈی، شائستہ انور، وہ بڑھیا کون بھی، سیدہ حجاب فاطمہ کی اسٹوریاں بہت پسند آئیں۔ ہائیڈ پارک میں عطی شکور، اسامہ بلال انوان، محمد جواد، عامر بشیر، شاملا اختر، روبینہ ناز روبی، حنا لطیف نے بہت اچھا لکھا۔ تیرنیم کش میں نعیم اکبر، جمیل کنول، عامر جاوید، ایم سعید انور، شبان کھوسہ، شازیہ رضوی، اشعر عقیق، فرح عالم، ایم وکیل عامر کے شعر بہت اعلیٰ تھے۔ اب اجازت۔

☆: پیارے افضل! نام تمہارا آزاد ہے اور کسی دوسرے کو کیوں ہتھکڑی پہنا کر احوال میں ساتھ جوڑ رہے ہو۔ امید ہے کچھ گئے ہوں گے۔ خوش رہو۔ تبصرہ بہتر تھا۔ اپنے دوست سے کہنا دو لفظ الگ صفحے پر لکھ دیا کرے۔

☆: بہاول نگر سے محمد ابو ہریرہ بلوچ عرض کرتے ہیں۔ مارچ کا پراسرار نمبر 5 مارچ کو ملا۔ نائل دل کش تھا۔ احوال کی محفل میں آنے والے قارئین کو ویلکم، غارہ ناز، اشتیاق احسان، خضر حیات، محمد ندیم عباس میوانی، عثمان بلوچ، منزل خان، شاہد رفیق، راشد لطیف، ملازم حسین، ممتاز احمد دیگر دوستوں نے زبردست تبصرے لکھے۔ ویلڈن یوں ہی احوال کی محفل کو سچائے رکھنا۔ کہانیوں کی طرف سے 'معاف کردو' حنا بشری، 'ہانڈی' منی باجی، سرخ لیون، دوسری دنیا کا عشق، منعم اصغر 'عرش کون بھی'، علی حسین تابش۔ 'زہر عشق' بھی اچھی تھیں سب کا زور قلم اور زیادہ

ہو۔ باقی مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

☆: اچھے ہریرہ! کہانی پڑھ کر ہی رائے دے سکیں گے۔ فی الفور کچھ کہنا عیس ہے۔ خدا تمہیں تمہارے امتحان میں کامیاب کرے۔

☆: ایم وارث بیگ ضلع ٹوبہ چک نمبر 190 گ ب وال سے پہلی بار شامل احوال ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ پیارے پیارے بھیا کاشی چوہان جی نیک دعاؤں کے ساتھ پہلی بار آپ کی خدمت اور آپ کی میٹھی اور زبانی بزم میں کچی کہانیاں میں شرکت کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے ضرور اس بزم میں خوش آمدید کہیں گے۔ کاشی بھیا مارچ کا پراسرار نمبر بہت کامیاب تھا۔ احوال میں لوگوں کی چٹ پٹی باتیں اور لوگوں میں پیار و محبت دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ میں کچی کہانیاں اب باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں پہلے پہل تو میں کچی کہانیاں اپنے پیارے دوست اور بھائی محمد قاسم خان بلوچ سے لے کر پڑھتا تھا۔ میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور یہ کچی کہانیاں رسالہ قاسم بھائی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے مجھے سے منگواتے ہیں۔ کیونکہ میں روز ٹوبہ میں اپنے کالج جاتا ہوں اور اب میں ایک پرچہ اپنے لیے بھی اضافی لیتا ہوں۔ اب یہ رسالہ میرے دل میں سا گیا ہے۔ امید ہے اس رسالے سے میری محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔ کہانیوں میں جناب محمد سلیم اختر صاحب کی سز ہواں مسافر بہت پسند آئی۔ اس کے بعد ایک ایتھے لکھاری ممتاز احمد جی کی کہانی حسد کی آگ بھی دل کو بھاگ گئی۔ جاوید راہی کی کہانی منی باجی بھی دلچسپ تحریر تھی۔ کشاف اقبال اور ارم خان کی کہانیاں اچھی لگیں۔ باقی تمام تحریریں وقت ملنے پر ضرور پڑھوں گا۔ ہائیڈ پارک تو ہمیشہ ہی زبردست ہوتا ہے۔ خاص طور پر چٹ پٹے لطیفے اور اچھی باتیں۔ شازیہ رضوی کا شعر بہت بہت اچھا تھا۔ سچ میں انسان کو مان کی میٹھی گود میں سکون آ جاتا ہے۔ اب میں پیارے کاشی آپ سب سے اجازت لوں گا نیک دعاؤں کے ساتھ۔ عطی باجی شامل احوال ضرور ہوں گا آپ کے حوصلے دینے پہ۔

☆: پیارے وارث! خوش آمدید! تمہارا اتنا تبصرہ پور تبصرہ سچ میں مزہ دے گیا۔ خوش رہو۔ اب تمہارے اگلے ماہ کے تبصرے کا تو ہمیں ابھی سے انتظار ہونے لگا ہے۔

☆: سیدہ حجاب فاطمہ، کراچی سے لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے مجھے دوبارہ کچی کہانیاں میں جگہ دی اور کاشی بھائی میری کہانی کو کچی کہانیاں میں شامل کیا۔ کاشی بھیا آج میں جو بھی ہوں اپنی ماں کی دعاؤں اور کچی کہانیاں کی مرہون منت ہوں۔ اب ذرا بات ہو جائے اس دل ربا جس نے ہمارے من آنکھن میں محبتوں کے جھولے ڈال رکھے ہیں۔ کیم مارچ بڑی بے چینی سے باکر کا انتظار کر رہے تھے۔ جو آواز تو دوڑے مگر یہ کیا وہ کہہ کر اپنی راہ ہو لے کہ شاعر ابھی نہیں آیا۔ منہ لٹکا سہاس کے پاس آئے تو انھوں نے عندیہ دیا کہ تمہاری کوئی کتاب آئی ہے۔ امید تو امید ہوتی ہے نا اسی کے سہارے قیاس کیا شاید جو کہانی مجھے بھی

وہ لگ گئی ہو اور جب بیٹ پر پڑی اعزازی کا پی پر نگاہ پڑی تو دل ملیوں اچھل کود کرنے لگا۔ شمارہ صفحہ اول سے صفحہ آخر تک آپ کی محنت اور لگن کی دلیل ہے۔ منزہ جی کے ساتھ ساتھ ہمارے بھی الفاظ کہیں کھو گئے ہیں کہ بجایا ایک خزانہ تھیں۔ اسما عثمان کی لائف بوائے بہت اچھی جا رہی ہے ہر ماہ ایک اچھوتا خیال لایا کرتی ہیں۔ ستر ہواں مسافر، معاف کردو، رونمبر 607، گم شدہ چہرہ، بھوک، عرش کون تھی، ہانڈی بہترین تحریریں رہیں۔ ایک تصویر ایک کہانی اچھا سلسلہ ہے دانیال نے اس بار بھی چھوٹے خیال سے بڑا کردار بنا ڈالا۔ علی حسین تابش کی سنبولے اور محمد یوسف لغاری بھائی کی سرخ لمبوں بھی بیسٹ رہیں۔ بانی پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے مگر یہی کہوں گی کہ جب پڑھوں گی تو آگے بھی مزیداری ہوگا۔ اب اجازت کہ ویسے ہی میں لیٹ ہو چکی ہوں اور ایسا نہ ہو کہ احوال میں حاضری سے رہ بی جاؤں۔

☆ اچھی بہن! بس آپ غیر حاضر ہوتے ہوتے رہ گئی ہیں۔ امید ہے آئندہ اس طرح کا مزیدارتبرہ آپ ہمارے لیے ہر ماہ بہت جلد اور وقت پر عنایت فرمایا کریں گی۔

☆ قندیلہ قسم خان بھی تحصیل ماموں کا بچن چک نمبر 509 گ ب سے پہلی بار احوال میں شرکت کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ اس بار میں اپنے خوب صورت شہر ماموں کا بچن تحصیل کی مارکیٹ میں کچھ کتاب خریدنے گئی تو تک اسٹال میں میری نظر کئی کہانیاں پر پڑی تو خیال آیا کہ آج اپنے ساتھ یہ رسالہ بھی لے جانی ہوں۔ ویسے تو میں ایک اور رسالے کی بھی فین ہوں لیکن جب میں نے اس رسالے کو پڑھا تو یقین کر لیا کہ دل کو یہ ڈائجسٹ بھگایا۔ میں اس کی اپنی طرف سے جتنی بھی تعریفیں کروں کم ہیں۔ بہر حال جودل کو اچھا لگ رہا ہے اس خوب صورت ڈائجسٹ کے لیے وہ لکھ رہی ہوں۔ اس رسالے کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ میں بھی اس میں خط لکھوں اور اس بزم کی رکن بنوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے پورا رسالہ تین دن میں پڑھ لیا۔ خوف ناک اور پراسرار کہانیاں پڑھتے ہوئے بہت مزا آیا۔ ہر راغونے اپنی کہانی لکھنے پر بہت محنت کی۔ الفاظ کھو گئے منزہ سہام کا لکھا ہوا پسند آیا۔ کہانیاں تو سب کی اچھی تھیں مگر ستر ہواں مسافر، سب کچھ تیرا ہے، وہ بڑھیا کون تھی، اک پل میں سب کچھ، روم نمبر 607، حسد کی آگ یہ کہانیاں کچھ زیادہ اچھی لگیں۔ شاعری بھی بہت جلد اترتی۔ تبرہ دل میں سب کے خطوط اچھے لگے۔ مٹی بارچی کہانیاں میں امید ہے اپنا تبرہ بھی پڑھنے کو ملے گا اگر کاشی بھانے میرا یہ خط شال کر لیا تو۔ اس بار تو میں مختصر سا خط لکھ رہی ہوں لیکن اگلے ماہ تفصیل سے تبرہ لکھوں گی۔ تاکہ ہم بھی اپنے دل کی باتیں لوگوں تک پہنچا سکیں۔ اور میں اپنی تمام دوستوں کو یہی کہوں گی کہ کچی کہانیاں پڑھو یہ ایک اچھا ڈائجسٹ ہے۔

☆ پیاری سی قندیلہ! خوش آمدید! تمہارا جتنا پیارا نام، اتنا ہی پیارا تبرہ بھی تھا۔ احوال میں تمہاری آمد کا شدت سے انتظار ہے گا۔

☆ پھولوں کی نگری پتوکی سے محمد ندیم عباس میواتی اپنے تبرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ یوں تو ہمارا شہر پتوکی زمریوں، پھولوں کی نسبت پورے ملک میں شہرت رکھتا ہے۔ لیکن موسم بہار میں تو جنت کا مٹلا ہی لگتا ہے۔ آج میں احوال ٹیشن کے آگن میں بسنے والے قارئین کی خدمت میں انھی پھولوں کو لے کر حاضر ہوں سب سے پہلے محترم ایڈیٹر بھائی کاشی چوہان تازہ گاہوں کا گلدستہ قبول کریں۔ نئے مہمانوں کو دلنشیں مسکراہٹ سے خوش آمدید۔ پھر بیاری سسر منزل خان، نازیہ بٹول، بڑی آ یا، مسز نوید باسٹی، ام عادل، کنزہ ملک، آ پی صائمہ مجید ایڈیٹ با مجید احمد، ملازم حسین، شاہد رفیق، ابو ہریرہ بلوچ، عثمان بلوچ، منعم اصغر، یاسر، ندیم ڈھکو، راشد لطیف، خضر حیات، خادم حسین، علی حسین تابش، سب نے بہت بھرپور تبرے لکھے۔ میری طرف سے سلام ایڈیٹ گاہوں کے گلدستے قبول فرمائیں۔ ڈیز سسر سدرہ انور علی آپ کو بھی گلدستہ تبرہ شانداز۔ آپ اسٹوری بھی لکھا کریں۔ ڈیز سسر سیدہ حجاب فاطمہ وہ بڑھیا خوشبو کی دہائی تھی۔ لو گاہوں کی خوشبو والا گلدستہ اب ذرا بچ کر رہنا۔ (ہاہاہاہا)۔ معاف کردو، حنا لٹری، بھوک، عرش کون تھی، ہانڈی، سرخ لمبوں، سنبولے، علی حسین تابش تمہارے ساتھ ساتھ تازہ بٹول، دوسری دنیا کا عشق، منعم اصغر، آٹھ کہانیاں، فرح انیس، ہماری ادھوری کہانی، مٹی بارچی، محترم جادید راہی، حسد کی آگ، ممتاز احمد، زہر عشق، محترم بھائی کاشی چوہان اور میرا ارم خان سب کچھ تیرا ہے بہت اچھی تھیں۔ سب کے لیے گاہوں کے گلدستہ حاضر خدمت۔ ایکسٹرا جو لینا چاہے وہ پتوکی آجائے۔ تیریش شمس اور ہائیڈ پارک مسلسل زبردست رہا۔ یوں پورا شمارہ بیسٹ تھا۔ ویلڈن کاشی بھائی۔ زندگی نے وفا کی اور ایک گرام سے فرحت ملی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک فی امان اللہ۔

☆ ندیم شہزادے! ہمیشہ گاہ کے ساتھ کاٹنے بھی ہوتے ہیں۔ پھول لیتے ہوئے اب ہمیں بھی غماز رہنا ہوگا۔ تبرہ زبردست رہا۔

☆ مجید احمد جانی لمان شریف سے عرض کرتے ہیں۔

ماشاء اللہ! نائل دیدہ زیب ہے۔ ادارہ "الفاظ ٹھو گئے" رلا دینے والا تھا۔ محی الدین نواب، فاطمہ شریا بھیا اور کاشف زیر کا یوں اچانک چلے جانا مگر زدہ کر گیا۔ ماہ فروری بڑا بھاری گزرا ہے۔ ادب کی نامور شخصیات داغ مفارقت دے گئیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے آمین۔ احوال میں قدم بٹے تو کاشی بھیا ہم سے مخاطب تھے عرض کروں گا کہ اپنی کہانی "وہ مرا طیب خاص" کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اور اس ماہ گزر گئے لیکن یہ معاملہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں حیران ہوں کہ میرے خصوصی دوست کیا چاہتے ہیں۔ یہ کہانی میری ذات پر مبنی ہے اور اب میں نئی زندگی بنی رہا ہوں۔ میں نہیں کروں دعوا کہ اپنی آواز پہنچانا چاہتا تھا اپنا پیغام دینا چاہتا تھا جو مایوس ہو جاتے ہیں اُن کو کہنا چاہتا تھا کہ مایوسی گناہ ہے۔ مایوسی کرنے کی بجائے اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھیں اور اگر ہم میں سے کوئی بھی کسی بھی بیماری میں مبتلا ہے تو اس

کا علاج سنت بنوی سمجھ کر کرائے۔ اس لئے یہ غلطی سرزد ہوئی۔۔۔ اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔۔۔ سستی شہرت۔ نہ دل آزاری۔۔۔ احوال میں تمام کے تبرے جامع اور جاندار تھے۔۔۔ سب سے پرہیز خط پیارے ممتاز احمد سرگودھا کا لگا۔ کاشی بھائی آپ کی نظم اس دفعہ پھر غائب ہے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟ کہاں میں سب سے پہلے ممتاز احمد حسد کی آگ پڑھی۔ واقعی حسد کی آگ انسان کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ سرخ لیون شان دار تحریر تھی۔ مہانتاناگ بہت خوب کہاں تھی وہ بڑھیا کون تھی؟ مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ زہر عشق پر اسراریت کا جادو چڑھارہی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تحریریں زیر مطالعہ ہیں۔ تبرے سے معذرت پر اسرار نمبر ون نمبر ون ہی رہا۔ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں۔

☆ پیاری مجید! تم نے وضاحت دی اچھا لگا مگر۔۔۔۔۔ زندہ رہیں وہ لوگ جو مرنے نہیں دیتے۔
✳ تانہ راجپوت لاہور سے پہلی بار ہم سے مخاطب ہیں۔ پیارے کاشی بھیا کیسے ہیں۔۔۔؟ اوہ سوری سب کو سلام کرنا تو بھول گئی۔ تو لیجئے سب کو سلام کرتے ہیں۔ سب لوگ کیسے ہیں؟ میں تو ایک دم فٹ فٹ۔۔۔ سرورق بہت بہت بہت اچھا اور خوشاک تھا۔ ڈیر سدرہ! کسی ہو؟ آپ کا لیٹر زبردست ہوتا ہے۔ باقی سب بھی اچھا لکھتے ہیں۔ سوچا آج خاموشی کا درجہ لگانا کہ محفل کی گپ شپ میں حصہ لیا جائے۔ شیک ہے نا کاشی بھیا؟ کہاں ایک ایک دم فٹ تھیں۔۔۔ ”آپنی حجاب“ کی اور ”آپنی تحسین جوئیو“ کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ علی حسین تاجت سلیم انکل کی بھی اچھی تھیں۔ میرے خیال سے میری آمد سب کو پسند آئی ہوگی۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کاشو بھیا آپ کا ناول؟ واہ واہ واہ دل چاہتا ہے آپ کے ہاتھ چوم لوں۔ سلمان ابراہیم کا کردار مجھے بہت پسند آیا۔ اوکے اب کاشو بھیا جانے دیں۔ اللہ حافظ۔

☆ ارے گڑیا! تم نے تو مجھے تانا تانی کی یاد دلادی! وہ مجھے کاشو بھیا کہہ کرتے تھے۔ وہ تمہیں خوش آمدید کہنا تو ہم بھی بھول گئے۔ ویلکم ٹو احوال۔

✳ یہ آمد ہے جیکب آباد سے آپنی پروفیٹر صفیہ سلطانہ مغل کی۔ لکھتی ہیں۔ حسب معمول پرچہ وقت پر مل گیا تھا دلچسپ اتنا تھا، کہ جی چاہ رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ مزے لے کر پڑھوں۔ بعد ازاں خیال آیا کہ خط بھی لکھنا ہے۔ آج جب پڑھ لیا تو تم نے فون پہ کہا آپنی، آپ بہت لیٹ ہو گئی ہیں۔ سو میں اس برقی سہولت کے توسط سے خط لکھ رہی ہوں۔ بجائے انتقال کا بہت دکھ ہوا۔ یہ صدیوں کا صدمہ ہے۔ اللہ نہیں غریق رحمت کرے۔ آئین کاشو۔ (یہ تمہارا نام ہے) تم نے شاعری کا صفحہ پھر غائب کر دیا۔ کیوں معصوم شاعروں کی دعائیں لیتے ہو۔ کہانیاں سب بہت بہت بہت ہی اچھی تھیں۔ کسی ایک کی تعریف کی اور ایک کی بھی نہ کی تو یقین کرو کہ نا انصافی ہوگی۔ زہر عشق کی کیا بات کریں، تمہارے قلم میں سحر ہے۔ لیکن اصل لطف جب آنے کا جب یہ کتابی شکل میں ہمیں ملے گی، تا کہ ایک ہی نشست میں زوق کی تسکین ہو۔ میری کئی غزلیں تمہارے پاس ہیں، آگے سمجھ جاؤ۔ اوکے بننا اب اجازت دو۔ مثنوی کمپوزنگ پہ اتنی مہارت نہیں ہے کہ ایک بہت طویل خط لکھ سکوں۔ اس لیے

شعر و شاعری سے گریز بھی کیا ہے اور ڈاکٹر نے پرہیز بھی بتایا ہے۔ سو خدا حافظ۔

☆ پیاری آپنی! آپ بھلے سے دولفظ لکھ دیں لیکن شامل احوال ضرور ہوا کریں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

✳ شیخوپورہ سے احتشام شامی لکھتے ہیں۔ مارچ کا شمارہ لاہور سے خریدا۔ سرورق حسب معمول خوبصورت تھا پر اسرار نمبر کے لحاظ سے۔ کہا نیوں کی فہرست پر نظر ڈالی اور احوال میں پہنچے جہاں احتشام اور منعم ساتھ ساتھ بیٹھے نظر آئے۔ ہاں جی ہم دوست ہی اتنے اچھے ہیں۔ پر اسرار نمبر کی سات خاص کہا نیوں میں نمبر ایک پر رضوانہ پرنس کی ”بھوک“ رہی، نیلما کی موت پر افسوس ہوا دوسرے نمبر پر ”گم شدہ چہرہ“ رہی۔ شانی خانان نے خوبصورتی سے کہا نی۔ ایسے بہت سے اچھے باتیں کرنے والے افراد میں آس پاس نظر آجاتے ہیں اور ان کی بھئی بھئی باتیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ فیض سعید کی روم نمبر 607 تیسرے نمبر پر آئی۔ ہمارے قرآن پاک کے کام میں وہ خاصیت ہے جو شیطان بلاؤں کو بھگا سکے۔ عرشی کون تھی۔۔۔؟ کاشی بھائی آپ کو معلوم ہے۔۔۔؟ ”سپنڈ لے“ کی حسینی تاجت نے بھی خوب لکھی۔ ”ہماری ادھوری کہا نی“، ”کشف اقبال نام کی طرح کہا نی بھی ادھوری ادھوری لگی۔ وہ بڑھیا کون تھی، بیٹا دے یا ماما، جلوہ کھاؤں گی بھی بہترین تھیں۔ ”بادبان“ نعمان اسحاق بہت زبردست لکھ رہے ہو۔ ”حسد کی آگ“ ایک بہترین سبق آموز تحریر تھی۔ ممتاز احمد صاحب نے بہت بہتر لکھا۔ خیر اور شری جنگ میں جیت ہمیشہ خبر کی ہوتی ہے۔ اللہ نرسین جیسی کم متعل غور توں کو بدایت نفع فرمائے۔

☆ بھائی احتشام! تبرے کا شکر ہے۔ کہا نی پڑھ لی ہے بہتر ہے۔ مگر ہمیں تو مزید بہتر چاہیے۔

✳ غلام مرتضیٰ قلی۔ فاروق کالونی چشتیان سے پہلی بار مختصر نامے کے ساتھ موجود ہیں۔ تمام مدبران، اسٹاف اور قارئین کو سلام۔ شمارہ ”جی کہانیاں“ ایک مکمل فیملی ڈائجسٹ ہے۔ اس کو اسی وجہ سے بے حد پذیرائی حاصل ہے۔ اسکو لائف سے آج چینگ لائف میں بھی ”جی کہانیاں“ کا قاری ہوں۔ پر اسرار نمبر کے لیے بے حد منتظر رہتا ہوں۔ ماہ مارچ کا پر اسرار نمبر بہت پسند آیا۔ اللہ اس ڈائجسٹ کو اور تمام

طویل کہانی نمبر 2

پیارے ساتھیو! طویل کہانی نمبر کا اعلان ہوتے ہی آپ کی بے شمار کہانیاں ہمیں موصول ہوئیں۔ ایک پرچے میں تمام منتخب کہانیاں سمونامکن نہ تھا۔ اس لیے اگلے ماہ یعنی ماہ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر ہوگا۔ امید ہے طویل کہانی نمبر آپ کی توقعات پر پورا اترے گا۔ اور اگلے ماہ کے پرچے آپ کو بے چین سے انتظار ہوگا۔
نوٹ فرمائیں۔ ماہ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ہوگا۔

بھائی! اگر تمہاری کتاب ”طویل کہانی“ کی کاپی ملے تو بھائی! اگر تمہاری کتاب ”طویل کہانی“ کی کاپی ملے تو بھائی!

اسٹاف کو ہمیشہ خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

☆ ارے بھائی قلمی! خوش آمدید۔ اتنا پرانا تعلق اور لکھیں تو صرف دو سطریں۔ امید ہے اگلے ماہ تمہارا تفصیلی تبصرہ ہمارے پاس ہوگا۔

✉ چشتیاں سے ہمارے ساتھی علی حسین، تاش برقی تاشے کے ساتھ شامل احوال ہے۔ لکھتے ہیں۔ پراسرار نمبر مارچ کی 4 تاریخ کو ملا۔ سرورق پسند آیا۔ ادارہ تو آنکھیں نم کر دینے والا تھا۔ احوال زبردست رہا۔ اپنی کہانی شائع ہونے پر دل خوشی ہوئی۔ سلیم اختر صاحب، سید حجاب فاطمہ یوسف لغاری، ممتاز احمد صاحب کے ساتھ ساتھ محترمہ تحسین جو نیو اور باقی سب راسٹر کی کہانیاں پسند کریں۔ کاشی بھائی آپ کا ناول زبردست جا رہا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ اب اجازت۔

☆ پیارے تاش! تبصرے کا شکریہ۔ بھیجی اب تم سے ہمیں کوئی یادگاری کہانی چاہیے۔ امید ہے میری بات سمجھ گئے ہو گے۔ خوب محنت کرو۔

لیجئے ساتھیو! اس ماہ تک کی ہماری آپ کی ملاقات پہنچی اپنے اختتام تک۔ پہلا طویل کہانی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پڑھیے اور اپنی رائے سے نوازیے کہ ہماری تنہا کارِ آپ کی امیدوں پر کس حد تک پوری اترتی۔ کہ ہم نے تو کر دیا ہے ہند اک کوزے کو دریا میں پھر سے..... اجازت سے پہلے ایک تازہ ترین نظم آپ کی بصارتوں کی نذر۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔

شہر، جنگل..... اور.....

چاند جنگل سے جب گزرتا ہے
گیسا شفاف سے وہ دکھتا ہے
آتے آتے مرے شہر کی طرف
میلا میلا سے کیوں وہ دکھتا ہے
شہر میں میرے سمندر بھی ہے
اس سمندر میں کتنی ڈوبی ہیں
میری حسرت کی سپیاں یارو!
جن سے بوجھل ہے سمندر بھی مرا
چاند میرے! تو اب اداس نہ ہو
سننے ہیں اس ہو گیا ہے یہاں
سر نہیں کٹ رہے ہیں اب پھر سے
لوگ بس آتیں سے نکلے ہیں
تو بھی شفاف ہو جا چاند مرے
اس شہر کو سمجھ کے جنگل اب

آپ کا اپنا
کاشی چوہان



ہر لمحہ ہر بار۔۔
مرحبا گل بہار



ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

بھولوں بھولوں کو جڑی بوٹیوں
کی مرچاٹ صحت یوں کر دے

ہر لمحہ ہر بار۔۔

مرحبا گل بہار

Fair & Lovely

30 سال
سے قابل
اعتماد نام



Fair &
Lovely



ہماری صحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا خاص خیال
 نہیں ہماروز کو اچھا کرنے کے لیے ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں غیر
 ضروری عادتوں کو ختم کرنا ہوگا اگر کوئی انسان دہلا پتا ہے تو ضروری نہیں کہ
 وہ صحت مند ہے ورزش صرف دہلا پتا ہونے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ صحت مند
 ہونے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ہلکی چھلکی ورزش
 کریں۔ ہماری زندگی میں اگر ہم ورزش کو شامل کریں تو اس سے ہم چست و توانا
 رہیں گے اور کئی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے اپنی زندگی کے روزمرہ کام کرنے
 میں کافی آسانی پیدا ہو جائے گی ہم جو بھی کھا سیں گے۔ بلا محسوس کریں گے ہمیں
 اپنا آپ اچھا لگے گا رات کی نیند کا ہونا بہتر ضروری ہے مونا پے کا نیند سے گہرا
 تعلق ہوتا ہے اس لیے رات کی نیندیں۔

اک کفر خائن و حضراتِ انبی و مرہومہ زندگی کے کام کاج میں اتنے مصروف ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے وقتی دباؤ کا شکار ہونے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ کسی بیماروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے اپنے وقتی دباؤ کو اپنے اختیار میں لائیں اپنے رہن کہن کو بدل میں اپنی زندگی میں ورزشِ کام معلوم بنانے سے ہم مختلف قسم کی بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ فدا کی کمی یا زیادتی یا اس میں تبدیلی آپ کی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں اگر آپ صحت و توانا ہیں اور اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمیں کیا چیز اور کتنی مقدار میں کھانی ہیں آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم جو چیز کھائے اس کے حصے بنالیں۔ موٹاپا ایک بیماری ہے جو ہماری زندگی ہماری صحت کے لیے اچھی نہیں ہے اس لیے یہ بات ضروری ہے کہ آپ ایک ایسی طرزِ زندگی متعارف کروائیں۔ جس میں آپ ہر وقت اپنے آپ کو صحت و توانا محسوس کریں اچھی طرزِ زندگی آپ کو صحت مند اور خوبصورت بنانے میں مدد دیتی ہے۔

جس کی وجہ سے آپ اپنی عمر سے
کئی گناہ کم دکھائی دیتے ہیں
اور ایک باوقار شخصیت
بن جاتے ہیں۔

بیوٹی گائیڈ

”حسن اور طرز زندگی“

دنیا میں زیادہ تر یعنی 70 فیصد لوگ صحت مند ہوتے ہی نہیں ہیں۔ زیادہ اپنی صحت کا خیال رکھتے ہی نہیں انہیں پر دہائی نہیں ہوتی کہ وہ کیا اور کتنا کم ہیں۔ تنگی ورزش کر رہے ہیں اور کبھی رہے ہیں یا نہیں۔

صحت صرف یہ ہی نہیں ہے کہ آپ بیمار نہیں ہوتے تو آپ صحت مندانہ!

☆ اجتماعي طور پر

☆..... جسمانی طور پر

☆..... دینی طور پر فٹ ہیں تو آپ صحت مند انسان ہیں ہر انسان کی خواہش ہے کہ وہ اسمارٹ اور دلکش نظر آئے صحت مند تندرست رہے صحت مند رہنے کے لیے ہمیں خود اپنے آپ کو بدلنا ہوگا خود غصہ عہد کرنا ہوگا کہ مجھے صحت ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی بدلی ہوگی کیونکہ ہماری طرز زندگی صحت پر اثر انداز ہوتی ہے جب تک ہم خود نہیں سوچیں گے جب تک نہیں ہو سکتا چاہے ہم کتنی ہی ورزش کیوں نہ کر لیں۔ صحت تندرست رہنے کے لیے اور خوبصورت دلکش نظر آنے کے ضروری ہے کہ ہم اپنے جسم کے ہارمونز کو ٹھیک کریں، ہارمونز جسم میں چھوٹے چھوٹے ہارمونز ہوتے ہیں جو اثر ہوتے ہیں ہماری صحت پر۔ اگر ہمیں صحت مند ہو تو ہمیں اپنے جسم کے ہارمونز کو ٹھیک کرنا ہمارے جسم کے ہارمونز پر اثر انداز ہمارے آس آس کا ماحول ہے!

11/20/2014

☆..... ورزش

Fair & Lovely

30 سال
سے قابل
اعتماد نام



Fair & Lovely



میری کامیابی، لائف بوائے کے ساتھ

لائف بوائے چمٹکار دکھائے

اسماء اجمان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سمجھ اور کامیابی کے دراز پنہاں رکھتی ہیں

زندگی میں بہت ساری چیزیں انسان خود بخود شامل کر لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ مجھے ہر ایک چیز اپنی جانب اٹریکٹ کرتی ہے۔ کیا کروں؟ سمجھ ہی نہیں آتا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ خوبصورتی خود بھی سب سے بڑا میکینٹ ہوتا ہے۔ بہت دور نہ جائیں، ابھی لاسٹ ویک اینڈ کی ہی تو بات ہے۔ مز صدیقی کے ہاں پارٹی میں کچھ مہمان سرحد پار سے بھی آئے ہوئے تھے۔

ہر چیز کا سہ ہوتا ہے۔ خوشی اور غمی کا بھی سو یہ میرے لیے خوشی کا سہ تھا۔ مجھے مسز مہتا ایک ایسا ہی لگ رہی تھیں، ایسا شاہکار جس کے لیے لوگ ملین ڈالر کی بولی لگا دیں۔ دیکھیے ذہنی روکس طرف بھٹک گئی۔ ان کا ٹمکین چہرہ میری آنکھوں میں جیسے جم سا گیا تھا۔ شاید وہ بھی میری دلچسپی بھانپ گئی تھیں۔ وہ خود ہی میری طرف آئیں۔ اور میری طرف دوستانہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”ہیلو! آئی ایم مسز مہتا، پاروتی مہتا! آپ شاید مجھ میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“
”گڈ ایوننگ! آئی ایم روینہ امان! میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔“
”واٹ ڈیو یو مین؟“ انہوں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا۔
”مجھ میں مجھ ہی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ویری ٹائس۔ کافی دلچسپ ہیں آپ۔“

میرے لیے صرف مسز مہتا ہی کی ذات قابل رشک تھی۔ مجھے ان میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ ان کے سیاہ گھنے بال اور ان کی کمر پر ٹائٹ کی طرح مل کھاتے محسوس ہوتے تھے اور وہ آنسوئی رنگ کی ساڑی پر کیا چٹخ رہے تھے۔ مسز صدیقی کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں جس قدر دل خراب کیے ہوئے تھی، مسز مہتا کو دیکھ کر میں نہال ہو گئی۔

A Refreshing Way Naturally

آفتاب قرشی صندل

قدرتی صندل کی نیچرل ریفریشنگ کاٹھنڈا میٹھا احساس



Aftab Qarshi Dawakhana:

Muzaffar Town, 20 Km, Multan Road, Chong Lahore, Ph: +92-42-37511532-3
Web: www.aftabqarshi.com Email: aftabqarshi@hotmail.com
www.facebook.com/AftabQarshi

”مجھے ہر.....“ یکدم میں کہتے کہتے رک گئی کہ مجھے ہر ایک چیز پسند ہے۔ مبادا وہ برائی نہ مان جائیں۔

عورت عمر کے آخری حصے میں بھی خود کو بوڑھا اور اجداد عمر کہنے کی اجازت کبھی کسی کو نہیں دے سکتی۔ عورت کی عمر ہمیشہ 16 سے شروع ہوتی ہے اور 25 پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔ ظاہر ہے میں خود عورت ہوں لہذا میں کس طرح اس تجربے کے منافی بات کر سکتی ہوں۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ تھوڑا خنجیدہ ہو گئی۔

”آپ کھل کر بات کریں۔“

”مجھے ہر حسین چہرہ اپنی جانب کشش کرتا محسوس ہوتا ہے۔ آپ میں ایک بہت خاص اٹریکشن سی فیل ہوئی تھی مجھے..... اور مجھے یہ امید نہیں یقین ہے کہ آپ میں کچھ تو ایشیال ہے۔“

آخر میں نے دل کی بات لبوں سے آزاد کر دی اور اب میں مسز مہتا کا رُغل دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ میری بات کا کہیں برا تو نہیں مان گئی ہیں۔

”ساتھ تھاپا کستانی بہت گہری نگاہ رکھتے ہیں مگر آج یہ یقین بھی ہو گیا۔“ وہ مسکراتی چلی گئیں۔

”اس کا مطلب ہے جو بات میں نے محسوس کی وہ سچ ہے۔“ میں نے فوراً کہا تھا۔

”جی بالکل اور ہاں میں چار دن اور یہاں کراچی میں موجود ہیں۔ مجھے امید ہے ہم پھر سے ایک باہر ضرور ایک دوسرے سے ملیں گے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک کارڈ میری جانب بڑھایا۔

کارڈ کی بیک پر ایک فون نمبر جو یقیناً ان کے موجودہ استعمال میں تھا، درج تھا۔ میں نے ان کو گلے لگا لیا اور پھر ہم دونوں ہی اُس تقریب کا حصہ بن گئیں۔

میں نے گھر آتے ہی مسز مہتا کو فون کیا اس طرح ان کے پاس میرا رابطہ نمبر بھی منتقل ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

’کراچی سے بہت اہم ترین امور کے سلسلے میں کس بندے کو بھیجا جاسکتا ہے۔ جو ان ڈاکومنٹس کو فائل کر کے لے آئے۔‘

روبینہ بہت پریشان تھیں۔ امان مرزا کی سپین نے بہت اہم ڈیل کی تھی اور وہ اس وقت چونکہ خود لندن میں تھے۔ ڈیل پر اپر طریقے سے سائن کرانے کی ذمہ داری روبینہ پر آن پڑی تھی۔ مگر وہ کچھ دنوں سے نیگن کا شکار تھیں۔

اب کیا کیا جائے۔

وہ پریشان ہو گئیں۔ ان کے ذہن میں اچانک ہی صبح کی کال آ گئی۔ ان کا چھوٹا بیٹا آج ہی ایگریمر سے فارغ ہو کر اپنی اسپورٹس پریکٹس کے لیے پندرہ دن کے لیے لاہور جا رہا تھا۔

تھا تو لاہابی ہی لیکن دو بیٹوں کے بیرون ملک شفٹ ہوجانے کے باعث بڑا ذمہ دار ثابت ہو گیا تھا۔

اب یہ ذمہ داری اگر وہ ٹھیک سے نبھالیتا تو اُسے رائٹ چوائس کا ٹیگ دیا جاسکتا تھا۔ روبینہ نے فوراً ہی اُسے کال ملائی اور پھر شام تک وہ لاہور جانے کے لیے راضی ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مما میں آپ کو ہاسپٹل لے چلتا ہوں۔“ بازل نے محبت سے کہا۔

”نومائی سوٹو! آئی ایم فائن ڈارلنگ!“

”ڈیز! سچ پوچھو تو اگر میری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں بھی اپنے سوٹو کو یہ بودر (تکلیف) نہ دیتی۔“

”مما کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ..... یہ تو

اپنا کام ہے۔ اس آرٹ آف برنس..... میں بھلا کس طرح اس بات کو بودر (تکلیف) سمجھ سکتا ہوں۔“

”کوئی مائی سن! میرا اپنا تو سچ جج بہت ذمہ دار ثابت ہو گیا ہے۔“

”مما آپ کی ہمیشہ ایک بات مجھے یاد رہتی ہے کہ تم تینوں اپنے فادر کا رائٹ ہنڈر ہو۔ کبھی میں یہ نہ دیکھوں کہ تم تینوں میں کوئی کلینش ہو اور تمہارے فادر ڈسٹرب ہوں۔“

مما ہمیشہ سے میں نے دونوں بڑے بھائیوں کو پایا کے برنس میں ہاتھ بٹھانے دیکھا ہے۔ اب اگر یہ تھوڑا سا کام میرے ذمہ آپ نے لگا دیا ہے تو کیا میں اس سے منہ موڑ لوں۔ نیو-مما۔ آئی لو مائی جیرنس۔ آئی لو پو۔“

میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ یہ تربیت کا اثر ہوتا ہے جو ہمیں انعام کی صورت ملتا ہے۔

”مما آپ ایزی فیل کر رہی ہیں نا۔“

بازل نے اپنے بازو میرے گرد حائل کر دیے۔

”او کے جانو! اب تو گلٹا ہے سب ٹھیک ہے۔“

مجھے پھر سے میگن محسوس ہو رہا تھا مگر میں بازل کو اس وقت ڈسٹرب کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

”مما آپ ہمیشہ مجھے اپنے دے گئے حکم پر او بیڈنٹ پاس کریں گی۔ لیکن ایک وعدہ کریں کہ آپ ڈاکٹر کے پاس لازمی جائیں گی۔“

”او کے جانو! میں چلی جاؤں گی۔ ڈونٹ وری۔“

بیٹے کی محبت سے سرشار میں اپنی طبیعت میں بہت بہتری پائی تھی۔ اولاد کا سکھ تو آپ ہی ایک فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔ میں اسی سرشاری

میں گم تھی کہ موبائل پر پیپ ہونے لگی۔

”ہیلو! کیسی ہیں آپ مسز امان!“ فون پر مسز مہتا تھیں۔

”بس کچھ میگن کی شکایت ہے۔“

”اوہ! اب تو مجھے آپ کے پاس آنا ہی پڑے گا۔ آئی وڈ لاک ٹو میٹ ڈو! پو!“

”آپ کس جگہ پر قیام پذیر ہیں مسز مہتا؟“

میرے اس سوال پر انہوں نے مجھے اپنی ریڈیڈنس کے بارے میں مطلع کیا۔

”میں ابھی ڈرائیور بھیج دیتی ہوں۔ یقین کریں اگر کچھ بہتر فیل کرتی تو خود لینے آئی مگر.....“

”اس او کے! اس ناٹ آ میٹر۔“ یہ کہہ کر فون بند ہوا اور میں نے فوراً ہی ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا کر مسز مہتا کی طرف روانہ کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”سوسنا آف ٹو مسز امان! واٹ آپیلس!“

مسز مہتا مسلسل ہمارے آشیانے کو سراہ رہی تھیں۔ میرے لیے اب یہ باتیں قطعاً معنی نہیں رکھتی تھیں۔ گھر ایک خواب ہوتا ہے اور اگر خدا آپ کے خواب کو خوابوں جیسا ہی گھر دے تو پھر جنت کا نظارہ اس دنیا ہی میں ہو جاتا ہے۔

”اب بتائیں کہ آپ کو میگن کی شکایت کب سے ہے؟“ مسز مہتا ڈاکٹر بن گئیں۔

”پہلے بتائیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔“

”ہوم ڈاکٹر کہہ سکتے ہیں۔“

”او کے..... بس مجھے دوسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد سے یعنی میں برس سے پرالم ہے۔“

”اسٹریس کیوں لیتی ہیں ہر بات کا۔“

انہوں نے جیسے میرے اندر جھانکا تھا۔
”میں..... میں تو کسی بات کا اسٹریس نہیں
لیتی ہوں۔“ میں گڑبڑائی۔

”ایک بات ہم دونوں ملکوں کے عوام میں
بہت عام ہے۔ ہماری عورتیں برداشت کے
سمندر اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ہرز یادتی اور ظلم سہہ
کر بھی..... سب کچھ OK ہے کالغہ لگاتی ہیں۔“
”ارے ارے سز مہتا ایسی کوئی بات نہیں۔
آپ خیال نہ کریں۔ آئی ایم فائن۔“
”گدا! وہ استہزائیہ مسکرائی تھیں۔

”آپ بالوں کے لیے کیا استعمال کرتی
ہیں۔ مطلب بالوں کو بھی غذا کی ضرورت ہوتی
ہے اور بال جاندار ترین شے ہیں۔ یہ تو آپ
جانتی ہیں۔“

”جی بالکل! کچھ خاص نہیں۔ بس شروع سے
ہی امپورٹڈ ’کمز‘ شیمپو اور کنڈیشنرز یوز کرتی رہی
ہوں۔ اس عمر میں آکر کیا فلابے ملاؤں۔“

میں مسکرائی، اچانک سے آنکھیں بوجھل
ہونے لگی تھیں۔ وہ ہماری کیفیت بھانپ گئیں۔
”آئی تھنک یو ٹیل میگزین ناؤ!“

”بس کچھ.....“ میں نے ماتھے پر انگلیوں
سے مساج کرتے ہوئے کہا۔

”آئی ہیو آ سلوشن!“ انہوں نے اپنے بیگ
سے ایک بوسل نکالی۔ اُس بوسل سے کور ہٹا ہوا تھا
یعنی بالکل وائٹ بوسل تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔
”یہ آپ کے لیے ایک علاج ہے۔ آپ

جامیں اور نیم گرم پانی سے شاور لیں۔ سر کو اس
شیمپو سے دھو کر آئیں۔ تب تک میں آپ کے
فیلی الیم دیکھتی ہوں۔ یقیناً جس طرح تصویروں
سے آپ کے کمرے کی Walls بھی ہیں تو آپ

کے پاس یادوں کے خزانے بھی تصویروں کی
صورت الیم میں بند پڑے ہوں گے۔“ وہ
مسکرائیں اور پھر میں بھی مسکرائی۔

میں کچھ دیر بعد سز مہتا کے آگے المیز کے
ڈیسک لگا کر ہاتھ لینے چل پڑی تھی۔

ہم امپورٹڈ چیزیں استعمال کرنے والوں کا
الیم یہ ہے کہ ہمیں دیگر تمام چیزوں کے رنگ،
خوشبو ڈالنے، استعمال سب بھول جاتے ہیں۔ بس
ہمارا ایمان مہنگی سے مہنگی چیز ہی ہوتا ہے۔ ہمیں
جتنی مہنگی چیز ملتی ہے ہم اس کی کوالٹی کوئی نمبر ہون
سمجھ کر مطمئن ہوتے ہیں۔

میں نے جب بال شیمپو کیے تو ذہن میں یہی
تھا کہ یہ بہت مہنگا شیمپو ہے۔ اور پھر جب میں
شاور لے کر آئی تو کچھ دیر کے لیے بال ڈرائی

کر کے ایزی چیز پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھ لگ گئی۔
کچھ دیر بعد جب اچانک میں ہڑبڑا کر اٹھی تو.....
یہ تو چسکار ہو گیا تھا۔ میں بہت پرسکون تھی۔

میگزین غائب تھا۔
”اوہ! سز مہتا!“ میں اچانک انہیں یاد کرتی

کمرے میں آئی۔ وہ وہیں موجود میری یادوں
سے محفوظ ہو رہی تھیں۔
”ہیلو! چار منگ لیڈی..... آر ٹو فائن ناؤ!“

وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔
”میں بہت ہلکا چسکا محسوس کر رہی ہوں خود
کو۔“

”میں جانتی ہوں آپ اسی طرح ہلکا چسکا
اور ایزی ٹیل کریں ہمیشہ۔“

”انشاء اللہ! خدا نے چاہا تو!“
”آپ کا خدا تو چاہتا ہے مگر آپ لوگ نہیں
چاہتے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ خدا نے عقل تو سب کو دی
ہے نا۔ تو پھر اُس عقل کا فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے
ہم۔“

”پلیز کھل کر بتائیں۔“ میں جربز ہوئی۔
”ہمارے پاس دماغی مسئلے کا سب سے
آسان حل موجود ہے۔ دیکھیں سز اماں۔ میں

بہت پریکٹیکل وومن ہوں۔
میں آج سے دس سال پہلے بہت سارے
ہیئر پرائمر اور اس بیگزین کا شکار تھی۔ سچ پوچھیں

تو کوئی ویدڈا کمر نہ چھوڑا تھا۔
مگر نتیجہ؟ (زیر د) اور پھر اچانک سے میں
نے ایک دن ایک چسکاری شیمپو کا ایجوگ کیا۔

(استعمال کیا) وہ شیمپو استعمال کر کے ہفتے دو ہفتے
میں سچ سچ چسکار ہو گیا۔
اور پھر..... آپ نے مجھ میں ایک بہت

خاص کشش محسوس کی تھی اور اب یہ چسکار آپ بھی
دیکھیں گی۔“
”پلیز سز مہتا! کیوں مجھے اس چسکاری شیمپو

کے نام سے اب تک بے خبر رکھے ہوئے ہیں۔
اب بتا دیجیے۔“
یہ کہہ کر میں ان کے مزید نزدیک ہو گئی۔

”ویٹ آ منٹ۔“
سز مہتا نے اپنے بیگ سے شیمپو سے ہٹایا
گیارہ پر نظروں کے آگے کر دیا۔

رہبر دیکھ کر مارے حیرت کے میری آنکھیں
اُٹنے کو تیار تھیں۔
”یہ!! اوہ مائی گاڈ! سز مہتا! لائف بوائے

شیمپو!“ مارے حیرت کے میں گنگ تھی۔
”جی ہاں..... یہ ہے وہ چسکار..... لائف
بوائے شیمپو! اور پھر ہم لوگ ہیں ناقص کے کچے جو

کبھی اپنی اہم ترین پراڈکٹس پر بھی توجہ نہیں
دیتے۔ لائف بوائے شیمپو میں ملک پر وٹین شامل
ہے۔ بادام کے تیل کی خاصیت لیے اس میں اہم

عرقیات ہمارے بالوں کو ہی نہیں بلکہ ہمارے
دماغ کو بھی شفا دیتے ہیں اور کئی بیماریاں
ہمارے پاس نہیں آتی ہیں۔

اب بھلا بتائیں۔ لائف بوائے شیمپو بنانے
والوں کو پتا ہے کہ ہم اس منفرد اور سستے شیمپو سے
کتنی مہنگی بیماریوں سے چسکارا پاتے ہیں۔ اگر پتا
چل جائے انہیں تو یہ شیمپو ڈالر میں فروخت ہو۔“

سز مہتا اپنی بات کر کے خاموش ہوئیں تو
مجھے لگا مجھے کچھ بولنا چاہیے۔
”لائف بوائے شیمپو تو تین زمانے سے دیکھ
رہی ہوں سز مہتا۔ یقیناً آپ بھی دیکھ رہی ہوں
گی۔“

اس کی قیمت تو شروع سے بہت کم ہے لائف
بوائے شیمپو یقیناً لوگوں کے لیے ایک تحفہ ہے جو
ہمیں معلوم ہی نہیں ہے۔ لائف بوائے شیمپو کی

قیمت اتنی ہی ہے جتنی کہ ایک عام پاکستانی آؤرڈ
کر لے۔ کیوں! کیا میں نے غلط کہا۔“
”بالکل ٹھیک! تو پھر آج سے میں اور آپ

بھی ہوئیں لائف بوائے شیمپو کی اسیر۔“
”بالکل..... کیوں نہیں۔ ہم دونوں بھی آج
سے اسی چسکاری ہیں شاہکار۔“

سز مہتا چاچکی تھیں۔ اور میں آج کی رات
سکون سے سوئی تھی۔

☆.....☆
بازل کافون آیا تو میں ابھی تھی۔
”مما! کیسی ہیں آپ؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سو نو تم بتاؤ بیٹا
آرام سے پہنچ گئے تھے نا۔“
”میں ہاں! بس آپ کی طرف سے فکرتھی۔“

☆.....☆
☆.....☆
☆.....☆

☆.....☆
☆.....☆
☆.....☆

”ارے جانو! ایک انٹریزی۔ میری فکر تو سز مہتا نے چٹکیوں میں ختم کر دی تھی۔“ اور پھر میں نے بازل کو جب ساری کل والی بات بتائی تو وہ بھی حیران ہو گیا۔

مگر اس میں حیرانی کی بات نہ تھی بلکہ ہماری کم فہمی ہمیں بعض اوقات سچ فیصلوں سے دور کر دیتی ہے۔ ہمیشہ اپنی ذات کے لیے اپنی ہی دیکھی چیز کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جیسے ہمارا لائف بوائے شیپو ہمارے بالوں کے مسائل کا جیج خاتمہ کرتا ہے مگر..... ہم کتنے کم فہم ہیں نا۔

☆.....☆.....☆

آج اس واقعے کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ میں ایک پُر سکون زندگی گزار رہی ہوں۔ لائف بوائے شیپو نے میری لائف میں بالوں کی اہمیت واضح کر دی ہے اور آج میں بھی اپنے بالوں پر جتنا فخر کروں کم ہے لیکن یہ سب ممکن تو صرف لائف بوائے شیپو ہی ہے ہونا۔ سز مہتا کی طرف سے ایک میل آئی ہوئی ہے۔ میں بار بار اسے پڑھ رہی ہوں۔

تم نے سوچا تو ہوگا..... دیکھا نہیں خشک صحرا یہ جب برس جائے ایک جھلکا ہوا بھر اسادان دیر تک ریت سنسناتی ہے

ایک موہوم امید ہے شاید اب کے کہیں کوئی کوئیل جنم لیتی ہوئی نظر آئے

باجھ صحرا کی گود بھر جائے

”سزا ان! پتا نہیں کیوں میں اب تک پھر پاکستان نہ آ سکی لیکن ایک چیز ہمیشہ تڑپاتی ہے۔“ پاکستان میں داعی محبت اور محبت دینے والے لوگ موجود ہیں۔ یہ نظم بہت پسند آئی۔

آپ کی امید جس طرح لائف بوائے شیپو نا اسی لائف بھر کے لیے میری اور آپ کی دوستی بھی مثالی بن گئی۔ کاش کوئی ایسا چٹکار ہو جائے کہ دلوں کی ساری بدگمانیاں بھی دھل جائیں۔ کاش انسان انسان سے پیار کرے سرحدیں پھول برساگیں اور ہر طرف بہاری بہار ہو۔

اور ہاں سزا مان! اب یہ میری اپنی poetry آپ کے لیے، امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

زندگی نام ہے

ملنے کا بچھڑ جانے کا

زندگی تو کبھی رکتی ہی نہیں

چلتی رہتی ہے، چلتی رہتی ہے

ہم فقط سال گنتے رہتے ہیں

اور محبت کو لے کر اس دل میں

پھر مدد وصال گنتے رہتے ہیں

اس برس جب ہوں نہ محبت کا

میں کروں گی تمہارے نام وہ دن

اور ایک اور عالم انگوں کی

زندگی بھل ہو بھیگی یہاں

ہم ہوں سرحد کے آ رہا ہوں پار

بس محبت سے ہم ہمیشہ ملیں

آشنا جیون کی بس محبت ہو

زندگی نام ہے محبت کا

سز مہتا

☆.....☆.....☆

لائف بوائے شیپو..... تم نے سز مہتا کی صورت مجھے ایک ایسا گفٹ دیا ہے کہ میں لائف بھر تمہارا احسان مانتی رہوں گی..... سوکھو..... میری بھی سز مہتا کی امید بھری آس والی دعا کاش رنگ لے آئے۔

☆.....☆.....☆

نیراز اختر سے جڑی منظر کا بیان
جن کے لہجے میں شاعرانہ انداز ہے
ملک اور ہر دن ملک سے پیار کی گاتے ہیں

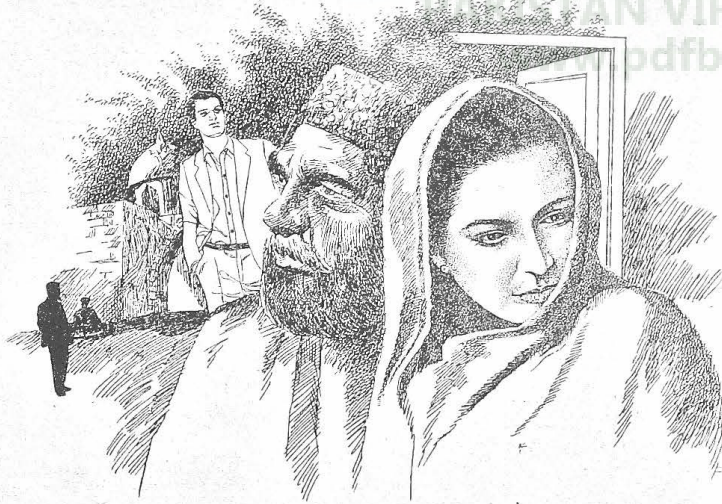
یہ بڑے گرم گے ہیں فیصلے!



عبدالغفار عابد

اُس دوشیزہ کی داستان الم، جس نے شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر ظلم سہا
پہلی طویل کہانی کی صورت ایک یادگار کھٹا

”ہارون بیٹے۔“ مسہری پر نیم دراز ابا حضور نے اپنی دائیں طرف رکھی کرسی پر بیٹھے اپنے بڑے صاحبزادے کو مخاطب کیا۔ مسہری کے بائیں طرف کرسی پر ابا حضور کے چھوٹے صاحبزادے رشید میاں بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ بائیں کی جانب ابا حضور کی بیگم شائستہ خاتون بیٹھی چھالہ کاٹ رہی تھیں۔
”جی ابا حضور حکم!“ ہارون میاں نے ادب سے جواب دیا۔



”بارون میاں ہمارا پوتا امجد اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے غریب انگلینڈ سے آنے ہی والا ہے۔“ ابا حضور اتم کہہ کر حق گو گزارنے لگے۔ دونوں صاحبزادے ابا حضور کو ایک ٹکد دیکھتے ہوئے اُن کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔ شائستہ خاتون بھی چھایہ کاٹنے ہوئے رُک کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی تھیں۔

”میں بارون میں چاہتا ہوں تمہارے بیٹے امجد کے انگلینڈ سے آتے ہی تم اس کی شادی اپنے چھوٹے بھائی رشید میاں کی بیٹی جنت النساء سے کر دو۔“ دونوں بھائی کن انکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے مگر خاموش بیٹھے رہے۔

”آپ دونوں بھائی خاموش بیٹھے ہیں۔ کیا میں نے غلط فیصلہ کیا ہے؟“ ابا حضور نے ایک بار پھر حق گو گزار کر دونوں بیٹوں سے سوال کیا۔

”ہرگز نہیں ابا حضور! آپ بزرگوں کے فیصلے تو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ میری خاموشی کی وجہ سے دراصل کچھ اور ہے۔“ بارون میاں نے بہت ادب سے جواب دیا۔

”مثلاً کیا وجہ ہے۔ بیان کریں۔“

”ابا حضور آپ تو جانتے ہیں کہ میرے صاحبزادے بچپن سے انگلینڈ کے ماحول میں اپنے چھوٹا چھوٹے پاس رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں ماحول میں بڑھی میری بیماری جتنی کو قبول نہ کریں۔“

”ہوں!“ ابا حضور کچھ دیر تک حق کے منہ میں لیے سوچتے رہے پھر انہوں نے اپنی نیگم کو مخاطب کیا۔

”آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میرے خیال میں تو بارون میاں ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔“ شائستہ بیگم نے اپنے کی حمایت میں جواب دیا۔

”دیکھو میرے بچو! ابا حضور نے دو تین لمبے لمبے کس لینے کے بعد سوچتی ہوئی نظر سے دونوں بیٹوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”ہر انسان کا ایک مرکز ہوا کرتا ہے کوئی بھی انسان اپنے مرکز سے ہٹ کر خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ چلا جائے۔ اسے ایک نہ ایک دن اپنے مرکز پر واپس آنا ہی پڑتا ہے۔

آپ لوگ جانتے ہیں کہ وہ مرکز کیا کہلاتا ہے؟“ دونوں بیٹوں نے نفی میں گردنیں دائیں بائیں ہلایں۔

”اس مرکز کو مذہب یا دھرم کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرا پوتا امجد الحمد للہ ایک مسلمان گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ یہ درست ہے کہ امجد انگلینڈ کے ماحول میں پل کر جوان ہوا ہے۔ تاہم پیدائش کے بعد اُس کے کانوں میں دی جانے والی اذانوں نے میرے پوتے کو مرکز اسلام سے وابستہ کر دیا ہے۔

”خدا نہ کرے جیسا کہ آپ کا اندیشہ ٹھیک نکلے۔ لیکن خدا خواستہ ایسا ہو بھی گا۔ تو وہ اپنے مرکز سے زیادہ دنوں تک دور نہیں رہے گا۔ بات کو اختتام تک پہنچانے کے بعد ابا حضور حق گو گزارنے لگے تھے۔

”اے، میں تو جانتی ہوں امجد کو الگ بیٹھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ شائستہ خاتون نے پان کی گھڑی منہ میں رکھتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”الٰہی کنیز نہیں اسی حضور انگلینڈ۔“ رشید میاں نے تصحیح کی اور سب شائستہ خاتون کے غلط تلفظ پر مسکرائے۔

”اے بیٹا یہ گوڑ ماری فرنگی بولی بھی عجیب ہے۔ بولوں کچھ ہوں منہ سے نکلتا کچھ ہے۔“

”ہمیں آپ کا یہ بھولپن ہی تو پسند ہے جو انگریزی الفاظ کی حجامت کر کے ہم سب کو مسکرائے۔“

”ابا حضور نے ہنستے ہوئے نیگم کو مخاطب کیا۔

تب اس فیصلے کی روشنی میں کہ امجد میاں کے انگلینڈ سے آنے کے بعد ان کی شادی جنت النساء سے کر دی جائے گی۔ یہ نشست برخاست ہوئی تھی۔ دروازے کی آڑ میں چھپی ہوئی جنت نے ساری کارروائی سنی اور امجد سے شادی کا فیصلہ نہ کر شرم سے گلابی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

جنت کو زمین مخلوق میں شمار کرنا گویا اس کے حسن کی توہین تھی۔ وہ تو ایک حور مجنوں غلطی سے جبکہ گردن میں آگنی تھی۔ جنت کے چہرے پر رستا ہوا نور اور حیا سے جھکی ہوئی گھنیری پلکیں لوگوں کو بے اختیار بار بار اُس کا پر نور چہرہ دیکھنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

جنت اپنے نام کی طرح اہم باہمی تھی۔ پانچوں

وقت نماز کی پابند اور درود شریف کا ورد اُس کے معمول کا حصہ تھا۔ جنت نے اپنے کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری بنائی تھی۔ اس میں انبیاء علیہ السلام اور بزرگان دین اور احادیث مبارکہ پر مشتمل کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔ جنت بہت پابندی سے اور بغور ان کتب اور احادیث مبارکہ کا مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ یہی جنت کا شوق تھا اور یہی اس کی چھوٹی سی دنیا تھی جس میں اُسے سکون اور اطمینان کی ہر دولت میسر تھی۔

احادیث مبارکہ کا بار بار مطالعہ کرتے رہنے سے جنت کو ستر سے زیادہ احادیث حریف بہ حرف زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ جنت کا شوق صرف مطالعے کی حد تک نہیں تھا۔ وہ فرماں نبوی ﷺ اور بزرگان دین کی ہدایتوں پر چلتی ہے۔

گھر والوں نے جنت کو جب بھی دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کو پیارے آقا ﷺ پر درود پاک پڑھتے ہوئے ہی پایا۔ پھر جسے اپنے بزرگوں کی خدمت اور نبی پاک ﷺ پر درود شریف بھیجے کے علاوہ کسی دوسری شے سے ذرا بھی رغبت نہ ہو اس کے چہرے پر برسنے والے نوکر کیوں کر الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

جنت سب سے زیادہ اپنے دادا اور دادی کی آنکھوں کا تار تھی۔ اس کے دادا یا اور شید میاں جب بھی باہر جاتے جنت سے اُس کی پسند کی شے لانے کا ضرور پوچھتے تھے اور جنت کی پسند بیشک دینی کتاب ہوتی تھی۔

☆.....☆.....☆

امجد میاں اپنی اعلیٰ تعلیم کی سند کے ہمراہ انگلینڈ میں پچیس سال کی عمر پوری کر کے اپنے وطن لوٹ آئے۔ ایک پبلشنگ پورے گھر میں نظر آئے گی۔ دادا دادی نے بلا لیں۔ ماں باپ نے لپٹا کر پیار کیا اور چچا بھی ہونے والے ساس (سسر) نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا میں دیں۔ دیکھتے دیکھتے دو ماہ پلک جھپٹتے گزر گئے۔ امجد بیگم ولایت میں رہا تھا۔ تاہم اس کے چچا پھونچنے کے اسے اپنے مذہب کی تعلیمات سے بڑی حد تک روشناس کرا تھا۔ یہی وجہ تھی جو یہاں آ کر امجد اپنے بزرگوں کی عزت میں کوئی کمی نہیں آنے دیتا تھا۔ تاہم امجد کا مارگٹ ہیش اس کی پیاری دادی جان ہی بنتی تھیں۔ جو انگریزی

کا حلیہ بگاڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ امجد بھی کبھی ہتھار اگر بڑوں کے لہجے میں بولی جانے والی اردو میں دادی جان کو مخاطب کر کے پھیرا کرتا تھا۔

آج بھی دونوں دادی پوتے صوفے پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ بارون میاں اخبار پڑھ رہے تھے اور رشید میاں کوئی شے شغل فرما رہے تھے۔ اچانک دادی جان نے پان لگاتے ہوئے امجد کو مخاطب کیا۔

”بیٹا امجد!“

”جی دادی جان اینڈرگرینڈ ماں۔“

”ارے بیٹا مجھے صرف دادی جان ہی کہا کر۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی تیرے دادا جان نے تیری شادی اپنی پوتی جنت سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”ہاں میں جنت میسر جیرا اناڑ۔“ امجد نے مسکراتے ہوئے دادی جان کو چھیڑا۔

”او میاں جیرا اناڑ..... اب میری بھی سنو۔“ بارون میاں نے تیر نظروں سے امجد کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

”جی ابوکم۔“ امجد فوراً ہی مودب ہو گیا۔

”تم نے کیا فیصلہ تمہارے دادا جان کا ہے جو تمہارے باپ کے کبھی باپ ہیں۔“

”لیکن ابو.....“ امجد نے احتجاج کرنا چاہا تھا۔

”فیصلے میں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔“

”او کے ابو، پیارے دادا جان کا فیصلہ سراسر آنکھوں پر۔“ امجد نے مسکرا کر جواب دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

”جیتے رہو میرے چاند اب ادھر آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔“ دادا جان نے امجد کو مخاطب کیا۔ دادا جان نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ ورنہ وہ خاموشی سے سب کو سنتے رہے تھے۔ امجد اگر ان کے سینے سے لگ گیا۔

”اب جاؤ اسی خوشی میں مارکیٹ سے مٹھائی خرید لاؤ۔“ دادا جان نے امجد کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کی پیشانی چومی اور جب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے دے دیتے ہوئے ہدایت کی۔

”بیٹا امجد لگے ہاتھوں میرا بھی ایک کام کر دینا۔“ دادی جان نے امجد سے کہا۔

”ارے پیاری دادی جان حکم کریں میں تو کام تمام

کردوں گا۔“ امجد دادی جان کو محبت سے پہنا تے ہوئے بولا۔

”امجد! ہارون میاں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹے کو مرنے لگتی کر لی جانی۔

”ارے چل رے، میرے پوتے کو آنکھیں نہ دکھا۔“ تو میرا چیتا میری آنکھوں کا نور۔“

”اور ماتھے کا نور (درد)۔“ دادا جان نے لقمہ دیا اور ہال بقیوں سے گوج اٹھاتا۔

”ہاں تو بیٹا امجد میں کبہ رہی تھی۔ جب مٹھائی لے کر لو تو اپنا پنگالے لیتا۔“

”اے پنگالے لوں، مگر کس خوشی میں۔“ امجد نے دادی کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اوں ہوں بیٹا، کیسے سمجھاؤں اچھا پنگامت لے نا مگر میرے گھینامول ضرور لے لیتا۔“

”دادی جان لگتا ہے آج آپ میری ہڈی پیلی تروا کر ہی چھوڑ دیں گی۔ کبھی پنگالے لوں کبھی کا کبیر گھیت لوں۔“

”ادھر آؤ بیٹا میں سمجھاتا ہوں۔“ دادا جان نے مسکراتے ہوئے امجد کو بلایا۔ ہال میں موجود ہر ایک کے لبوں پر مسکراہٹ تھیں۔

”بیٹا میڈیکل انسٹور سے پنگا کی جگہ چین گے لے لیتا۔ دراصل یہ آئینٹ ہوتا ہے جو درد کی جگہ پر ملنے سے درد سے آرام دیتا ہے۔ اور دوپتر سے میرا سینا مومل ٹیبلٹ کے خرید لیتا تمہاری دادی جان ان ہی چیزوں کے لیے کبہ رہی ہیں۔“ پھر دادا جان اپنی بیگم کی سادگی پر مسکرانے لگے۔

”واہ۔“ میری دادی جان کا ش آپ انگلیفٹ میں ہوتیں۔ ہر طرف صحت نامم بھی ہوئی نظر آئی۔“ امجد نے فرط محبت سے دادی جان کو لپکا کر ان کی پیشانی چومی اور

مطلوبہ اشیا خریدنے کی غرض سے مارکیٹ روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے میں امجد سب چیزیں خرید لیا تھا۔ دادی جان نے بیٹوں میں مٹھائی بٹا کر سب کو دی۔ جنت شرم کی وجہ سے یہاں موجود دھنیں بھی چنانچہ دادی جان نے ایک پلیٹ امجد کو دیتے ہوئے ہدایت کی کہ جا کر اوپر جنت کو دے دو۔

”مس پیراڈائز۔“ امجد نے جنت کو چھیڑا۔ اور جنت کی نظروں کے ساتھ ہی گردن بھی شرم سے جھک گئی۔

”اللہ! آپ یہاں کیوں آ گئے۔ ہمیں حیا آ رہی ہے۔“

”مس پیراڈائز میں دودھ اور شہد کی مہروں کو پینے نہیں آپ کو مٹھائی کھلانے آ یا ہوں۔ امجد مسکرایا۔

”آپ کھائیں گے مٹھائی۔“ جنت بولنا لگی۔

”آف کورس! جنت کے ملنے پر خوشی سے باہنی جارہی ہے۔“

”آپ پلیٹ رکھ دیں ہم کھائیں گے اور اب خدا کے لیے چلے جائیں، کسی نے دیکھا یا تو؟“

”کوئی دیکھنے نہ دیکھے مگر دادی جان نے مجھے مٹھائی دے کر آپ کو پی بھر کے دیکھنے کے لیے بھیجا ہے۔“

”آپ نہیں مانتیں گے۔“ کہتے ہوئے جنت نے شرم سے آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ اور امجد نے گلاب جاسن جنت کے منہ میں خوشن کریلیٹ میز پر رکھ دی تھی۔

☆.....☆.....☆

چھ ماہ کے قلیل عرصے میں امجد اور جنت شادی کے مقدس بندھن میں بندھ گئے۔ امجد کو ایک بڑی کمپنی میں سیکرٹری کی نوکری مل گئی۔ اور دن بھر خوش اور سکون اطمینان سے گزرنے لگے۔

”کیا خیال ہے جنت آج چھٹی کا دن ہے۔ کیوں نہ کہیں سیر و تفریح ہو جائے۔“ امجد نے جنت کو مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔

”سیر و تفریح۔“ جنت نے چونک کر دھرایا۔ اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

”ہاں بھئی کراچی میں کئی پکنک پوائنٹ ہیں۔ جہاں کھوگی چلے جائیں گے۔“

”ستیا جی بھٹے چلنے میں تو اعتراض نہیں مگر میں برقعے میں جاؤں گی دوسرے مجھے کسی ایسی پیک پلیس پر نہ لے جائے گا جہاں مردوں کی بھیڑ بھاڑ ہو۔“

”ٹھیک ہے پھر ہم لاٹنگ ڈرائیو پر چلیں گے۔“

امجد نے جواب دیا۔

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ کہہ کر جنت تیزی سے تیار ہونے لگی پھر برقعہ اوڑھ کر اپنے تایا ابو کے پاس پہنچ گئی۔

ہارون میاں اور ان کی بیگم اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے کسی مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ جنت کو دیکھتے ہی دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

”اوہ..... بھئی آج تو ہماری بہو بہت ہی پیاری لگ رہی ہے۔ کیا نہیں جانے کا پروگرام ہے؟“

ہارون میاں نے جنت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں تایا ابو..... آج یہ تفریح کرانے لے جا رہے ہیں۔“ جنت نے شرم سے نگاہیں جھکائے جواب دیا۔

”میں آپ لوگوں سے اجازت لینے آئی ہوں۔“

”شکر ہے اس بیوقوف کو خیال تو آیا۔ دیے جنت بیٹی امجد آپ کا شوہر ہے، وہ جہاں لے جانا چاہے آپ چلی جا یا کریں۔ ہماری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تے تایا ابو اجازت کی ضرورت بالکل ہے۔ کیونکہ اجازت گئے ساتھ ساتھ ہمیں وہ دعائیں بھی ملنی ہیں جو بزرگ اپنے بچوں کو رخصت کرتے وقت اپنے دل کی گہرائیوں سے دیتے ہیں۔“ جنت نے بڑھ کر ہارون میاں کے گلے سے لگ کر جواب دیا۔

”میری بیٹی۔“ ہارون کا دل بھر آیا۔ اور وہ رومال سے آنکھیں خشک کرنے لگے۔

”جاؤ بیٹی امجد انتظار کر رہا ہوگا۔“ تائی انی نے جنت کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اور جنت دونوں کو اب سے سلام کر کے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

بال آخر دو سال گزر گئے۔ ان دو برسوں میں بیکے بیکے کھلے جانا جاتا ہوا رہے تھے۔ امجد نے اپنی جنت سے کمپنی کو کافی منافع بخش مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ کمپنی کے مالک عثمان بڑائی امجد کے کام سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ وہ خود تو بھی بھاری پتی کا چکر لگاتے تھے۔ البتہ سارا کاروبار ان کی بے انتہا یک چرخ اور خدی بیٹی مشہورہ بڑائی نے بحیثیت فینک ڈائریکٹر

کے سنبھالا ہوا تھا۔ مشہورہ خود بھی امجد کی کام سے لگن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور گا بے گاہے امجد کے کام کی تعریف بھی کرتی رہتی تھی۔ ان دو برسوں میں دونوں غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ اور بات آخر کار شادی کے بندھن میں بندھ جانے تک پہنچی۔

مشہورہ ایک ماتحت کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے پر تیار نہیں تھی مگر اپنے باپ سے مجبور تھی جو امجد جیسے بھتیجے اور کروڑ پانچواں مارنٹا پر مصر تھا، یہ پہلا حادثہ تھا۔ دوسرا حادثہ وہ تھا جب امجد جنت کو سیر کرانے لے کر گیا تھا۔ امجد کے بار بار کہنے پر جنت نے برقعے کا نقاب تو اٹھ لیا تھا مگر برقعے سے باہر آنا گوارا نہ کیا۔ وہ جنت کے ساتھ گھومتے ہوئے ایک عجیب سی سخت محسوس کر رہا تھا۔

دراصل اس میں امجد کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ جس دیس میں رہ کر واپس آیا تھا۔ وہاں کے ماحول کا کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ تھا۔ گوکہ کراچی میں بھی کسی مقام پر انگلینڈ کے ماحول کی جھلک موجود تھی۔ لوگ اپنی بیویوں کو لے کر اور جوان لڑکے لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے تفریح کا سہ لے رہے تھے۔

کئی خوش نگہروں نے مسکراتی نظروں سے امجد اور برقعے میں چھپی ہوئی جنت کو دیکھا اور امجد شدید ترین سبکی محسوس کرنے لگا۔ وہ اس لمحے کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا جب اس نے جنت سے تفریح کے لیے چلنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

تیسرا حادثہ مندرجہ بالا دو حادثوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی سنگین صورت اختیار کر چکا تھا۔ جس کا اثر سب گھر والے بھی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ گھر کے سونے آگن میں ابھی کسی نئے سے وجود کے آثار نہیں تھے۔ امجد کی جھنجھلاہٹ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ گھر کے ماحول پر جھایا ہوا سکوت صریحا کسی طوفان کے رونا ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ اور پھر..... گھر میں بھونچال آئی گیا۔

”دادی جان میں اب دوسری شادی کر رہا ہوں۔“

امجد نے یہ بات اس وقت کہی جب ہال میں سب ہی

موجود تھے۔
 ”دوسری شادی مگر کیوں؟“ ہارون نے چونک کر
 امجد کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔
 ”کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں۔“ امجد نگاہیں نیچی کیے
 بڑبڑایا۔
 ”وجہ ایک ہو یا دس، آپ ایک ایک کر کے سب
 بتائیں۔“ اس مرتبہ دادا جان پوٹے تھے۔
 ”دادا جان میں نے کوشش کی تھی کہ جنت کو لے کر
 باہر لنگوں۔ اُن کو اپنے آفس میں کام کرنے والے اپنے
 دوستوں اور اُن کی یکہات سے ملواؤں، مگر یہ محترمہ برقعہ
 اُتارنے پر تیار ہی نہیں ہیں اور نہ کسی گیت ٹو گیدر میں
 ساتھ جانے پر آمادہ ہوئی ہیں۔ سارے دوست مجھ پر
 چہبتاں کتے ہیں میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ دور بیویوں
 کو گھر میں بند رکھنے کا نہیں ہے دادا جان۔“
 ”چٹیک بننا امجد ہماری پاکیزہ تہذیب تک ہمارے
 جادو اور دھڑے صوبی ہے۔ اب تو ہم اپنی شناخت کو کھو کر
 نقفن بھری اس مغربی تہذیب میں سانس لے رہے
 ہیں۔ جو جدید تہذیب و تمدن کے نام سے جانی جارہی
 ہے۔ یہ آزادی کا دور ہے۔ اس غلط دور میں ہم اپنی
 بیویوں کو گھر کی عزت بنا کر رکھنا پسند نہیں کرتے۔“
 ”دوسری وجہ بھی ہے دادا جان۔ ہر ماں باپ کو
 اولاد کی آرزو ہوتی ہے۔ لیکن دو سال کی مدت گزرنے
 کے باوجود جنت مجھے اس قدر محروم رکھے ہوئے ہیں
 اور یہی وجہ ہے میرے دوسری شادی کرنے کی۔“
 ”اور ایسا ہو نہیں سکتا۔“ ہارون میاں نے غصے کے
 عالم میں تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ معا
 جنت پھرتی ہے آگے بڑھتی ہے اس نے اپنے سرسریاں ابو کو
 بشکل تمام واپس بٹھایا اور اُن کے آگے ہاتھ جوڑ کر
 کھڑی ہو گئی۔
 ”تایا ابو اس میں غصہ ہونے والی کیا بات ہے۔ خدا
 کی مصلحت سے میں ان کو اولاد کی خوشی نہیں دے سکی۔ مگر
 دوسری شادی کی اجازت پوری ہوش مندی سے دے
 رہی ہوں۔“ جنت نے انتہائی محبت سے ہارون میاں کو
 سمجھایا۔
 ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں جنت بیٹی؟“

”تایا ابو جب اللہ تعالیٰ نے ہی مرد کو چار شادیوں
 کی اجازت دی ہے تو جنت اس کے حکم کے آگے کیا کہہ
 سکتی ہے۔“
 ”مگر بیٹا یہ اجازت بھی کچھ شرائط کی روشنی میں دی
 گئی ہے۔“ دادا جان نے مداخلت کی۔
 ”ہاں دادا جان آپ کی یہ پونی اور تایا ابو آپ کی
 بیوی آپ کے صاحبزادے کے ساتھ سو سنانی میں مودتیں
 کر سکتی۔ نہ ہی ان کو اولاد کی خوشی دے سکی ایسی صورت
 میں میرے سرتاج کو دوسری شادی کرنے کا مکمل اختیار
 ہے۔“
 ”میری بیٹی کیا آپ اس کڑے امتحان سے دل
 گرفتگی کا شکار نہیں ہوں گی؟“ ہارون میاں نے سوال
 کیا۔
 ”تایا ابو میں اپنے شوہر کی خوشی میں خوش ہوں۔
 میں بھلا دل گرفتہ کیوں ہوں گی۔ میرے دل کے سکون
 کے لیے میرے اللہ اور پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت
 ہی کافی ہے۔“ جنت کا فیصلہ کن کرماحول گہری خاموشی
 میں ڈوب گیا۔
 کہنے کو اب رہا بھی کیا تھا۔ امجد کے سر پر شادی کا
 بھوت سوار تھا چنانچہ ایک ہفتے کے اندر امجد مشہودہ کو دلہن
 بنا کر گھر لے آیا۔ صرف جنت تھی جس نے سہاگ سچ
 اپنے ہاتھوں سے سنا لی تھی۔ یاد دادا جان جنہوں نے مکمل
 جرات سے اپنے آنسوؤں کو روک کر چھوٹی دلہن اور امجد
 کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوشگوار زندگی گزارنے کی دعائیں
 دی تھیں۔ پھر ایک طرف سے امجد نے اور دوسری طرف
 سے خود جنت نے مسکراتے ہوئے دلہن کو بازوؤں سے
 تھام کر جملہ عروسی میں پہنچایا تھا۔ دودھ اور مٹھائی کا
 انتظام جنت پہلے ہی کر آئی تھی۔ امجد نے اطمینان سے
 دروازہ بند کیا اور مسکراتا ہوا مشہودہ کے قریب آ کر بیٹھ
 گیا۔
 ”امجد یہ تمہارا گھر ہے یا قبرستان؟“ نئی نویلی دلہن
 نے اپنی سسرال کو قبرستان سے تشبیہ دے کر پہلا حنفہ
 امجد کو پیش کیا۔
 ”چھوڑو ڈار لنگ یہ سب بیک ورڈ لوگ ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے! تاہم بیک ورڈ اپنے چہروں پر

مسکراہٹ سجا کر دلہن کا استقبال تو کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ
 سب روٹی بسورنی زندہ لاشیں دکھانی دے رہے تھے۔“
 ”مشہودہ ڈار لنگ کیا ایسی باتیں اس خوشیوں بھری
 رات میں کرنی ضروری ہیں؟“
 ”آف کورس! امجد تمہارے گھر والوں کا رویہ۔۔۔۔۔
 نو۔۔۔۔۔ امجد یہ سراسر میری تذلیل ہے۔ انسلٹ ہے۔“
 مشہودہ نے پچھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
 ”کوہ ڈا! امجد دونوں ہاتھوں سے سرتاج کو ہلا۔
 اور غصے کے عالم میں منہ پھیر کر لپٹ گیا۔ پھر بھلا مشہودہ
 کیوں پیچھے رہتی وہ فینک ڈائریکٹر ہونے کے دھم میں
 اپنے ماتحت شوہر کے آگے جھکنے پر تیار نہیں تھی۔ چنانچہ وہ
 تکیے لے کر صوفے پر دروازہ ہو گئی تھی۔
 فجر کی اذان سننے ہی جنت بیدار ہو گئی۔ اُس نے
 بستر چھوڑ کر وضو کیا اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن شریف
 کی تلاوت کرنے لگی۔ جنت کے پرزور چہرے پر اس
 وقت بھی گلے کا کوئی نشانہ نہ تھا۔ اپنے پیارے شوہر اور اہل
 خانہ کی خوشیوں کے لیے اُس کے ہاتھ خدا کے بزرگ
 برتری کا بارگاہ میں اٹھ گئے۔
 ”اے اللہ۔۔۔۔۔ یہ عاجز بندہ تیرے صبر و رضا
 کی دولت سے نوازا ہے۔ تیری حیل قدر بارگاہ میں اپنے
 ہاتھ پھیلائے اپنے پیاروں کی خوشیاں لوٹانے کی التجا
 کر رہی ہے۔ میں تو تیری رضا میں خوش ہوں۔ مجھ
 ناتواں کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر تجھ سے
 مانگوں۔ میری عادت اگر جنت کی طلب کے لیے ہے تو
 جنت کو مجھ سے ہزاروں میل دور کر دینا۔ اور اگر دور رخ
 کے خوف ہے تو پھر مجھے دور رخ میں ڈال دینا۔ اے
 غفور رحیم تیرے غضب پر تیری رحمت چھائی ہوئی ہے۔
 میں تجھے تیری رحمت کا واسطہ دیتی ہوں کہ مشہودہ کو اولاد
 کی نعمت سے نواز دے۔ تو تو جانتا ہے تیرے اور
 پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھے اپنے شوہر دادا دادی
 تایا تانی اور ابو امی سے کتنی محبت ہے اور یہ سب بھی مجھے
 دیکھ کر ہی جی رہے ہیں۔ پروردگار میرے سرتاج کو بیٹے
 کی دولت عطا کر دے تاکہ مجھے وجود کی آمد سے میرے
 پیادوں کے لبوں کی مسکرائیں واپس لوٹ آئیں جو مجھے
 زخم زخم دیکھ کر نہ جانے کن اندھیروں میں کھو گئی ہیں۔“

وال کلاک نے صبح کے سات بجتے کا اعلان کیا۔
 جنت گھبرا کر کھڑی اُس نے کچن میں جا کر چائے کا پانی
 چولہے پر رکھ دیا۔ جنت کو اپنے شوہر کے معمولات کا حکم
 تھا۔ امجد کو بینڈی پینے کی عادت تھی۔
 جنت نے چائے تیار کر کے جلدی جلدی دو کپوں
 میں انڈلی اور ٹرے اٹھا کر امجد کے کمرے کے
 دروازے پر جو پہلے جنت اور امجد کا مشترکہ کمرہ تھا پہنچ
 گئی۔ جنت نے دروازے کو کونک کیا۔ جواب نہ دارا اُس
 نے دوبارہ ٹوک کر تے ہوئے دروازے کو ہلکا سا دھکا
 دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا ایک اشارے میں کھل
 گیا۔
 ”اسلام علیکم!“ جنت نے دونوں میاں بیوی کو سلام
 کیا۔ وہ بیدار ہو گئے تھے اور امجد انگڑائیاں لے رہا تھا۔
 ”کیا تم اتنی جی جاہل ہو کر گڈ مارنگ نہیں کہہ
 سکتیں؟“ مشہودہ نے نخوت بھرے لہجے میں جنت کو
 مخاطب کیا۔
 ”میں نے تو رجعت و مسابیحی بھی ہے آپ دونوں
 پر۔“ جنت نے برائے بغیر مسکرا کر مشہودہ کو جواب دیا۔
 ”چینی جب میں رکھو یہ رحمت و مسابیحی۔“ مشہودہ
 نے کہتے ہوئے اب امجد کو مخاطب کیا۔
 ”یہ کیا عجوبے پال رکھا ہے امجد تم نے؟“ جواب میں
 امجد خاموش رہا تھا۔ مشہودہ خاموشی سے چائے پیتی
 رہی۔ پھر کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے اُس
 نے دوبارہ جنت کو مخاطب کیا۔
 ”میں ٹھیک دو بجے ناشتا کرتی ہوں۔“
 ”سرتاج آپ بھی اسی وقت ناشتا کریں گے؟“ جنت
 نے امجد سے پوچھا۔
 ”یہ ناشتا آفس میں کر لیں گے۔“ مشہودہ نے
 جنت کو جواب دیتے ہوئے افسرانہ شان سے امجد کو
 گھورا۔
 ”امجد میں آج آرام کروں گی۔ اشو اور آفس
 جانے کی تیاری کرو۔“ دلہن نے اپنے ماتحت شوہر کو حکم دیا
 اور امجد کی معمول کی مانند اٹھ کر آفس جانے کی تیاری
 میں مصروف ہو گیا۔
 ”اب تم بھی یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ آخر کب

تک کھڑی اپنے شوہر کی پوجا کر دی۔“ مشہودہ نے بلند آواز میں جنت کو حکم سنایا۔ اور جنت برتن سمیت کر خاموشی سے باہر نکلی آئی تھی۔

دروازہ کھلا ہونے کی بنا پر ساری باتیں نیچے صاف سنی جا رہی تھیں۔ ہال میں بیٹھے ہوئے افراد خانہ اب جنت کی برادری اور اپنے آشیانے کے جتنے بکھرے دیکھنے کے سوا کچھ بھی کیا کیسے تھے۔

ہال آخر جنت کی مانی ہوئی دعا میں رب العزت کی بارگاہ میں منجول ہوئیں اور ایک گول منول سے نئے وجود نے اس گھر میں جنم لیا۔ آشیانے کے جتنے کچھ عرصے کے لیے نفرتوں کی تیز دھوپ اور سرد گرم جلوں کے تند تیز جھکڑوں سے منتشر ہونے سے رک گئے اور گھر میں ایک مرتبہ پھر سے اندھیروں میں کھنٹی ہوئی مسکراہٹیں لوٹ آئیں۔ احمد کے نام کے مطابق دادا اور دادی نے بچے کا نام احمد جو بڑ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

گھر کے پرسکون ماحول کی جھیل میں نفرتوں کا جو پتھر مشہودہ نے چلائی ہے پھینکا تھا۔ اس سے بننے والے دائروں نے رفتہ رفتہ پھیل کر اپنا جم اتنا بڑھالیا کہ دو سال کے عرصے میں کیوں کا اپنی ہی جنت کے نیچے ساٹھ لینا بھی دیر ہو گیا۔

چنانچہ اس گھٹن زدہ ماحول سے دل برداشتہ ہو کر سب نے ہمیں دور دور جانے کا فیصلہ کر کے رخت سفر باندھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھر میں اب صرف احمد جنت مشہودہ اور احمد میاں رہ گئے تھے۔ مشہودہ کے تو مقدر ہی کھل گئے اُس کے ہر دن تیر اور ہر رات شب برأت ہوئی تھی۔ مشہودہ کا اصل ٹارگٹ جنت تھی جسے وہ اپنے شوہر سے چھین کر دلانا چاہتی تھی۔

اب گھر میں دروازہ مشہودہ اور احمد کے مشترکہ دوستوں کی آمد و رفت رہنے لگی۔ ہر شب ہی بلا لگا اپنے عروں پر ہونے لگا۔ یہ شوخ راہی بھی بھاری اتنا زیادہ بڑھ جاتا تھا کہ جنت کو نواز پرستی مشکل ہو جاتی تھی۔ مگر آج تو انتہا ہوئی تھی۔ ہال میں بننا ہونے والے شور سے گھبرا کر احمد میاں نے رونا شروع کر دیا۔ مگر نہ تو ماں کو ان کے رونے کی پردہائی اور نہ باپ کو۔ نتیجتاً آج نئے غصے میں

”اور جاتے جاتے اپنے کندھے سے لگے اس ناکارہ لوتھرے کو بھی لے جانا جو زندگی کو انجوائے کرنے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔“ دروازے میں کھڑی مشہودہ نے اپنی کونک سے جنم لینے والے معصوم بچے کو لوتھا کہہ کر جنت میں ساعت سن کر دی تھی۔ اتنا کہنے کے بعد مشہودہ تیزی سے نیچے اترتی اور اپنے ذرا میوہ جلدی جلدی کچھ ہدایات دینے کے بعد واپس دوستوں کی گھٹل میں آ گئی تھی۔

”سرتاج آپ کی اجازت ہے احمد میاں کو میں لے جاؤں؟“

”اُس کی ماں کی اجازت کی روشنی میں میری اجازت ضروری نہیں۔ البتہ اپنے لیے تم میرا حکم ہی چلی جاؤ۔“ احمد بھی کہہ کر دوستوں میں بچہ کر کے کھلے میں شریک ہو گیا۔ دروازے کی آڑ میں چھپی ہوئی نوکرانی زینت تیزی سے نکل کر جنت کے سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”بڑی بہو۔ آپ اس سچی سی جان کو لے کر کہاں جا سکیں گی؟“

”گھراؤمت زینت! شوہر کے حکم پر گھر سے نکل رہی ہوں۔ میرے لیے میرا اللہ ہی کافی ہے۔ اور وہی مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچائے گا۔“

”ماما۔“ احمد میاں نے جنت کے کندھے سے اپنا سر اٹھایا۔

”ہی ماما کی جان۔“ جنت نے احمد کی پیشانی چوم کر پوچھا۔

”ماما۔ ابو مالا (ابو نے مارا)۔“ احمد نے اپنا منھا سا ہاتھ گال پر کرتے ہوئے کہا۔

”بہنا ابو مالا۔۔۔۔۔ ماما نے پیار کیا۔“ کہتے ہوئے جنت نے احمد کو اپنی آغوش میں بیچ لیا۔

”زینت بیگ میں میرے اور احمد کے کپڑے اور چلیں گھر کو۔“

”مجھے تو بتاؤ میری کہاں جا سکیں گی؟“

”میری منزل نامعلوم ہے زینت۔ جس کی غفلتوں کے نہارے نکل رہی ہوں وہی میری دیکھ رہی تھی کہ لگے۔“ زینت نے بیگ تیار کر کے جنت کو دے دیا تھا۔

”اچھا زینت، جب میرے پیارے آجائیں تو اُن سب سے میرا سلام عرض کر دینا۔“ جنت نے حسرت بھری نظروں سے پورے گھر کو دیکھا۔ اپنے اس کمرے کو دیکھا جہاں وہ سچی دہلیں جتنے بچے پریشانی تھی۔

”لکنا غیب اتفاق ہے زینت، پہلے کمرے سے بے دخل ہوئی اور آج اس گھر سے بے گھر کر دی گئی۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور احمد کو کندھے سے لگائے خاموشی سے باہر آ گئی۔

”آئیے بڑی بی بی جی، آپ جہاں جانا چاہیں میں چھوڑ آتا ہوں۔“ مشہودہ کے ذرا میوہ زماں بو شکاری سے اپنے چہرے پر ہمدردی کے آثار پیدا کرتے ہوئے جنت کو مخاطب کیا۔

”مجھے یہاں سے دور کی چوراہ پر چھوڑ دینا پھر میں کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔ جنت نے کار میں بیٹھتے آدھے گھنٹہ تک تیزی سے سیاہ مزک پر دوڑتی رہی۔ کئی چوراہ آئے اور نکلے گئے مگر کار کے بغیر برابر آگے بڑھتی رہی جنت آنکھیں بند کیے اپنی پریشان سوچوں میں گم ہوتی رہی تھی۔

ایک ایک کار کی رفتار کم ہوئی اور پھر ڈرک گئی۔ جنت نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور ہول گئی۔ وہاں نہ کوئی چوراہا تھا اور نہ کسی قسم کی چہل پہل۔ ہر سو دیرانی اور بھیجا تک سناٹے کا راج تھا۔

”اترو بی بی۔“ ذرا میوہ بدلے ہوئے تیوروں سے بولا۔

جنت نے ایک نظر ذرا میوہ کو دیکھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ جنت نے احمد کو مزک کے کنارے کھڑا کرنا چاہا مگر احمد ہلرا کمرزک پر گر پڑا اس اثناء میں ذرا میوہ نے جنت کا باجگ اس کی طرف پھینکا اور گاڑی کا رخ تبدیل کر کے واپس گھر کی سمت روانہ ہو گیا تھا۔

”کیا ہو گیا بیٹا؟“ جنت نے احمد میاں کو زمین سے اٹھاتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

”ماما۔ ابو مالا۔۔۔۔۔ ابو مالا۔۔۔۔۔“ احمد نے روتے ہوئے جواب دیا۔

جنت بھجی گئی کہ اجہ کا تھڑا اجہ کے کسی ایسے حصے پر
ہوا تھا۔ جس کی تکلیف ابھی تک نہ اچھوڑ سکتا ہو رہی
تھی۔ وہ اجہ کو گود میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیگ
کندھے سے لٹکا یا اور پلٹ کر اسی سمت روانہ ہوئی جہاں
ڈرائیور گاڑی لے کر گیا تھا۔ دریں اثناء اجہ نے سر
اٹھایا۔

”ماما..... بے بو“ اجہ نے دودھ مانگا اور جنت
ترپ کر رہ گئی۔ وہ اپنی پریشانی میں بھول ہی گئی تھی کہ
زینت سے فیڈر میں دودھ بھرا لیٹا۔ جنت نے آسمان
کی طرف نگاہ اٹھائی اور خدا سے التجائی۔
”میرے مالک میری منزل اور نئے بچے کی بھوک
تیری رحمت کی منتظر ہے۔“

اس کے ساتھ ہی دودھ کی کار کی ہیڈ لائٹس سے
پھوٹنے والی تیز روشنی جنت کی پشت پر پڑنے لگی۔ کار تیز
رفتاری سے چلتی ہوئی آئی اور زن کی آواز کے ساتھ
جنت کے قریب سے گزری۔ جنت حسرت سے کار کو
جاتے دیکھتی رہی۔

کار دودھ والی سوگز دور نکل چکی تھی۔ لٹکا لٹکا
عقبی سرخ روشنی میں مزید تیزی پیدا ہوئی۔ کار کے ناز
چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رکنے کے بعد دوبارہ
جنت کی طرف واپس آنے لگی۔

”اے اللہ تیرے بھروسے پر ٹکی ہوں۔ میری
عزت ناموس کی حفاظت فرما۔“ کار تیزی سے ریڈرس
ہوئی ہوئی جنت کے سامنے پہنچ کر رُک گئی تھی۔

”کون ہیں آپ اور کہاں جا رہی ہیں؟“ کار کی
کھڑکی میں سے ایک عورت نے سر باہر نکال کر جنت کا
بغور جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔ جنت کو یہ دیکھ کر
اطمینان ہوا تھا کہ کار میں عورت آئی ہی تھی۔

”بیگ صاحب نام میرا جنت النساء ہے۔ فی الحال
اپنی منزل سے لاعلم ہوں۔“

”مگر آپ اس ہولناک ویرانے میں ایک بچے کو
لیے کہاں سے آ رہی ہیں؟“

”کیا کہہ سکتی ہوں۔ شوہر کا حکم تھا اور ان کے حکم کی
بجائے ادنیٰ جھجھپٹ نہ تھی۔ مجھے یہاں ان کی دوسری بیگم کا
ڈرائیور بدلتی چھوڑ گیا ہے۔“

”ویری سیڈ آئیے میں آپ کو شہر چھوڑ دوں گی۔“
عورت نے جنت کو انموس سے دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔
”مگر بیگم صاحبہ!“ جنت کچھ کہنا چاہتا تھا۔

”انکار مت کیجئے شہر یہاں سے میں کوئی میٹر دور ہے
آپ صبح تک بھی پہنچ پائیں گی۔“

جنت کے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ
وہ دوسری طرف سے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ سیٹ پر
بیٹھ گئی۔ تب کار دوبارہ اپنی منزل کی سمت رواں ہو گئی۔
”بچہ بھوکا ہوگا۔ یہ لفافہ لیں، اس میں چکن پیٹش،
کیلک بیس، اور چیس موجود ہیں بچے کو کھلائیں اور خود بھی
شروع ہو جائیں۔“ عورت نے لفافہ ڈیش بورڈ سے اٹھا
کر جنت کو دے دیا۔

”شکر ہے بیگم صاحبہ۔“ جنت نے لفافے میں سے
ایک ملائم کیلک بیس نکالا اور تھوڑا سا کھڑا کر ڈکرا اجہ کے
منہ میں رکھا۔ اجہ نے کیلک بیس کھانے کی کوشش کی
تاہم منہ میں تکلیف کے باعث کھانے سے کرا اور رونے
لگا۔

”نہیں ماما نہیں، ابو مالا۔“ اور بچے کی تکلیف پر
جنت کا دل خون ہو کر رہ گیا۔

”شاید بچے کے منہ میں تکلیف ہے، فلاسک میں
دودھ بھی ہے وہی پلا دیں۔“ اور اجہ نے جیسے تیسے دودھ
پلا دیا تھا۔

”بچے کو یہ تکلیف کب اور کسے ہوئی تھی؟“ عورت
نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

”ابھی ڈھائی تین گھنٹے قبل میرے شوہر نے غصے
میں آکر بہت زوردار چھڑ مارا تھا۔ اور یہ میز سے نیچے
فرش پر جا گرے تھے۔“ جنت نے تفصیل بتائی۔

”کیا..... اور آپ اب تیار رہی ہیں؟“ عورت نے
گاڑی بھرنے سے سرک سے اتار کر ایک طرف ڈکی اور
پینچل سیٹ پر رکھا ہوا بیگ اٹھا کر اس میں سے
اسٹینچو اسکوپ نکال کر اجہ کو چیک کرنے لگی۔ عورت
نے اجہ کے منہ کی جھکی سے سست والا ہاتھ اٹھا کر ہوا میں
چھوڑ دیا۔ اجہ کا ہاتھ ہوا میں رُکے بغیر تیزی سے واپس
گر گیا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ!“ عورت کے منہ سے تشویش کے

عالم میں نکلا۔ اُس نے بھرتی سے بیگ میں ہاتھ ڈال کر
سرخ کھلی پھرد کی شیشیوں میں سے ایک شیشی منتخب کی
اور سرخ جین دوا بھری اور اجہ کے جسم میں منتقل کر دی۔
اُس کے ساتھ ہی عورت نے دو گولیاں پیس کر دودھ کے
براہِ اجہ کر کھلا دیں۔ جنت اجہ کو گود میں لٹائے ہوئے
ساری کارروائی خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔

”کیا بچے کو کوئی خطرہ لاحق تھا؟“ جنت نے عورت
سے پوچھ لیا۔

”ہاں جنت! بچے کا یہ حصہ آہستہ آہستہ پیرالائز
ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔“

”شکر ہے میرے پاس ایمر جنسی میں استعمال
ہونے والی میڈیٹین ہمیشہ موجود رہی ہیں انشاء اللہ بچہ
بہت جلد خشک ہو جائے گا۔“

”تو گو آپ ڈاکٹر ہیں۔“ جنت نے تشکر بھری
نظروں سے عورت کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں جنت۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ آج ایل ایمر جی
جاشورویس ہونے والے یسینار میں شرکت کرنے لگی
تھی۔ میں یہ ایمر جنسی بیگ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔
نہ جانے کب اس کی ضرورت پیش آجائے۔“

”جیسے آج میرے بچے کو ضرورت پڑ گئی۔ البتہ
میں حیران ہوں کہ میرے صرف ایک مرتبہ بتلانے پر ہی
آپ کو میرا نام یاد ہو گیا۔“ جنت نے مسکراتے ہوئے
سوال کیا۔

”یہ نام تو اتنا عظیم نام ہے۔ جسے پاناہر مسلمان کی
دلی آرزو ہوتی ہے۔ پھر مجھے یہ نام کیوں نہ یاد آگئے۔
شوہر کی اتنی ہمارے دار صرف جنت ہی ہو سکتی ہے۔“ ڈاکٹر
صاحبہ نے جنت کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے
جواب دیا۔

”شکر ہے۔“ جنت نے ممنون لہجے میں شکر ادا کیا۔
”ابھی بہت راستہ باقی ہے ایسا کرتے ہیں پہلے میں
اپنے متعلق آپ کو بتا دوں پھر آپ اپنی چٹا تفصیل سے
مجھے بتائیں گا نا؟“

”بالکل سناؤں گی۔“ جنت انکار نہیں کر سکتی تھی۔
ڈاکٹر صاحبہ نے اپنا تعارف کروانا شروع کیا۔

”میرا نام زینبا جہانگیر ہے۔ مگر میرے شوہر جو کہ

وکیل ہیں مجھے پیار سے زیب کہتے ہیں میں بچے کے لحاظ
سے ایک لہری ڈاکٹر ہوں۔ میرے شوہر جہانگیر پانچ
ناپ کلاس کینیوں کے اکوڑے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ ہر
کینی پچاس ہزار روپے ماہانہ انہیں ادا کرتی ہے۔ اور
بھئی اب رہی شکل و صورت تو میں نہیں بتلاؤں گی (بشتے
ہوئے) اگر جنت آپ نے انڈین فلیس دیکھی ہیں تو خود
ہی پہچان لیں گی۔ اور اب آپ کی باری ہے۔“

”ویسے آج کی رات آپ کی میری مہمان رہیں
گی۔“ زیب نے اتنا کہہ کر کار میں لگا ہوا بیگ آن کر دیا
اور جنت کو اشارہ کیا۔

”زیب بانی، پہلے تو میں شکر گزار ہوں اپنے
پروردگار کی، سڑک پر چلتے ہوئے بچے نے دودھ مانگا مگر
مجھے بے سہارا کے پاس اس کی بھوک مٹانے کا کوئی وسیلہ
نہیں تھا۔ میں نے اپنے رب سے التجا کی۔ اور اس کی
رحمت کے انداز کو دیکھیں اس نے فوراً ہی آپ کو وسیلہ
بنا کر بھیج دیا۔ بچے کی بھوک مٹی، اس کو برکت طبی امداد
بھی ملی اور ہم مجبور ہوا بیٹے کو آج کی رات سر جہانگیر کا
ٹھکانہ بھی اس پاک ذات نے مہیا کر دیا۔ میری ٹوٹی
بھونی عادت اور اس کے اتنے احسان پھر جنت نے
اپنی پوری تفصیل ٹیپ میں لکھ کر دے دی۔“

چنانچہ جیسی ہی جنت کی آپ بیتی اختتام کو پہنچی گاڑی
پوش علاقے میں داخل ہو کر ایک خوبصورت کوئی میں پہنچ
کر رُک گئی۔

”آہا..... آپ آگئیں بیگم۔ بہت دیر لگادی۔“
وکیل صاحب پر نظر پڑتے ہی جنت کو حیرت کا شہید رہ چکا
لگا۔ امریش پوری جنت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ
مسکراتے لگی تھی۔

”ہاں ڈیئر دراصل راستے میں ایک ایمر جنسی ہو گئی
تھی۔“ زیب نے جنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
جواب دیا۔

”اوہ.....“ کہتے ہوئے وکیل صاحب نے کار کے
اندر بیٹھی جنت پر نگاہ ڈالی۔

”بھان! اللہ! ابھی بیگم اس جھکی ہوئی حور کو کہاں سے
بکڑ لائیں۔“ اور جنت وکیل صاحب کی آواز سن کر

مسکرائے لگی۔ صورت شکل قد و قامت اور اب آواز بھی بالکل وہی۔

”یہ کیسٹ لیں۔ اس میں ان کی پوری تفصیل موجود ہے، اور اب جلدی سے اندر چلیں بہت زور کی بیوک لگ رہی ہے۔“

”اوہ..... اچھا اچھا..... آئے بیٹی آپ بھی آ جائیں۔“ وکیل صاحب نے جس خلوص اور محبت سے جنت کو بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اسے محسوس کر کے جنت کا دل بھر آیا وہ خاموشی سے گاڑی سے باہر نکلی سوئے ہوئے احمد کو اٹھا کر کندھے سے لگا اور بیگ لے کر وکیل صاحب کے پیچھے چلتی ہوئی کوٹھی کے ہال میں آ گئی۔

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ پھر ڈاکٹر زیب آلے سے سوئے ہوئے احمد کو چیک کرنے لگی۔ کچھ دیر کے معائنے کے بعد زیب نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے جنت کو دیکھا۔

”خدا کا شکر ہے بچہ اب خطرے سے باہر نکل چکا ہے۔“ زیب نے کہتے کہتے ہوئے جنت کو اشارہ کیا کہ وہ احمد کو گود میں اٹھالے اور خود اس کا بیگ لیے کوٹھی سے نکل کر سوڈن کو اڑ پر آ کر روک گئی۔ زیب نے دروازہ کھول کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ روشنی ہوتے ہی جنت نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ وہیل ڈیکورڈ تھا۔ زیب نے دیوار میں بیسٹ اسے ہی آن کر کے جنت کو مخاطب کیا۔

”جنت یہاں اطمینان سے سو کر رات گزاروں۔ انشاء اللہ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ وکیل صاحب کیسٹ پر تمہاری چٹان ہی لیں گے پھر جیسا تم چاہو گی اس کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔“ پھر زیب جنت کو شب بخیر کہتی ہوئی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن جنت نے احمد میاں کو صاف کپڑے پہنا دیے پھر خود بھی تیار ہو کر احمد کو گود میں لیے کوٹھی میں چھٹی گئی۔ ڈانٹنے کیل پر دونوں میاں بیوی جنت کا انتظار کر رہے تھے۔

”آؤ بیٹی آؤ۔“ وکیل صاحب نے جنت کو دیکھتے ہی کہا۔

”اسلام علیکم!“ جنت نے اب سے دونوں کو سلام کیا۔

”علیکم السلام، جیتی رہو۔ آؤ ادھر میرے قریب بیٹھو۔“ دونوں میاں بیوی نے سلام کا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ تاہم اپنے قریب بیٹھنے کے لیے وکیل صاحب نے کہا تھا۔ جنت وکیل صاحب کے قریب گری پر بیٹھ گئی۔ پھر ناشتے کے بعد چائے کے دوران وکیل صاحب نے جنت کو مخاطب کیا۔

”ہاں تو بیٹی اب بتلائیں آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”اگر یہاں کوئی ایسا ادارہ موجود ہو جہاں بے سہارا.....!“

”نہ..... نہ..... اپنے آپ کو بے سہارا مت سمجھو۔ آپ کا سہارا تو وہ عظیم ذات ہے جس کا نام لے کر آپ گھر سے نکلی تھیں۔“ وکیل صاحب نے تیزی سے بات کاٹ کر کہا۔

”پھر فرمائیں، میں کہاں جاؤں؟“

”بیٹی میں آپ کے بیک کرناؤ سنے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہوں۔ اب آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خدا سے ہر نماز میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتا تھا۔ بیٹی آپ کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری بخشش کے سماں پیدا ہو گئے ہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ میں ایک گھبراہٹ، اور آپ کی بخشش کا سامان؟“

”ہاں بیٹی، آپ ماشاء اللہ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کا کافی علم رکھتی ہیں میں دراصل اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ جس میں پیارے نبی ﷺ نے فرمایا تھا۔ ”جس شخص کو خدا نے دو نبیاں عطا کیں اور اس شخص نے ان کی ہجرت پرورش کی، تو ملکی دولت سے دونوں کو آراستہ کر کے اپنے گھر کا کر دیا جیسی ان کی شادیاں کر دیں۔“ وہ شخص میرے ساتھ اس طرح جنت میں جائے گا۔ اتنا فرما کر آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کو باہم ملا کر سمیٹ کر ارام کو دکھائیں۔

جنت کو اس حدیث مبارکہ کا علم تھا لہذا اس نے ان دونوں بچیوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظر پڑیں دوڑائیں تھیں۔

”یہاں اسکول چاچکی ہیں۔ دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔“ زیب نے جنت کی متلاشی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر جواب دیا۔

”بیٹی آپ کو اگر گیم گیمہاروں کی مدد کرنی منظور ہو تو ہم آپ کو اس خدمت کے عوض پندرہ ہزار روپے ماہانہ جیب خرچ کھانا، کپڑا اور ہر وہ شے جو آپ پسند کریں گی دیں گے۔“

”جیب خرچ.....“ جنت نے چونک کر دہرایا تھا۔

”ہاں بیٹی، تنخواہ ملازموں کو دی جاتی ہے۔ جبکہ میرے بیٹی کہنے سے آپ اس گھر کی فردین بن چکی ہیں۔“

”یہ سن کر جنت کا دل بھر آیا وہ آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے یہ خدمت منظور ہے۔“

”جیتی رہو جنت بیٹی، دیکھ لیں اللہ سبحانہ تعالیٰ کے اپنے جانے والوں پر احسانات اور انعامات اُس نے آپ کو بخشے ہیں بچا کر اپنی منزل پر پہنچائی دیا۔“

”ہاں بھائی جان آپ درست فرما رہے ہیں۔ ارے ہاں بھائی جان آپ کی کوئی بالکل مسجد کی دیوار سے لگ کر بنی ہے۔ میں نے آج صبح نماز سے فارغ ہو کر ہر طرف کا جائزہ لیتے ہوئے یہ چیز نوٹ کی ہے۔“

”جنت بیٹی یہ پلاٹ میں نے منگئے داسوں خریدا تھا۔ اور اس گھر کو بنانے وقت میں نے خاص طور پر یہ خیال رکھا تھا کہ میرے گھر کی دیوار مسجد کی دیوار سے ملے گی۔ پانچ وقت اذان اور درود و سلام کی پُرسوز صدائیں سنائی دیتی رہیں اور مسجد کے پُر نور دیا کیڑہ سائے میرے گھر کو اپنی آغوش میں لیے رہیں۔ بچا غالب نے کیا خوب فرمایا تھا۔

”مسجد کے زیر سایہ ایک گھر بنایا ہے یہ بندہ کینہہ ہمسایہ خدا ہے۔“

”بیٹی انسان کو دنیا کی کمائی کے ساتھ ہی آخرت کی فکر بھی کرنی چاہیے۔“

احمد میاں اب چار برس کے ہو گئے تھے اور اپنی منہ بولی بیٹیوں کے ساتھ اسکول جانے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

ہارون اور رشید میاں کو پندرہ دن بعد لاہور سے

واپس آنا پڑا تھا۔ اُن کو اپنے دفتر سے مزید چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ البتہ اب حضوری اور امی مزید ایک ماہ کے لیے لاہور رک گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے عجب ہو کر عالم گھر پر مسلط پایا تھا۔

”زینت یہ خاموشی کیوں چھائی ہوئی ہے۔ جنت بیٹی اور احمد میاں کہاں ہیں؟“ ہارون میاں نے زینت سے سوال کیا۔

”نکال دیا، انہیں احمد میاں نے اپنی بیگم کے کہنے پر احمد میاں سمیت گھر سے نکال دیا۔“ زینت نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”احمد.....“ ہارون میاں غصے سے کانپتے ہوئے دھاڑے۔ اور احمد مشہودہ کے ساتھ فوراً اُن کے سامنے حاضر ہو گیا۔

”جنت کہاں ہے احمد میں پوچھ رہا ہوں جنت کہاں ہے؟“ وہ احمد کو مارنے کی غرض سے آگے بڑھے مگر رشید میاں تیزی سے درمیان میں آ گئے۔

”اس ناگن کے کہنے پر تم نے جنت بیٹی کو گھر سے نکالا ہے نا۔ اب تم بھی یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ اور جردار جنت کے بغیر اس گھر میں داخل ہونے کی قلعی نہ کر بیٹھنا، ورنہ.....!“

”بھائی جان ذرا سوچیے احمد میاں کہاں جائیں گے۔“ رشید میاں نے بڑے بھائی کو سمجھایا۔

”ہمت جاؤ رشید..... اس ناکارے نے اپنے خاندان کی ایک نامی پر جو کمال ملی ہے اسے سات سمندروں کا بیانی بھی نہیں دھسکتا۔ تم کہتے ہو یہ کہاں جائے گا۔ شہر الی آتا ہے کہ اپنی سرسراں میں جا کر رہے گا مگر میری جنت بیٹی وہ معصوم تو اس کی بیٹی نہیں بن جانے کہاں اور کن حوالوں میں ٹھیک رہی ہوگی۔“ ہارون میاں غم سے منہ حال ہو کر کرسی پر گر پڑے۔

مشہودہ نے احمد کا بازو پکڑا اور اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ چالاک عورت جانتی تھی۔ اگر اُس نے ہارون کو جواب دینے کی کوشش کی تو وہ اسے دھک کر رکھ دیں گے۔

شام تک دونوں میاں بیوی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

دو تہذیبوں کا اصل چہرہ کل کراچہ کے سامنے آچکا تھا۔
چھ ماہ تک تو پاس موجود پیسوں سے امجد جیسے تیسے
گزارہ گزار ہاتھا۔ پھر ہاتھ کی گامانی میں موجود قیمتی گھڑی
بیچ اور اس کے بعد بیچیں بھی بلک گیا تھا۔ اس دورِ ان
امجد برابر نوکری کی تلاش میں بھی لگا تا کہ کوشش جاری
رکھے ہوئے تھا۔ مگر اس کے ناکامی کے اور کچھ ہاتھ نہیں
آ رہا تھا۔

یہ حالات صریحاً اس چیز کی طرف اشارہ کر رہے
تھے کہ قدرتِ امجد سے انتقام لینے پر اتر آئی تھی۔ امجد
نے جوڑا اپنی مصوم بیوی جنت کو گھر سے نکال کر اسے
دلی کی اب دو خداؤں اذیت سے گزر رہا تھا۔

امجد رات سے بھوکا تھا اب تو بیچنے کے لیے اس
کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ بھوک تھی کہ برابر پیٹ میں
کچھ لگا رہتی تھی۔ امجد جیسے دوسرے چلتا ہوا ایک
بہت بڑے ہوئے ہوں کے سامنے پہنچ کر کڑک گیا۔

”اتنا بڑا ہوئے ہے شاید ایک وقت کا کھانا مل ہی
جائے۔“ امجد نے خود کو دھکی دیا۔ وہ ہشاش بشاش مردوں
اور عورتوں کو بھول میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ گو گھبرت
گوارہ نہیں کر رہی تھی۔ مگر غیرت سے پیٹ کی آگ تو
نہیں بجھ سکتی تھی۔

بال آخر غیرت اور بھوک کی جنگ میں فتح بھوک ہی
کو حاصل ہوئی اور امجد کے لڑکھڑاتے قدم بھول شہر کے
آفس کی سمت اٹھنے لگے تھے۔

☆☆☆

ایک سال گزر گیا۔ بچوں کے امتحانات ختم ہو چکے
تھے۔ رزلٹ کارڈ وکیل صاحب کے ہاتھوں میں تھے۔
وہ خوشی سے سرشار تھیں بچوں کو مبارکباد دے رہے تھے
جنہوں نے اسے دن گریڈ حاصل کیے تھے۔
”شباب میرے بچوں کی طرح دل لگا کر تعلیم حاصل
کر رہے ہو۔ اور ابھی بھی ایسا موقع مت آنے دینا کہ
میری طرح مار کھاؤ۔“

”ہیں خالو جانی آپ نے نارنجی کھائی ہے؟“ امجد
میں نے سوال کیا زب اور جنت بھی قریب ہی بیٹھی
تھی۔
”ہاں امجد میاں صرف ایک مرتبہ مار کھائی تھی۔“

وکیل صاحب جواب دے کر نظریں جھکاتے ہوئے
سوچوں میں گم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بولے۔
”اس وقت میں چوچی کلاس میں پڑھتا تھا۔ عمر یہی
کوئی دس گیارہ سال کی رہی ہوگی۔ ایک دن میں اسکول
صرف پانچ منٹ لپٹ پہنچا جس کی سزا کے طور پر استاد
محترم نے میرے گال پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے
فصاحت کی کہ جہانگیر میاں وقت کی قدر کرنا سیکھیں۔“ غیر
جہنی کے بعد میں گھر پہنچا تو غصے کے مارے برا حال تھا۔
میرے ابو اخبار پڑھ رہے تھے اور امی قریب ہی بیٹھی
ہوئی کچڑوں پر پختہ کر رہی تھیں۔

”جہانگیر بیٹے ادھر آئے۔“ ابو نے اخبار ایک
طرف رکھ کر مجھے بلایا اور میں خاموشی سے اُن کے قریب
جا کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے بیٹا میرے کیوں پھولا ہوا ہے؟“
”دیکھئے اب تو آج کلاس ٹیچر نے میرے گال پر تھپڑ
مارا ہے۔“

”ابو، یہ تو انہوں نے بہت برا کیا کہ دوسرا گال
چھوڑ دیا۔“ اتنا کہتے ہی ابو نے بھی ایک کرار تھپڑ
میرے دوسرے گال پر رسید کر دیا۔ تو بچو! میں نے اپنی
امی کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا وہ مجھے بہت
چار کر گئی تھیں اور امی ابو کے ہاتھ سے پٹنے نہیں دیتی تھیں
مگر امی نے اس روز مجھے سخت نظروں سے گھورتے
ہوئے ابو سے کہا۔

”کاش دو تھپڑ میری طرف سے، آج ان کی اتنی
بجائ ہوگی کہ اپنے استاد محترم کی شکایت کھر پر آ کر
کر رہے ہیں۔“
”جہانگیر میاں میں سب کچھ راشت کر سکتا ہوں۔
لیکن جو استاد تعلیم کے پر لگا کر آپ کو آسان کی بلند یوں
پر اُڑا سکتا رہے ہیں۔ اُن کی شکایت میں آئندہ آپ
کے منہ سے نہیں سنوں۔“ ابو نے سختی سے مجھے تنبیہ کی
تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ ابو اسکول میں جا کر ضرور استاد
محترم سے باز پرس کریں گے۔ مگر ابو اور امی کے رویے
نے مجھے سمجھا دیا کہ استاد کی عزت اور تعلیم کی کیا اہمیت
ہوتی ہے۔ اور ہاں میں یہ بھی تلا تا چلوں کہ روزِ جہاد
ہو کر کلہ شریف پڑھنے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا

ہو جاتا ہوں اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھ کر گالوں پر
تھپیلیاں پھیلتا ہوں اور پھر ان تھپیلیوں کو عقیدت و
احترام سے چوم لیتا ہوں۔ بچو! میں آج جس مقام پر کھڑا
ہوں صرف اُن دو تھپڑوں کی بدولت جو استاد محترم اور
میرے والد نے میرے گالوں پر مارے تھے۔ میری
قابلیت کو اعلیٰ عدالتیں بھی تسلیم کرتی ہیں۔ پہلے مجھے ان
تھپڑوں پر غصہ آیا تھا مگر اب دن دنوں محترم ہستیوں
کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔“ اتنا کہہ کر وکیل
صاحب خاموش ہو گئے تھے۔

”ابو پرسوں ہماری کلاس فیلو شہناز کو کلاس مَس نے
اُس کی شیطانی پُرس صرف ڈانٹا تھا۔ اور کل شہناز کی امی اور
بڑی بہن نے کلاس میں آ کر مَس کو اتنا ذلیل کیا کہ وہ
روٹی ہوئی استغنیٰ دے کر چلی گئیں۔“

”ہاں ابھی امریکہ میں قانون ہے اگر ماں باپ بچے
کو ڈانٹیں تو سزا کے حق ٹیچر ہے۔ دراصل ہمارا
معاشرہ ایک ایسی سواری پر سوار ہے جو برف پر پھسلتی
ہوئی اس کھائی کی طرف جارہی ہے جس میں مغربی
تہذیب کا لعن بھرا ہوا ہے۔ اب ہر ہمیں کہ اُن کی تقلید
میں سرے جارہے ہیں۔ آپ کی مَس کو ذلیل کرنا اور اُن
کو نوکری چھوڑ جانے پر مجبور کرنا یہ..... یہ صرف جھوٹی
انار ہے۔ دکھا دے کہ دیکھو تم کتنے پانی میں ہیں اور کیا
کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ استاد کو بھی
نہیں لنگل رہے ہیں۔ بچے کے دل سے استاد کے احترام
اور تعلیم کی اہمیت کو نکال رہے ہیں۔“

”کیا خیال ہے بچو! آپ سب کے پاس ہونے کی
خوشی میں کیوں نہ آج باہر لچ کیا جائے؟“ وکیل صاحب
نے مسکراتے ہوئے بچوں کو مخاطب کیا۔

”ابو زندہ باد..... ابو زندہ باد۔“ تینوں بچوں نے
خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے تالیاں بجائیں تھیں۔
چنانچہ وکیل صاحب کے اشارے پر سب اہل خانہ
تیار یوں میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

”بھئی زیب آج کس ہوئے میں چلا جائے؟“
وکیل صاحب نے بیٹہ جیٹ پر بیٹھی ہوئی اپنی بیگم سے
دریافت کیا۔

”لے لی دعوت آپ کی جانب سے ہے تو چاہوں
میں گویا ہوئے۔“

”جنت“ ویٹر نے چونکتے ہوئے حیرت سے
دہرایا۔

”صاحب جی یہ جنت ہیں؟“

”ہاں میاں یہ ہماری چھوٹی بہن جنت ہے۔ مگر تم
کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”صاحب جی! میرا نام احمد ہے۔ میری بیماری
ہوئی کا نام بھی جنت ہے جو مجھے دنیا کی دوزخ میں جلتا ہوا
چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی ہیں۔“

”اچھا تو تم ہی ہو وہ سگدل انسان۔“ ویکل صاحب
خشگیں نظروں سے چند لمحے احمد کو گھورتے رہے پھر
بولے۔

”مسٹر احمد جنت خود سے نہیں گئی تھیں انہیں آپ
نے گھر چھوڑ کر ملے جانے کا حکم دیا تھا۔ شوہر پرست
ہوئی گھر سے نہ نکلتی تھی اور کیا کرتی۔“ ویکل صاحب
آپ ان کو وہ تکلیف دہ الفاظ سنا دیتے جن کو دوسری ویکل
ہوتے ہوئے اپنی زبان پر لانا نہیں پسند کرتا۔ کاش اتنا تو
سوچا ہوتا کہ ایک گھر بیٹھ کر جس نے تباہی کے کبھی باہر
کی دنیا نہ دیکھی ہو۔ وہ ایک معصوم جان کو لیے کہاں بیٹھتی
پھرے گی۔

جنت خدا پر توکل کر کے اور آپ کے حکم سے مجبور
ہو کر نکلی تھیں۔ تو وہ مالک کا نکلتا اپنے چاہنے والوں کو
کیسے بے آسرا چھوڑتا۔ یاد رکھیے مسٹر احمد دنیا کے
آسرے ختم ہو جاتے ہیں مگر جو خدا کے آسرے اور اس
کی مدد پر ایمان و یقین رکھتے ہیں وہی لوگ عظیم ہوتے
ہیں۔ جنت میری بیگم کو نہیں اور تم کو نہیں گھر لے آئیں۔
اللہ تعالیٰ نے جنت کو کھینچ نہ دیا اور نہ ان کی عزت پر کوئی
حرف آیا۔ اب جنت ہم میاں ہوئی کی چھوٹی بہن کی
حیثیت سے باعزت زندگی گزار رہی ہیں۔

”اور آپ۔“ مسٹر احمد خدا نے بزرگ و برتر نے
آپ کو خود اسی سزا سے گزارا ہے جو آپ نے اپنی معصوم
اور پاکباز بیوی کے لیے تجویز کی تھی۔ جنت نبی کو وہی
مقام حاصل رہا جو ان کے پیاروں کی موجودگی میں ان کو
حاصل تھا۔

”گھر اب آج خود کو دیکھیں کس عالم میں ہمارے
”جنت“ ویٹر نے چونکتے ہوئے حیرت سے
دہرایا۔

”صاحب جی یہ جنت ہیں؟“

”ہاں میاں یہ ہماری چھوٹی بہن جنت ہے۔ مگر تم
کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”صاحب جی! میرا نام احمد ہے۔ میری بیماری
ہوئی کا نام بھی جنت ہے جو مجھے دنیا کی دوزخ میں جلتا ہوا
چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی ہیں۔“

”لے لی دعوت آپ کی جانب سے ہے تو چاہوں
میں گویا ہوئے۔“

”جنت“ ویٹر نے چونکتے ہوئے حیرت سے
دہرایا۔

”صاحب جی یہ جنت ہیں؟“

”ہاں میاں یہ ہماری چھوٹی بہن جنت ہے۔ مگر تم
کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”صاحب جی! میرا نام احمد ہے۔ میری بیماری
ہوئی کا نام بھی جنت ہے جو مجھے دنیا کی دوزخ میں جلتا ہوا
چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی ہیں۔“

”اچھا تو تم ہی ہو وہ سگدل انسان۔“ ویکل صاحب
خشگیں نظروں سے چند لمحے احمد کو گھورتے رہے پھر
بولے۔

”مسٹر احمد جنت خود سے نہیں گئی تھیں انہیں آپ
نے گھر چھوڑ کر ملے جانے کا حکم دیا تھا۔ شوہر پرست
ہوئی گھر سے نہ نکلتی تھی اور کیا کرتی۔“ ویکل صاحب
آپ ان کو وہ تکلیف دہ الفاظ سنا دیتے جن کو دوسری ویکل
ہوتے ہوئے اپنی زبان پر لانا نہیں پسند کرتا۔ کاش اتنا تو
سوچا ہوتا کہ ایک گھر بیٹھ کر جس نے تباہی کے کبھی باہر
کی دنیا نہ دیکھی ہو۔ وہ ایک معصوم جان کو لیے کہاں بیٹھتی
پھرے گی۔

جنت خدا پر توکل کر کے اور آپ کے حکم سے مجبور
ہو کر نکلی تھیں۔ تو وہ مالک کا نکلتا اپنے چاہنے والوں کو
کیسے بے آسرا چھوڑتا۔ یاد رکھیے مسٹر احمد دنیا کے
آسرے ختم ہو جاتے ہیں مگر جو خدا کے آسرے اور اس
کی مدد پر ایمان و یقین رکھتے ہیں وہی لوگ عظیم ہوتے
ہیں۔ جنت میری بیگم کو نہیں اور تم کو نہیں گھر لے آئیں۔
اللہ تعالیٰ نے جنت کو کھینچ نہ دیا اور نہ ان کی عزت پر کوئی
حرف آیا۔ اب جنت ہم میاں ہوئی کی چھوٹی بہن کی
حیثیت سے باعزت زندگی گزار رہی ہیں۔

”اور آپ۔“ مسٹر احمد خدا نے بزرگ و برتر نے
آپ کو خود اسی سزا سے گزارا ہے جو آپ نے اپنی معصوم
اور پاکباز بیوی کے لیے تجویز کی تھی۔ جنت نبی کو وہی
مقام حاصل رہا جو ان کے پیاروں کی موجودگی میں ان کو
حاصل تھا۔

”گھر اب آج خود کو دیکھیں کس عالم میں ہمارے
”جنت“ ویٹر نے چونکتے ہوئے حیرت سے
دہرایا۔

”صاحب جی یہ جنت ہیں؟“

اپنی بیگم کو مخاطب کیا۔

”زیب جنت بیٹی کو دس ہزار روپے دے دو۔“ وہ
احمد کو خالی ہاتھ اور ایک ہی میلے جوڑے میں دیکھ چکے
تھے۔ پھر وہ جنت سے مخاطب ہوئے تھے۔

”جنت بیٹی آپ لوگ آج آرام کریں۔ اور کل صبح
شہر جا کر احمد جو بھی پسند کریں آپ انہیں دو کپڑے اور
شوہر دلواد بنا چھٹکے۔“

”بہت بہتر بھائی جان۔“ جنت نے ادب سے
جواب دیا تھا۔

اس دوران زیب رقم نکال چکی تھیں۔ اُس نے
مسکراتے ہوئے رقم جنت کے ہاتھ میں تھمائی۔ پھر جنت
کے قریب بیٹھے ہوئے احمد کے گال کو پکڑ کر دو تین ہولے
ہوئے پھینک دیے۔

”گلدک۔“ زیب نے احمد سے کہا۔
”تھکسین۔“ احمد نے جھپٹے ہوئے انداز میں
جواب دیا تھا۔

گاڑی کوئی میں داخل ہوئی اور باوردی ڈرائیور فوراً
ہی گاڑی کے قریب آ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔
”سنو یوسف۔“ ویکل صاحب نے ڈرائیور کو
مخاطب کیا۔

”جی مالک حکم۔“
”کل صبح کار تیار رکھنا۔ کل تیرہ بجے جنت اور ان کے
شوہر کے تابع رہو گے۔“

”جو حکم مالک۔“ ڈرائیور نے ادب سے جواب دیا
تھا۔

☆ ☆ ☆

فجر کی اذان کے شروع ہوتے ہی جنت کے ساتھ
ساتھ احمد میاں بھی گھبرا کر بیدار ہو گئے۔ احمد میاں
ماشاء اللہ اتنا قرآن مجید پڑھ چکے تھے جس سے نماز کے
مطلوبہ فرائض ادا کر سکیں۔ دونوں ماں بیٹے نے جلدی
جلدی وضو کیا اور احمد نماز کے لیے مسجد میں جانے کو تیار
ہو گئے۔

”احمد۔“ اچانک احمد نے آواز دی اور احمد میاں
چونک کر رہی ابو کہتے ہوئے احمد کے قریب آ کھڑے
ہوئے۔

ساتھ کھڑے ہیں۔ کتنی شرم آرہی ہے آپ کو اس حلیے
میں دیکھ کر ہم سب کو اس کہتے ہیں مکافات عمل۔ شکر
کیجیے احمد صاحب آپ کی نیک بیوی نے ہمیشہ آپ کی
بہتری کی دعا میں مانگی ہیں اور آپ خدا کے غضب سے
صرف اتنی ہی سزا کے مستحق ٹھہرے۔ ورنہ ایک ویکل
ہونے کے حیثیت سے خدا کے چاہنے والے بندوں پر
ظلم کرنے والوں کے میں نے بڑے ہیسا کی حشر ہوتے
ہوئے دیکھے ہیں۔“ ویکل صاحب نے حتی الامکان سخت
لفظوں سے بچتے ہوئے سخت غصے کے عالم میں دل کھول
کر احمد کی خبر لی تھی۔ جنت کی موجودگی میں احمد کے لیے
فی الحال اتنا ہی ڈر نہ تھا۔

”صاحب جی مجھے ایسا ہر تصور منظور ہے۔ ایک مرتبہ
صرف ایک مرتبہ مجھے اپنی جنت سے معافی۔“
”میری تربیت میں اللہ کی رضا اور شوہر کی عزت اور
مرتبہ کا احترام شامل ہے۔“ جنت نے نقاب الٹ کر
اپنے شوہر کو مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کتنی عظیم ہیں میری بہن آپ۔ اس پر آ شوب
اور بے حیائی کے دور میں مذہب اسلام کی سیب سے نکلے
ہوئے آپ جیسے گوہر نایاب کو دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی
ہے۔“ ویکل صاحب پچھ دیں کہ جنت کو تعریفی نظروں
سے دیکھتے رہے پھر وہ احمد سے مخاطب ہوئے۔

”جائے اور جا کر شہر کو بلا کر لائیں۔“ کچھ دیر بعد
شیخ بوکھلا ہوا بیٹن میں داخل ہوا تھا۔

”سر کیا میرے ویٹر سے کوئی غلطی ہو گئی؟“
”غلطی ہوئی نہیں بلکہ ہوئی تھی اور یہ حضرت اُس کی
سزا بھی پا چکے ہیں۔“ خیرہ بنانا ضروری نہیں ہے آپ
صرف اتنا کریں ان کا کلیئر کر کے ڈرائیور فارغ
کردیں۔“

”ابھی لیجئے صرف چند منٹ کی اجازت دے
دیں۔“

ٹھیک چند منٹ بعد ویکل صاحب کی فیملی واپس
روانہ ہو چکی تھی۔ البتہ اس فیملی میں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا
تھا اور وہ تھا احمد۔

☆☆☆

”زیب۔“ ویکل صاحب نے براہر میں بیٹھی ہوئی

”کہاں جا رہے ہیں؟“
 ”ابو... مسجد میں نماز پڑھنے۔ اللہ میاں سے باتیں کرنے۔“ امجد میاں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔
 ”بنا آپ اکیلے ہی جا رہے ہیں۔ اپنے گہنگار ابو کو ساتھ میں نہیں لے جائیں گے؟“
 ”جی اب آپ بھی نماز پڑھتے چلیں گے؟“ امجد نے اسجد نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں بیٹا! جس ذات عظیم نے آپ سانحہ فرشتہ اور آپ کی ماما کی صورت میں جسے دنیا ہی میں جنت بخش دی ہو وہ بد نصیب کب تک اپنے پیدا کرنے والے کی نافرمانی کرتا رہے گا۔“ یہ کہہ کر امجد نے بھی اٹھ کر وضو کیا۔ دو رکعت سنت موکدہ گھر میں ادا کی پھر بیٹے نے باپ کی اٹلی پکڑی اور دونوں مسجد کی جانب روانہ ہو گئے۔

”اے میرے اللہ! انہوں نے فلاح کی جانب پہلا قدم رکھا ہے۔ تو ان کے قدموں کو استقامت بھی بخشا۔“ جنت نے مسکراتے ہوئے خدا سے دعا کی۔
 آج جنت بہت خوش تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر لان میں آ گئی۔ لان میں مور اور مورنی کا جوڑا دانہ دیکھتے میں مصروف تھا۔
 ”اے مجھ ناتواں کو خوشیوں کی دولت سے نہال کرنے والے کس زبان سے تیرا شکر کروں۔ ہر ہر مقام پر میری دستگیری فرمائی۔ دلوں کے سجدہ جانے والے وہ آرزوئیں جو ابھی میرے دل میں تھیں اور زبان تک نہیں آئیں تھیں۔ میرے بن کے وہ بھی ٹوٹے پوری کر دیں۔ میرے غفور و الرحیم کتنا مہربان ہے تو۔ جو ہاتھوں کے اٹھنے سے پہلے ہی میری مرادوں کو بر لاتا ہے۔“

تب جنت دوزخو کو نرم و ملائم گھاس پر بیٹھ گئی۔ وہ ساتوں فراتوں پر مکمل عبور رکھتی تھی۔ جنت نے ہاتھ سینے پر باندھے آٹھیں بندیں اور چوٹی فراتوں میں تلاوت شروع کر دی۔

باش میں اٹھائیاں کرتی ہوئی باہر صحر آہستہ آہستہ باد نسیم کے خوشگوار جھونکوں میں تبدیل ہو کر بیٹھ گئی۔ درختوں پر چھپتا ہے پرندوں کا شور مچ گیا۔ لان میں دانہ

ڈنگا چنگے والے مور اور مورنی کے جوڑے نے اچانک گردنیں اٹھا کر جنت کو دیکھا۔ وہ برابر ٹنگی باندھے جنت کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جنت کے قریب پہنچ کر اس کی زانو سے دائیں بائیں لگ کر بیٹھ گئے۔ جنت نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اپنے ہاتھ مور مورنی کی پشت پر رکھ کر دوبارہ تلاوت میں مصروف ہو گئی۔ مصوم پرندوں کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنی گردنیں جھکا کر یوں کام رہاں کو ٹک رہے تھے جیسے وہ اس عظیم کلام کے ایک ایک لفظ کے معنی اور مطلب کو سمجھ رہے ہوں۔

آج کا انسان چاہے اس دے جانے والے درس سے سبق حاصل نہ کرے۔ وہ قرآن کی تلاوت ایک عام انداز میں کر کے گویا اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ لیکن جنت اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عنایت یا پاکر اس کی محبت میں ذوق و تلاوت کر رہی تھی۔ تو پھر اس مقدس کلام کا اثر باہر صحر، درختوں پر چھپتا ہے والے پرندوں اور موروں کے جوڑے پر کیوں نہ ہوتا۔

☆ ☆ ☆
 ایک فتنے بعد دوپہر کے کھانے پر وکیل صاحب نے امجد کو مخاطب کیا۔

”امجد میاں آپ کل تیار ہو کر ٹھیک دس بجے گڈ لک کا سٹیکس اینڈ لیدر گارمنٹ پہنی چلے جانا۔ وہاں شیئر سیلر کی آسامی خالی ہوئی ہے۔ اور کل انٹرویو ہیں، بہت بڑی پتنی ہے اس کے مالک کا نام سر جیندے ہے۔ وہی انٹرویو لیں گے۔ آدمی گوکہ بہت سخت ہیں مگر آپ کچھ کرنا مت اور پوری آزادی سے سوالوں کے جواب دینا۔“

”بہت بھتر بھائی جان، میں آج ہی اپنی سی دی تیار کر لیتا ہوں۔“ امجد نے جواب دیا تھا۔

کچنی کے ہال میں کنڈیڈیشن کی بڑی تعداد موجود تھی۔ امجد کو ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ بالآخر چپڑا سی اس کا نام پکارا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 سر جیندہ خاموشی سے امجد کی سی دی کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے امجد سے اُن کے دادا کا نام پوچھ کر خود ہی سی دی کو مکمل کیا تھا۔ سر جیندہ مختلف سوالات کرتے رہے اور امجد اپنے جوابات سے انہیں مطمئن کرتا

رہا۔ ”مشر! امجد! آپ کی قابلیت اور تجربے نے ہمیں خاصا متاثر کیا ہے۔ تاہم ہمارے ساتھ پرائلیم یہ ہے کہ ہماری حریف کمپنی ہمیں ہر میدان میں شکست دے رہی ہے۔“
 ”دراصل ہماری پروڈکشن اتنی نہیں ہے کہ ہم دے گئے آرڈرز کی مالک پوری کر سکیں۔ لامحالہ ہمیں اپنی پیداوار بڑھانے کے لیے دو نمبر مال کا سہارا لینا پڑے گا۔ کیا آپ باہر کے ممالک میں ہمارے مال کی کھپت کے لیے تیار ہیں؟“

”سوری سر، میں دو نمبر مال کے فیور میں نہیں ہوں۔“
 ”مشر یہ کمیشن کا دور ہے۔ ہر شے میں ملاوت ہو رہی ہے۔“

”اور آپ کیا یورپ والوں کو اتنا بے خوف سمجھتے ہیں۔ اُن کی جدید لیبارٹریز دو منٹ میں کھرا اور کھٹا الگ کر دیں گی۔“
 ”جب آپ یہ رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انٹرویو دینے کیوں تشریف لے آئے۔ جائیے جاکر کسی مسجد کے پیش امام بن جائیں۔“

”جھیک لوسر۔“ امجد اٹھا اور سب لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہوا دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ وہ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”افسوس دینی تعلیم میں اتنا قابل نہیں ہوں جو کسی مسجد کے پیش امام کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ البتہ بے ایمانی کے کام میں اپنا ضمیر بیٹا اور وطن عزیز کی عزت کو دوسرے ممالک کی نظروں میں کرنا قبول نہیں۔“ امجد اتنا کہہ کر جھٹکے قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔
 سر جیندے نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔ اور پھر انہیں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے گئے۔ پھر سر جیندے نے چپڑا سی کو گم دیا۔
 ”دوسرے امیدوار کو بھیج دو۔“

☆ ☆ ☆
 ”انٹرویو کیسا رہا؟“ جنت نے امجد کے جوتے اتارتے ہوئے پوچھا۔

”افسوس جنت، میں ناکام رہا۔“
 ”چلیں کوئی بات نہیں دل چھوٹا نہ کریں۔ اللہ ضرور کوئی وسیلہ پیدا فرمائے گا۔“

”جنت میں نے تو پورے خلوص کے ساتھ اپنے رب کے آگے سر جھکا یا ہے۔ شاید اُس کی بارگاہ میں میرے سجدوں کو شریف قبولیت حاصل نہیں ہے۔“
 ”ابنائیں کہتے اللہ تعالیٰ سجدوں کی توفیق بھی انہی کو بخشتا ہے جن کے سجدے قبول فرماتا ہے۔“ جنت نے محبت سے سمجھایا تھا۔

بچوں کے اسکول سے آتے ہی دوپہر کا کھانا لگا دیا گیا۔ وکیل صاحب بھی آچکے تھے۔ چنانچہ کھانا شروع کر دیا گیا۔ دریں اثنا، امجد نے اپنے انٹرویو کے نتیجے سے وکیل صاحب کو آگاہ کیا اور کھانا کھا کر خاموشی سے بیٹھا رہا۔

”بھائی جان... انہیں افسوس سے خدا نے ان کے سجدوں کو شرف قبولیت نہیں بخشا سی انٹرویو میں نفل ہو گئے ہیں۔“ جنت نے وکیل صاحب سے کہا۔ وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے پلٹے پھر امجد کی طرف دیکھا۔

”امجد میاں جب کسی گہنگار اور بھٹکے ہوئے بندے کی پیشانی سے رب کے حضور زمین سے جالقی سے تو اس کی رحمت یہ گوارا ہی نہیں کرتی کہ اس کے آگے جھکنے والے سر کو بے مراد کرے۔ یہ نیچے۔“ وکیل صاحب نے ایک لفاظی امجد کی سوت بڑھایا۔

”کیا ہے بھائی جان اس میں؟“ جنت نے بیانی سے سوال کیا۔

”اس لفاظی میں ان کا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔ سر جیندے نے انہیں شیئر سیلر کے عہدے پر رکھ لیا ہے۔ تو آؤ بیچاس ہزار روپے ماہانہ سے اور کچنی کو فائدہ پہنچانے کی مدد میں مزید ترقی کے مواقع بھی ہیں۔“
 کچھ دیر بعد امجد جنت کے ہمراہ مبارکباد وصول کر کے اسے کمرے میں آ گیا۔ امجد میاں باہر بیہوش کے ساتھ کھل رہے تھے۔

”جنت کیا واقعی خلوص دل سے مانگی جانے والی دعاؤں اور سجدوں میں ایسی تاثیر ہوتی ہے؟“ امجد نے بیانی سے پوچھا۔

دی آن کرتے ہوئے جنت سے سوال کیا۔
اس سے پہلے کہ جنت کوئی جواب دیتی۔ لی وہی پر
دکھائی جانے والی تواریک اجد کے سوال کا جواب دہرا رہی
تھی۔

خلوص دل کے سجدے رازگاہ جانا نہیں کرتے
خدا کے نام لیوا غم سے گھبرا نہیں کرتے

☆.....☆.....☆

اجہر نے اپنی ساری توانائی کچنی کی ترقی پر خرچ کر
ڈال دی تھی۔ چنانچہ پہلے ایک شفت کام کرتی تھی مگر برہمنی ہوئی
مانگ نے دوسری اور پھر تیسری شفت کھانے کی راہ ہموار
کردی۔ نتیجتاً لوگوں کو نہ صرف روزگار ملا۔ بلکہ کچنی کی
آمدنی کا ہدف لاکھوں سے نکل کر تیزی سے کروڑوں تک
پہنچ گیا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا اس لیے سب گھر پر ہی موجود
تھے۔ اچانک ٹیلیوین کی کھنکھانٹا نہ گئی۔

”ہیلو“۔ وکیل صاحب نے ریسور کان سے لگا کر
کہا۔ وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی
گفتگو کی آواز سنتے رہے پھر بولے۔

”بہت بہت شکریہ سر، ہم لوگ ضرور حاضری ہو جائیں
گے۔“ کہہ کر وکیل صاحب نے ریسور کرڈل پر رکھ دیا۔
”کس کا فون تھا؟“۔ زبیب نے سوال کیا۔

”سرجنید تھے لائن پر۔“ انہوں نے ہم سب کو کچ پر
مدعو کیا ہے۔ آپ لوگ جلد از جلد تیار ہو جائیں۔ سرجنید
وقت کے بہت پابند ہیں ہمیں خلیک ایک بجے ان کی کچھی
پر پہنچنا ہے۔“

کار میں وکیل صاحب ان کی بیگ پچھلی سیٹ پر اجہد
، جنت، اجہد اور دونوں بچیاں موجود تھیں۔ اجہد میاں
اجہد کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”بیکم ہر شاہید غلط کچھی میں آگئے ہیں۔ وکیل
صاحب نے کچھی کے مین گیٹ پر کھڑے رہنے اجنبی چروں کو
دیکھتے ہوئے بیکم کو مخاطب کیا۔

”واپسی و سرجنید اور ان کی بیگم تو نہیں لگ رہے۔“
زبیب نے تشویش کے عالم میں جواب دیا۔ گاڑی آہستہ
روی سے چلتی ہوئی رُک گئی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ
اچانک کھلا اور جنت توپ کر باہر نکلی وہ بے قرار کی

عالم میں تیزی سے اجنبی شخص کی جانب لپکی اور دادا جان
کبھی ہوئی اجنبی شخص کے سنے سے لپٹ گئی۔

”میری بچی کہاں کھوئی تھی تو۔“ دادا جان نے
بھرائی ہوئی آواز میں جنت کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

وکیل صاحب اور زبیب سمجھ گئے کہ گیٹ پر کھڑے
ہوئے سر دادا اور عورت جنت کے دادا، دادی ہیں۔ اجہد دادا

دادی سے مل کر شرمندگی سے سر جھکائے اپنے ابو ہارون
میاں کے سامنے کھڑے تھے۔ اور ہارون جنت کو

لپٹائے ہوئے سخت نظروں سے اجہد کو گھور رہے تھے۔
بال آخر ان کے چپاڑید میاں نے بڑھ کر اجہد کے سر پر

ہاتھ چھیرا پھر مسکرا کر بولے۔
”شام کا بھولا اگر دوپہر کو گھر آجائے تو اسے بھولا

نہیں کہتے۔“ اس بکوی ہوئی مثال پر سب مسکرائے گئے
تھے۔ رشید میاں نے فوراً ہی وضاحت بھی کر دی تھی۔

”دراصل یہ شام کو اپنی دوسری بیگم کے ہمراہ گھر
سے نکلے تھے اور آج دوپہر کو واپس آئے ہیں۔“ سب

مل کر کچھی میں داخل ہوئے۔ سرجنید اور ان کی بیگم
ہاتھوں میں بچوں کے خوبصورت ہار لیے کھڑے

ہوئے تھے۔ سرجنید نے اجہد کے گلے میں ہار ڈال کر
اُس کی پیشانی چوم لی۔

”شکریہ سر!“۔ اجہد نے ادب سے سرجنید کا شکریہ ادا
کیا۔ دوسرا ہار سرجنید کی بیگم نے جنت کے گلے میں ڈال

کر اُسے اجہد کے گلے پر مہار کا بادی تھی اور جنت نے
اُن کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا تھا۔

”باتی باتیں بعد میں پہلے دعوت سے انصاف فرمائیں۔
سرجنید سب مہمانوں کو کھانے کی میز پر لے آئے۔“

کھانا پر تکلف اور بہت مزیدار تھا سب نے ہیر
ہو کر کھا کیا تھا۔ جب نوکروں نے نیز صاف کر دی تو سرجنید

نے گفتگو کا آغاز کیا۔ تین خوشیاں سمجھے۔ اسی لی ہیں کہ میں
رب کا چٹنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

پہلی خوشی، آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ میں
اجہد میاں کے دادا سے کیسے واقف ہوں۔ تو بھئی یہی

میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ اجہد
کی سی وہی پر ہیں اُن کا نام کچھتے وقت چونکا تھا۔ کیا

میرے بچپن کا کلاس فیلو اور جگر کی دوست تو نہیں ہے۔

بعد کی تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت وہی ہیں۔ میں
ان سے ملنے ان کے گھر جا پہنچا۔ دونوں میاں بیوی اپنے

پوتے کو پنی کے کم میں ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ میں نے ان
کو دلدادہ کیا اور بتایا کہ اجہد میری کچنی میں ملازم ہیں تو

دونوں کی دھار بندھی اور خوشی بھی ہوئی۔
”دوسری خوشی بیٹی جنت آپ سے وابستہ ہے۔

آپ نے جو مل اپنے شوہر کے حکم پر کر کے دکھایا۔ اُس
نے دختر اسلام کے پایزہ کردار کو زندہ کر دکھایا ہے۔

آپ جس مقدس ذات کے محبوب بنائے ہیں۔ پھر آنکھوں پر
درد و سلام بڑھتی رہتی ہیں وہ بھلا آپ کو کیسے تنہا اور بے

سہارا چھوڑ سکتے تھے۔ آپ وکیل صاحب کے گھر
آئیں۔ اجہد میاں آپ کو آپ کی گستاخی کی سزا ملی۔

تاہم آپ کی محترم بیوی اور بچے کی دعاؤں پر خدا کی
رحمت جوں میں آئی اور اُس نے آپ کی سزا معاف

کر کے دوبارہ جنت بیٹی سے ملوایا۔ آپ بہت خوش
نصیب ہیں جو ان نیک شریک حیات آپ کو ملی ہے۔

درد و سلام پڑھنے والوں سے خدا اس لیے بھی زیادہ
محبت کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے محبوب بنائے ہیں۔

کرتے ہیں۔“

”اب تیری خوشی!“۔ سرجنید نے رُک کر اپنی بیگم کی
طرف دیکھا۔ وہ مسکرائی ہوئی انہیں اور ایک خوبصورت

لفظ اجہد کو دیتے ہوئے بولیں۔
”جینا! اجہد ہماری پچھی میں جزل شجر کی پوسٹ

مبارک ہو۔“

”شکریہ دادا بہت بہت شکریہ۔“ خوشی کے
مارے اجہد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سب ہی نے

اجہد کو مبارکباد دی تھی۔
”یہ لوہیاں! اجہد یہ چایاں اس کچھی کی ہیں جو وکیل

صاحب کی کچھی کے سین سامنے بنی ہے اور دوسری چائی
کار کی ہے۔ کچھی ویل ڈیکور بیڈ ہے۔ خانساں،

چوکیار، مالی اور دیگر گھر ملیو ملازمین معہ کار ڈرائیور
ہر وقت آپ لوگوں کے لیے کچھی میں موجود رہیں گے

سارے ملازمین کی تنخواہ بیٹی کے ذمے ہیں۔“
”بھئی جنید تم نے تو میرے پوتے کو آسمان کی

بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔“ دادا جان مسکرائے۔

”ہاں میرے دوست تمہارا پوتا ان بلند یوں سے
زیادہ کا کابل ہے۔ اور اب یہ صرف تمہارا ہی نہیں میرا بھی پوتا

ہے۔ اور یہ بات میں دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں۔“

☆.....☆.....☆

سب لوگ چلتے ہوئے کچھی کے طویل و عریض
خوبصورت باغ کو عبور کرنے کے بعد کچھی کے دیو قامت

گیٹ سے اندر داخل ہوئے اور ان کے قدم یکایک مچھکے
سے رُک گئے۔ سامنے جنت کچھی کی سکران رہی تھی۔ وہی کچھی

ہوئی گھنیری پلکیں اور چہرے پر برستا ہوا نور جس کو کیسرے
کی آنکھ نے بہت خوبصورتی سے فکس کیا تھا۔ جنت کے

دائیں ہاتھ کی انگلیاں اُس کی ہینڈوں کو چھوری تھیں جبکہ
بایاں ہاتھ اندر کی جانب پٹنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

جنت یقیناً اپنے پیاروں کو خوش آمدید کہتے ہوئے
اپنے گھر آنے پر مبارکباد دے رہی تھی۔ ایک شعر آسمان

اور زمین کی جنتوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔
مانا کہ آسمان پر جنت کا ہے وجود

بیوی اگر ہو نیک گھر جنت سے کم نہیں
سب ہال میں پہنچ کر نشوون پر بیٹھ گئے۔ اجہد جنت کو

اپنے کمرے میں لے جانے کے لیے اُپر لے آیا تھا۔
ہال میں دادا چائی سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ

رہے تھے۔
”دیکھ لیا آپ لوگوں نے اجہد میاں اپنے مرکز سے

کتنے دور جا چکے تھے۔ گرد و بار وہ ہیں واپس آگئے ہیں۔ اور
انشاء اللہ اب وہ بھی بھی مرکز سے جدا نہیں ہوں گے۔“

”جنت اپنے مبارک ہاتھوں سے اپنے کمرے کا دروازہ
کھولا۔“ اجہد نے جنت کی طرف تالے کی چابیاں بڑھائیں۔

جنت نے کھنیرے پلکیں اٹھا کر اجہد کو دیکھا اور بولی۔
”میرا کمرہ!.....! کہیں میں پھر سے بے دخل تو نہ

کر دی جاؤں گی۔“

”ہمیں جنت ایسا وقت آنے سے پہلے میں خود اپنی
زندگی سے بے دخل!.....! جنت نے توپ کر اجہد کے

ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
”اللہ نہ کرے۔ آئندہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے

نہ سنوں۔ چلے دروازہ کھولیں۔“
”میں دروازہ ہم ہی کھولوں گی۔“

دوسری طویل بچائی

تم مل گئے ہو!



محمد یوسف خاری

ہر دہرے پرست کی تاباں کیوں سے جڑی، ایک بہت خاص داستان، امریکہ سے



برداشت نہیں کرتی۔ مگر جنت اپنے شوہر کی خوشی کے لیے سب سے نگرانی تھی۔ اور دین کو سچ پر لے جاتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔

جنت کمرے سے اور پھر مشہودہ کے کنبے پر اپنے شوہر کے حکم پر گھر سے بے گھر ہوئی۔ تو مسکرا رہی تھی۔ اپنے پیاروں سے بھجنے کا غم ضرور تھا مگر لہوؤں نے مسکراتا نہیں چھوڑا۔ مشہودہ کا ڈرائیور اسے بھانک دیرانے میں بے یار و مددگار چھوڑ گیا۔ مگر جنت مسکراتی رہی۔ تاہم جنت آج پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اس خوف سے گریہ نہ کر سکتی تھی کہ کوئی بے ادبی نہ ہو جائے۔

”میرے آقا سے دو جہاں میں اللہ تعالیٰ ہم اور میرے ماں باپ پر فرمان۔ میرا ناپاک وجود، بے ادب زبان گھبرا کر آنکھیں اور آپ کی بارگاہ سے اذن بازیابی، یہ گھبرا کر سخت شرم سار ہے۔ آپ کے دربار عالی وقار میں تو غوث، اولیائے کرام اور بزرگان دین جنہیں اللہ کا دوست بننے کا شرف حاصل ہے آپ کے حضور بے ادبی کے خوف سے لرزاں بدانداز رہتے ہیں۔ تو اس خاک کی کیا قیمت، ڈرتی ہوں میرے درود و سلام کے جواب میں (۱) کی صدا نہ گونج اٹھے۔“

جنت رو رو کر سارے جہانوں کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے رو رو حاضر کی خوف سے لرزتی رہی۔ اچانک جنت کو بکلی کی غنودگی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ہاتھ کی شیریں آواز سن رہی تھی۔

”وہ تو سراپا رحمت اور کرم ہی کرم ہیں انہوں نے صرف بازیابی بخشا ہے تو دل کیوں چھوٹا کرتی ہو۔ اُن کا حکم ہے کہ اُن کی بارگاہ سے کس میں سب سے پہلے تمہارے سلام کا جواب دیا جائے گا۔“

جنت نے غنودگی سے بیدار ہو کر فوراً آنکھیں کھول دیں۔ دل کو سکون مل گیا، نئے قرار روح کو قرار آ گیا۔ جنت کی نگاہیں دیوار میں لگے سبز گنبد کے عین کے طفرے پر پہنچ کر رک گئیں۔ جنت گنبد خضر اکو آنکھوں میں بسائے ہوئے ہو لگ گناتے لگی تھی۔

جسے چاہا وہ پہ بلا لیا جسے چاہا اپنا بنایا۔ یہ بڑے کرم ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے ☆☆☆☆

”یہ آپ کا حکم ہے؟“ جنت مسکرائی۔
”ناہیا۔ میری توبہ میرے باپ کی توبہ جو کبھی حکم دلا اللہ! اتنا ہے۔“ ریکوٹ ہے۔

احمد دونوں کان پکڑ کر اٹھک جھٹک کرتے ہوئے گھٹکیا یا تھا۔ اور جنت ٹھکلا کر ہنس دی۔

جنت نے دروازہ کھول کر اندر بھاگا اور احمد اسے بازوؤں سے پکڑ کر کمرے میں آیا۔ احمد نے دوبارہ وہی شعر پڑھا تھا۔

مانا کہ آسمان پر جنت کا سے وجود بیوی اگر ہو نیک گھر جنت سے کم نہیں کیسا کہ جنت کی بھی ہوئی نگاہیں احمد کی نگاہوں سے ٹکرائیں تب وہ آگے بڑھی اور احمد کے سینے سے جا لگی۔
”سرتاج۔ اتنی جلدی نہ عطا کریں۔“

”میرے بلند اور پاکیزہ کردار رکھنے والے ساتھی آپ کا مقام آسمان پر ہے۔ جسے پانے کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں چمکتی رہتی ہے۔“

”اس عزت افزائی کے لیے نعمتوں ہوں۔“
”جنت میں نے آپ کو کبھی کوئی تحفہ نہیں دیا تھا مگر آج ضرور دوں گا۔“

”کیسا تحفہ۔۔۔ کیا وہ کوئی قیمتی تحفہ ہے؟“
”تحفہ ہے تو بہت قیمتی۔“

”اُف اللہ! سرتاج جلدی سے دکھائے نا۔ وہ ایسا کون سا قیمتی تحفہ ہے؟“ جنت نے بے تابی سے پوچھا۔
جواب میں احمد نے جب سے پاپیورٹ اور ہوائی جہاز کے ریڑن گٹ نکال کر جنت کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جنت جن محبوب خدا کی محبت میں ڈوب کر آپ آٹھوں پہر درود و سلام پڑھتی رہتی ہو۔ اب اُن کے روضہ اطہر کے سامنے اب سے کمرے سے ہو کر درود و سلام پڑھنا، ہم سب ایک میں کمرے کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ میں یہ تحفہ آپ کے لیے سب لوگوں کو سنانے جا رہا ہوں۔“
احمد اچانک کہہ کر کمرے سے چلا گیا تھا۔ اتنا عظیم تحفہ پا کر جنت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ تو بہت سارے ہوشا کر اپنے خدا کی رضا میں خوش رہنے والی لڑکی تھی۔ کوئی بھی اپنے سر پر سونک کا لانا

”دیکھو جھولا اتنے زور سے دینا ہے کہ میرے پاؤں اُس ٹہنی کو چھونے چاہئیں“ تاروف نے اپنی بہن عروشہ کو کہا۔
 ”اور کوئی حکم عروشہ نے کہا۔“

جاہیں کیونکہ جھولا پر دوازے کے لیے تیار ہے۔ وہ جھولے کو
کانی پیچھے لے جاتی ہوئی بولی لگتا تھا وہ کسی شرارت کے
یے تھی۔ مگر تلافی کچھ نہیں بولی البتہ چہرے پر
مقصودیت صاف نظر آرہی تھی لگتا تھا وہ ابھی تک اسی انظم
کے زیر اثر تھی۔ عروش نے جھولا کاننی پیچھے لے جا کر
اچانک زور کا دھکا دیا، ایک تو جھولا کاننی پیچھے سے زور
سے آ رہا تھا اور دوسرا عروش کا دھکا، جب کہ تیار نہ جانے
کسی کے خوابوں میں کس جھولے پر نیشی تھی۔ اتنی اڑان
برداشت نہیں کر سکی اور گہرا کرچہ بڑی اور فوراً جھولے کو
چکڑ کر کے اتر کر عروش کو برا بھلا کہنے لگی جب کہ عروش
اس کی حالت پر ہنس کر کہنے لگی کہ جناب بھولا بھی تھا کہ
اپنے بیٹک سے کہیں نہیں تو کوئی بیٹ سا تھ کر کہیں۔ یہ
نہ وہ آپ اڑ جاں اب چکھل نہ مزا۔“

شاہد ارشد استہلال - ویسے کیا ب میرا نام بھی اس لئے
میں لکھا جائے گا کہ فلاں شہری نے جوتا اچھا ل دیا،
کیوں عرصہ - وہ اپنے مزاحیہ ٹوئیں اگ لگاتھا۔
”دشمن کے پوکھلے صدر، وزیر اعظم نہیں ہیں
وہ، اسے ایک ارشد ہی آتے ہیں۔“ عروذ نے معنی
خیر مسکراہٹ کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔
”دو کھا؟؟؟“

شام کو رویشان کی ڈی ڈی اوصاحب کے ساتھ فلفلہ
ان پر میننگ تھی، اگر وہ کھانا کھاتا تو تھری پیس اسٹری
کر سکتا تھا اس لیے اس نے تھری پیس اسٹری کر لیا اور
کھانا چھوڑ دیا اب اسے روز کی میننگ کی وجہ سے بہت
بیٹھان پڑا اب اس کو زندگی کے کسی جیون سماجی کی
ضرورت تھی۔ تارنڈے کے سوا وہ کسی کا سوچ بھی نہیں سکتا
تھا خود اس کے بااں باں بچپن میں ہی وفات پا گئے
تھے تو تارنڈے کی مطلب اس کی خالہ زہرہ نے اس کو
اپنا سنا اور خالہ زہرہ کے شوہر اگل زیدی کی بھی فرشتہ
مفت انسان تھے۔ انہوں نے اس بات پر اعتراض
نہیں کیا تھا جب کہ رویشان نے خود بھی ان کو شکایت
کا موقع نہیں دیا تھا۔

کی لڑائی کر دیا کہ انجوسے کرتی۔ اس کی ہندی عادت سے سب خائف تھے گردہ باز میں آئی تھی اور تارن کی نسبت شرمیلی نہیں تھی اور بہت ضدی تھی اور دل میں کچھ نہیں جانے کو کہیں نے یہ چیز حاصل کرتی ہے تو بس اس کو حاصل کر کے ہی رہتی تھی، خود میرا بھی جی ہاں تھا میں حاصل کر کے شرمیلا تھا اور بے پناہ ضدی تھا۔ تارن اور ورشہ کے سوا کسی اور لڑکی سے بات کرنے پر میری جان نکلتی تھی۔ میں اپنے تھے گردہ کو مضبوط رکھنا چاہتا تھا تو جس میرا لہجہ انجوسے بھی تھا اور حال اور رنگ میں بھی تھا۔ مجھے یہ حال کہ سکر بڑا کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی میں علمی اختصایہ آفس میں اسٹنڈ مشنر تھا۔

کی مورتیاں گھروں میں رکھتے ہیں اور ان سے پیار کرتے ہیں مگر ہمارا معاملہ تو ایک زندہ شخص کے ساتھ ہے۔ جس کو بڑے نہیں ہیں مگر پیار کرتے ہیں بس چنگاری تو ہے مگر آگ لگائی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے روشن صاحب مگر شاید اس چنگاری کو آگ لگاتے لگاتے آپ کی عمر ہی ضائع نہ ہو جائے۔“ عروش نے بھی یہی بولی جا رہی تھی یہی اور غصے میں۔ کیوں گئی ہے میں نے سوچا۔

وہ دن میرے لیے سوہان روح تھا جس دن ہمیں امریکہ روانہ ہوا تھا۔ ایئر پورٹ پر ہمیں سب رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ اگلے اور آخری تو بس دور رہتے تھے عروش کی حالت بہت خراب تھی اور تازہ روزہ دہی تھی نہ آسہا ہوا بھی تھا، بس اس کی حالت ایسی تھی جیسے اس کا جسم کانپ رہا ہو اور اس کے جسم سے کسی نے خون نچوڑ لیا ہو۔

مجھے اظہار محبت سے اگر نفرت ہے تو نے ہونٹوں کو لڑنے سے تو روکا ہوتا ہے نیازی سے مگر کانچنے آواز کے ساتھ تو نے گھبرا کے مرا نام نہ پوچھا ہوتا ☆☆☆

نہ جانے لوگ پردیس میں کیسے رہتے ہیں۔ میں تو دودن میں ہی پورا ہو گیا تھا۔ میرا جسم تو امریکہ میں تھا مگر دل پاکستان میں تھا۔

ہماری ٹریننگ شروع ہو چکی تھی ٹریننگ لوگوں کو سلاطین کی صورت میں ڈوبنے سے بچاؤ، وغیرہ سے متعلق ہوتی تھی۔ جو کہ خاصی تنگ دینے والی ہوتی تھی پانی کی بھتی ہروں کو کیچ کر مجھے تازہ پاؤ جانی تھی اور میں جھپٹتا جاتا تھا، جس کی وجہ سے میں اکثر خیالوں میں رہنے لگا تھا پھر ان خیالات کی وجہ سے مجھے اکثر ڈانٹ بھی پڑنے لگی۔ ایک دن حدی ہو گئی۔ جب مجھے دوبار مخاطب کیا گیا مگر میں تو خیالوں میں پاکستان کھویا ہوا تھا۔ بس اس دن مجھے بہت غصہ آیا کہ یہ محبت کیا ہے یہ دوری کیا ہے، کسی کو کھو دینے کا نام کی یا لینے نام، یہ اذیت میں کب تک برداشت کروں گا۔ آخر میری آنکھیں کسی کی منتظر کب تک رہیں گی۔ کب تک کہتے ہیں تاکہ جس نے محبت نہیں کی اس نے اذیت محسوس

نہیں کی۔ محبت تو صبر کا نام ہے محبت لازمی مضمون ہے۔ جس نے اس کو اختیاری کے طور پر لیا وہ محبت کی لطافت کو چھو لینے سے بھی محروم ہو گیا پھر میں نے اس دن عروش کو غصے میں کال کی اور تازہ کی خیریت پوچھی اور دوسرے سے اپنا مقصد پوچھا اور اس واقعہ کا کہا کہ آج تم مجھے ہر حال میں جواب دو تاکہ تازہ کیا کہتی ہے۔“ روشن صاحب میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ان کے دل میں ایسا ویسا کچھ نہیں۔ یہ سب آپ کی غلط فہمی ہے۔ دنیا بہت وسیع ہے کسی اور جگہ نظریں گھمایاں۔ ہو سکتا ہے کوئی اور آپ کا منتظر ہو۔“ عروش پلیر یہ دل ہے کوئی کیسے نوکری سنا سکیں بن یا کوئی پچرا ہی نہیں جس میں کسی کے لیے ہر روز بنی جگہ بن جائے یا جب نکل ہو جائے تو ڈیلیٹ کر کے کسی اور Item کو گھسایا۔ اس میں صرف بس اس کی بنی گنجائش ہے۔

”اچھا!!! تو پھر تازہ تازہ کا الاگ الٹا پتے رہیے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ہاں عروش تم کو ہنسا آ رہا ہے نا کوئی بات نہیں تم ابھی محبت کے اس لطیف جذبے سے دور ہو تو اس لیے اس اذیت سے دور ہو اور دعا کرتا ہوں کہ تم اس اذیت سے دور رہی رہو۔ اب بس میری یہ آخری کال ہے اور.....“ اس پہلے میں اپنی بات مکمل بات کرتا عروش نے فوراً میری بات کاٹ دی اور کہنے لگی۔

”کیا میں اس لطیف جذبے سے دور کیا میں اذیت سے دور ہوں۔ وہ کہتے ہیں تاکہ ہمیں اس سے محبت کرنی چاہیے جو تم سے محبت کرتا ہو مگر روشن تم کہتے ہوئے اور سادہ ہوں۔ محبت کی زبان صرف آئی لوگوں ہوتی۔ یہ آپ کو دوسرے بندے کی آنکھوں اور.....“

”بالکل عروش میں بھی یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے عروش کی بات کاٹنے سے پہلے کہا۔ ”تازہ نے گواہی زبان سے اظہار نہیں کیا کہ اس مجھے تو ایسا لگتا ہے مگر شاید ہمارا عشق، عشق ناقص بن چکا ہے اور یہ میری آخری کال ہے۔ آج کے بعد میں کوئی کال نہیں کروں گا۔ اپنا یہ نمبر ہمیشہ کے لیے بند کر رہا ہوں اور پھر بھی پاکستان لوٹ کر نہیں آؤں گا میں تازہ کے سامنے سے بھی دور چلا جاؤں گا۔ مجھے انفسوس ہے کہ میں، اگلے اور آخری کی خدمت نہ کر سکا۔“ میں روتے ہوئے کہا۔

”نہیں روشن پلیر ایسا مت کرنا پلیر روشن میری بات تو سنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ عروش یکدم میرے اس فیصلے پر گھبرا کر دوسری طرف سے زور زور سے کہنے لگی۔

مگر میں نے کال کاٹ دی اور پھر تم سے تمام نمبر موبائل میں سیو کیے اور کم کو ڈکر پیچیدہ دیا اور دوسری نئی سیم کے لیے اس فلڈ ٹریننگ جاب سے دل اجاڑ دیا کہ تھا اس جاب سے جان چھڑا رہی تھی مگر یہ تھوڑے مشکل ماحول تھے۔

اگلے دن میں نے اپنے پاکستان میں اپنے چند اعلیٰ افسر دوستوں کو فون کیا اور ان کے توسط سے یہاں سے جان چھڑائی اور یہاں سب کو بتایا کہ میں پاکستان واپس جا رہا ہوں مگر بکے کی ایک کمپنی کے ساتھ میری بات ہو چکی تھی۔ یہ ایک بحری جہاز کی کمپنی تھی۔ وہاں نیچے جہاز شہر کے اچھے عہدے کے پرنسپل خواہ کے لیے رکھ لیا گیا تھا۔

اور یہاں میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اپنا سب ماسٹر بھلا کر ایک سال، دو سال، حتیٰ کہ پانچ سال گزر گئے۔ کسی نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی مجھ تک آنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا تھا، میں اپنی زندگی میں مصروف ہو چکا تھا بس بھی کبھی دل کے کسی کو نہ کھد رے سے آواز آنی کے تازہ بھی ہوئی، عروش کدھر ہوئی، دونوں کی شادیوں ہو چکی ہوں گی۔ بچے کہتے ہوں گے۔ بس یہ یادیں بھی تو میں مسکراتا تھا۔

عہد فرصت میں کسی بار گزشتہ کا خیال جب بھی آتا ہے تو جیسے رنگ جاں کھینچتا ہے ☆☆☆

ایک دفعہ جب اپنے کام میں مصروف تھا تو میرے موبائل کی گھنٹی بج اچھی۔ میں نے دیکھا تو حیران رہ گیا پاکستان کا نمبر تھا۔ ریسیور کے کانوں سے لگا تو دوسری طرف سے خالد زہرہ کی آواز تھی۔

”اسلام علیکم روشن“ ”جی..... سلام اسلام میں ڈرتے ہو تو جواب دیا۔“ ”جی اور کتنا دور بھاگو گے، ماں سے بیٹا دور نہیں بھاگ سکتا۔“ خالد نے ٹھوکر پیچھے میں کہا۔ ”نہیں وہ بس خالد۔ میرے منہ سے مارے

شرمندگی کے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔ ”چھانم دودن تک پاکستان پہنچ جاؤ۔“ ”کیوں خالد خیریت تو ہے۔“ ”ہاں خیریت ہی ہے وہ تازہ کی شادی ہے اور کام کو بوجھ ہوگا اس لیے تم جلدی سے آ جاؤ۔“

یہ بات سننے ہی مجھ پر جیسے پلازٹ پڑا۔ ”جی مگر خالد ادھر کافی کام ہیں میں سے کہا۔“ ”روشن تم نے آنا ہے یہ ہمارا حکم ہے۔“ خالد نے اپنا رانا آخر یہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ خال!!!“

اس سے پہلے کوئی اور بات ہوتی رابطہ کٹ گیا۔ یہ قسمت میرے ساتھ کیا کھیل، کھیل رہی تھی۔ کیا تازہ کی شادی کی ہو رہی تھی۔ میں کیسے جاؤں اس کے سامنے وہ میرے سامنے کی دوسرے کی دہان بن جائے گی میری آنکھیں بہا نہیں۔ مگر دوسری طرف حکم تھا اور جس کی بجا آوری لازمی تھی۔

☆☆☆

آج میں پانچ سال کی طویل مدت کے بعد پاکستان واپس آیا تھا۔ پانچ سال انہوں سے دور رہنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

سب لوگوں نے بڑی خوشی سے میرا استقبال کیا۔ کسی نے ماسی کو کد کا اتنا عرصہ کہاں تھے۔ بڑی مشکل سے سب کو گھنٹی بچے کہاں نساں مگر مطمئن کیا۔

میں تازہ سے نہیں ملتا نہ ملنا چاہتا تھا اور نہ ہی مجھے عروش نظر آتی تھی۔ دوسرے دن نکاح تھا اور گویا مجھ پر پہاڑ گرے والا تھا، نکاح کے دن جب مجھے اگلے زیدی نے کہا کہ جاو بیٹا تازہ سے نکاح فارم پر سائن کروا کر لے آؤ۔“

جی ہاں کیوں کہ اس کا نکاح کسی اور کے ساتھ ہو رہا تھا تو مجھے ایسے لگا جیسے میں سراجاؤں گا۔ میں جیسے تھے اس کے کمرے میں گیا کیونکہ، اُسے تو میری دہان بن کر آتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ کیا رہا ہے تھے۔ اس نے دستخط کر دیے۔ میں رستے لے کر کھڑا ہوا تو آخر اس کا خطبہ جواب دے گیا تازہ رو بن گئی وہ سسکیاں بھرنے لگی جو کچھ اس نے مجھ سے کہا وہ میرے لیے

نا قابل برداشت تھا وہ مجھے سے کہنے لگی،

”روشان تم ایسا کیوں کر؟“

میں حیران رہ گیا۔ میری سامتیں حیران تھیں کہ ایک مجسمہ بولا تھا۔

”میں نے کیا کر دیا ہے۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تم نے ہمیں پیار کا جھانسا دیا وہ جو کہ دیا“ فریب دیا۔

”وہ دوتے ہوئے ہوئی۔“

”کیا کہہ رہی ہو تم، میں نے تم کو دھوکا دیا۔ میں نے تم سے کئی دفعہ بات کرنے کی کوشش کی مگر حوصلہ نہیں ہوا جو تم خود کرتی ہو۔ پھر میں نے عروشد کا سہارا لیا۔

اور عروشد نے تم کو کہا تو تم نے صاف انکار کر دیا کہ تمہارا سے دل میں میرے لیے کوئی جذبات نہیں ہیں اس لیے میں نے جبر کیا اور ہمیشہ کے لیے تم سے دور چلا گیا۔“

”میں نے کرو روشتان تجھوت مت بولو اور کتنا جھوٹ بولو گے۔“

”تم عروشد سے پیار کرتے تھے۔ اس سے میرے بہانے گھنٹوں بات کرتے تھے۔ اس سے بات کرتے وقت تو تم کو پسند نہیں آتا تھا۔ تم تو سخت کے خلاف ہی تھے اور شاعری پر مبنی ڈائریاں لکھتے تھے۔ روشتان تم کو صرف مجھے سے بات کرتے وقت دلتا لکھتا تھا۔ یہ سب تم دونوں کی چال تھی اور وہ تم سے پیار کرتی تھی۔“

”تاروف پیلز خدا کا واسطہ عروشد اور ہمارے بیچ آیا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں اس کا احترام کرتا ہوں۔“

”روشتان وہ مجھے تمہاری ہر کال دکھائی تھی کہ آج ہم نے اس موضوع پر بات کی۔ فلاں موضوع پر بات کی اور اور تھی کہ اس نے تمہارے ساتھ کی کئی دو، دو، کتنے کی کال سری بھی دکھائی تھی اور تم اس سے کئی بھی نہ کر کے والے تھے۔ تاروف بدستور سسکیاں بھر رہی تھی۔“

”اوہ میرے خدا! تاروف میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میری اس سے کئی دس منٹ سے بھی زیادہ بات نہیں ہوئی۔ اچھا میں اس عروشد کو بلا کر لاتا ہوں اس کے منہ پر سب حقیقت پوچھ لوں۔“ میں نے شدید غصے میں کہا۔

”روشتان صاحب! مردے گواہی دیتے نہیں آتے۔“

”کسک..... کیا مطلب۔“

جب آپ نے آخری دفعہ کال کی تھی تو آپ نے کہا

تھا کہ میں ادھر امریکہ میں ہی کسی اور لڑکی سے شادی کر رہا ہوں اور وہ بے چاری تم سے یہ کہتی رہی کہ! روشتان پیلز ایسا مت کرنا۔ پیلز روشتان میری بات تو سنو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ مگر تم نے اس کی کال کاٹ دی اور اس صدمے سے اس کو ہارٹ ایکٹ ہوا کیونکہ وہ تم سے بہت پیار کرتی تھی اور وہ بیچ کوئی اور ایک سال تک تمہارا نمبر نہ پائی کرتی رہی اور پھر تمہاری جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور اس نے ایک دن خود کشی کر لی۔“

”کیا عروشد نے خود کشی کر لی۔ اوہ مانی گاؤ۔“ یہ میرے لیے ناصدمہ تھا۔

”اچانک دروازہ بج اٹھا ہر تاروف کی خال تھی۔“

”جینا جلدی آؤ۔“

”جی ہاں آیا۔“ میں نے کہا جس پر وہ چلا گئی۔

لیکن تاروف یہ پانچ سال پرانی بات ہے اور شاید میں نے آخری کال پر میں نے اس کو ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے جب بھی اس کو کال کی تمہارے حوالے سے کئی بھی اور اس دن بھی میں نے تمہارا ہی کہا تھا کہ میں اپنا یہ نمبر ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا۔ میں تمہارے سامنے سے بھی دور چلا جاؤں گا اور پھر بھی پاکستان لوٹ کر نہیں آؤں گا اور کئی دوسری لڑکی کی بات بھی نہیں ہوئی تھی اور.....“

اس سے پہلے کوئی اور بات ہوتی تاروف نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور دوتے ہوئے کہا پیلز یہاں سے چل جاؤ اور تم نے جو ہم کو دھوکا دینا تھا وہ دے دیا اور ہمارے منہ سے تم اقرار سنا جاتے تھے تا تو سنو روشتان! تم ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑتے تھے مگر اب ہم کو کوشش کریں گے یہ سب بھلا کر ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں اور پیلز اب چلے جاؤ۔“ اس کے بعد تاروف جھوٹ جھوٹ کر رونے لگی اور میرے پاس صفائی میں بیچھ نہ تھا۔

میں کل بھی خالی دان تھا اور اب بھی خالی دان تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے رجسٹر ان لوگوں کے حوالے کیا اور شادی والے گھر سے باہر نکل آیا اور میں نے کسی کو بتانے یا اپنا سامان اٹھا یا اور جب چاپ پاکستان سے نکل آیا اور واپس اس دن انہیں ٹکٹ تک گروا کر یو کے لوٹ آیا۔

میرے ساتھ جو ہوا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا

ہوا ہے۔ عروشد کے ساتھ کیا ہوا تھا تاروف نے کہا تھا کہ عروشد تم سے بہت پیار کرتی تھی، مگر عروشد نے تو مجھے بھی نہیں کہا تھا۔

”اچانک اس کی باتیں مجھے یاد آنے لگیں جب میں نے پہلی دفعہ عروشد کو کہا تھا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم خال تک اور تاروف تک میرا پیغام دو کہ میں تاروف سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔ تو عروشد نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔“

”کیا کہا تم نے۔ تم تاروف کی بات کر رہے ہو۔“ عروشد نے میری سے کہا تھا۔

”کیا وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے۔“ اس نے جراتی سے سوال کیا تھا۔

”وہ حیران کیوں ہوئی تھی؟؟؟“

”روشتان صاحب میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ افسانہ کو اگر دوسرے نظر آ رہے ہوں تو لازمی نہیں کہ انسان کو صرف ایک ہی راستہ دیکھنا چاہیے بلکہ دوسرے راستے پر نظر ڈال سنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ راستہ آسان ہو۔“

”وہ آسان راستہ کیا تھا؟؟؟“

”سواری روشتان میں شرٹ رکھ رہی تھی تو یہ غلطی گری گئی!!!!“

”دُعا بہت وسیع سے کس اور جگہ نظر میں گھما میں ہو سکتا ہے کوئی اور آپ کا منظر ہو!!!!“

میرا منظر کون تھا، عروشد؟؟؟

اور آخری دفعہ اس سے میری کیا بات ہوئی تھی۔ میں سوچتا نہیں چاہتا۔ میرا ماں کو بھول بور ہا تھا۔

کیا میں اس لطیف جذبے سے دور ہوں۔ کیا میں اذیت سے دور ہوں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ تمہیں اس سے محبت کرنی چاہیے جو تم سے محبت کرتا ہو مگر روشتان تم کہتے ہوئے اور سادہ ہو محبت کی زبان صرف آئی لو پو نہیں ہوئی یہ آپ کو دوسرے بندے کی آنکھوں اور.....“

مگر اس آگے میں نے اس کی کال سنی ہی نہیں تھی میں تو سمجھ رہا تھا۔ جو تاروف کہہ رہی ہے اس نے کچھ کہا کہ روشتان تم کہتے ہوئے اور سادہ ہو، میں بھولا اور سادہ نہیں تھا۔ میں نے وقوف تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے۔ روشتان پیلز ایسا مت کرنا پیلز روشتان میری بات تو سنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی

ہوں۔ مگر پھر اس شاید میرے خلاف تاروف کو بھڑکا یا ہوگا اور تاروف کا نون کی بیٹی کی۔ اس نے یہ سب سچ بھول لیا ہوگا۔ آہ رب اس عشق کی بچی فسلوں میں پھنس گئے۔

”عروشد تم نے یہ سب کیا کر دیا۔“ میں بیچ اٹھا۔

”تاروف عروشد۔“ میں چلانے لگا۔ تھوڑی بعد میں دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ آخری احساس جو مجھے تھا وہ یہ تھا کہ میرا اسٹاف بھاگ کر میری جانب آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ہلکے سے درد کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ اعصاب پر نشہ سوار تھا۔ میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو یہ اسپتال کا کمرہ تھا۔

”میں کہاں ہوں۔“ میں نے تصدیق کرنی چاہی۔

”اسپتال میں ہو اور تم بے ہوش ہو گئے تھے۔“ میرے اچانک غصے بھاری نے جواب دیا۔ یہ بھی پاکستان کے ہی تھے۔

”تھوڑی دیر کے بعد مجھے چند انکشن لگائے گئے پھر مجھے جانے کی اجازت دے دی گئی۔“

”تھوڑی دیر بعد ہم واپس آ گئے۔“

”روشتان ایک بات تو بتاؤ۔“

”جی سر۔“

”یہ عروشد اور تاروف کون ہیں؟؟؟“

”سر۔۔۔ وہ۔۔۔ چاہئیں۔“ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”جب تم کہتے تھے تو تم نے یہی دو نام لیے تھے۔ دیکھو تانے سے دل کا بوجھ بھگایا ہو جاتا ہے۔“

”اچھا روشتان اب میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔“

”جس بھاری صاحب نے میری کہانی سننے کے بعد کہا۔“

”آج سے کئی سال پہلے کسی ملک کا ایک گاؤں تھا۔ اس میں ایک طاقت ور، دُور دار اور جائیداد خاندان رہتا تھا، پورے گاؤں کی نگاہ میں چند غریب خاندان کے ہاتھ میں جس پھر اس گاؤں میں چند غریب خاندان بھی رہتے تھے ان غریب خاندان کے لڑکے کو اس طاقت ور، دُور دار اور جائیداد خاندان کی ایک لڑکی سے پیار ہو گیا۔ یہ پیار یوں کی، چاہت کی آخری حدود

کچھ بونے کا گرملن کی صورت نظر نہ آئی تو وہ لڑکی ضد کرنے لگی کہ وہ اس کو بھگا کر لے جائے مگر اس لڑکے نے ایسی گندی حرکت نہیں کی۔ اپنی محبت کو بونے پر حاوی نہیں آنے دیا اور کسی کی بکڑی کوزمین پر نہیں گرے دیا اور اس لڑکے نے اس کو سمجھا یا کہ مناسب وقت کا انتظار کر۔ پھر اس لڑکے کا بڑا بھائی اور بہنوئی کسی طرح بیرون ملک جانے میں کامیاب ہو گئے اور اور اچھی طرح سیٹل ہو گئے۔ پھر ایک دن طاقت ور خاندان نے معمولی سے جھگڑے پر باقی اس لڑکے کے باپ کو مراد یا تو وہ لڑکی مزید گھبراہٹ اور اس کو وہاں سے بھاگ جانے کا کہنے لگی۔ انتقام تو لڑکے کے دل میں بھی تھا مگر اس نے صبر کیا۔ پھر ایک دن اس لڑکے کی ماں کو اس کے پیارے چچا پتلا گیا تو اس کو سخت صدمہ ہوا کہ جس نے اس کے باپ کو قتل کیا وہ وہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہی دن اس سے ناراض رہی پھر ایک رات اس کی ماں کو ہارٹ ایکٹ ہوا۔ وہ لڑکا اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا پھر اس نے اس سے کہا میری خواہش ہے کہ تم میری بھانجی سے شادی کرلو اس نے وعدہ کر لیا۔

پچیس سال سن لینے کے لیے رکا۔
میں نے اس کو شکر اکر دیکھا، یہ کہانی مجھے بہت دل چسپ لگ رہی تھی۔
”پھر کیا ہوا۔“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔
”ہوا کیا آج وہ لڑکا جس بخاری تمہاری سامنے ہے۔“

”کیا وہ آپ سے تھمرے۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا مگر اگلے کیا ہوا تھا؟
”ہاں وہ میں ہی تھا میں نے ای کی بھانجی ماریہ سے نکاح کیا اور چپ چاپ ادھر لوکے آ گیا۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔“

”اور وہ لڑکی۔“ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔
یاد تھیں تو تھیں وہی تو تار ہا ہوں۔ یہ محبت والے اسنے جذباتی کیوں ہوتے ہیں، اس لڑکی کا نام مہرین تھا۔ ماریہ سے شادی کر کے میں بہت اداس رہا مگر اس نے آتے ہی سب کے دل جیتنے شروع کر دیے ای کی طبیعت خراب نہ رہی تھی۔ اس نے بہت خدمت کی میں سو جاتا تھا وہ ساری ای کے سر ہانے بیٹھی رہتی تھی اور اس

پاکستان جانے کو تو دل میرا بھی کر رہا تھا مگر فی الحال میں نے بطل کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چند دنوں تک میں پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے پاکستان میں بطل کو بتائے بغیر اپنے لیے چند دن کے لیے ایک فلیٹ اور کار کا انتظام کیا تاکہ مشکلات نہ ہوں۔

اور آج آٹھ سال بعد میں پھر واپس پاکستان آ گیا تھا اور آنے کی ایک وجہ بطل کی شادی تھی اور اس کا اصرار بھی تھا مگر ہم نے اس کو ناکارہ کر دیا تھا اور چلے بھی آئے۔ ہمارا ارادہ بطل کو سر پر اندوینے کا تھا۔

شادی کی تقریب انکل زیدی کے میں گھر تھی ہمیں جرائن بھی ہوئی کہ بطل کی شادی کی تقریب وہاں کیوں ہو رہی ہے۔ یہ کنفیژن وہاں جا کر دور ہوئی کہ ان کا مکان کافی بڑا ہو گیا تھا کیونکہ میں تو آٹھ سال بعد آیا تھا اور یہاں کافی تبدیلیاں ہوئی تھیں اور شاید اس لیے بطل کی شادی کا تفتیش وہاں رکھا گیا تھا کیوں بطل زیدی صاحب کا بھانجا بھی تھا اور دوسری وجہ یہ تھی ان کا گھر بالکل ساتھ ساتھ تھا، تمھو ڈالٹ ہو گئے تھے مگر تحریری بعد ہم مکان کے اندر تھے فی الحال ہم برکی کی نظر نہیں پڑی تھی جتنا تھا کہ نکاح کی تقریب شروع ہو چکی ہے ہم آپس کے نکاح کے رش کی جانب بڑھتے گئے میری کوشش تھی کہ میرا سامنا تارفہ سے نہ ہو میں انھی وہاں قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک مجھے زور دار آواز سنائی دی۔

”روشان تم، یہ روشان تم ہو بیٹا۔“
میں نے دیکھا تو خالد زہرہ کی اس کے ساتھ سب لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔
”ارے ہاں یہ روشان ہے۔“
”مگر کیا زندہ ہے۔“
”یہ کب مر گیا۔“

”طرح طرح کی آوازیں آئے گی تھیں۔“
ابھی میں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اپنے عقب سے نسوای آواز سنائی دی۔
”روشان تم؟؟؟“

اس آواز کو تو میں ہزوا اور میں پہچان سکتا تھا یہ تارفہ کی آواز تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا میرے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔

وہاں بھن کھڑی تھی گروہ تارفہ تھی۔
ابن کے لباس میں میری تارفہ تو گو با بطل کی شادی تارفہ سے ہو رہی تھی۔ تو کیا یہ تارفہ کی دوسری شادی تھی۔
”تارفہ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اس کی امی نے تارفہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔
مگر لگتا تھا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔

”روشان کیوں آئے ہو یہاں، کیوں بار بار ہماری زندگی کو بر باد کرنا چاہتے ہو۔“ تارفہ نے مجھے کہا۔

میں خاموش کھڑا تھا!!!
”بولو جواب دو خدا کے لیے مرنے والے ہو جاؤ، ہم نے سوچا تھا کہ تم مر گئے ہو، خدا کے لیے چلے جاؤ ہماری دنیا سے۔ وہ یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔
یہ سب سننے کے بعد میں اپنے آپ کو گھٹیت کر باہر کار تک لے آیا اور کار میں بیٹھ کر اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

فلیٹ میں آتے ہی میں فرش پر ڈھے گیا اور بے اختیار روئے لگ کے یہ سب کیا ہوا تھا اور دوسری شادی کا کیا چکر تھا اچانک میرے روم کا دروازہ نہ اٹھا۔
”کون۔“ میں نے ڈور کھولنے سے پہلے حیرانی سے پوچھا کہ ادھر کون آ سکتا ہے۔
”روشان بھائی میں عشرت ہوں۔ بطل کی بہن۔“ دروازہ کھولے۔

(عشرت، تارفہ کی بیٹہ سہیلی تھی اور ہم دونوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی)
جس پر میں نے دروازہ کھول دیا۔
”عشرت آنی آپ؟“

میں نے حیرانگی سے اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”جی بھائی بہت مشکل سے سراغ ملا ہے آپ کا اس بار آپ کو کھودتی تو نہ جانے پھر کب موقع ملتا۔“
”اچھا خیر تھی۔“ میں نے پوچھا۔
”یہ کیا حالت بنا رہی ہے تم ہاں اور کتنا بھاگو گے بھیا؟“

”جی اللہ تو پتا نہیں کسی کو اپنی بے گناہی کا احساس دلانا ہے کہ میں بے وفا نہیں تھا اچھا خیر یہ بتاؤ کہ یہ دوسری شادی کا کیا معاملہ ہے۔“

”تاہم زانیہ اپنی پہلی شادی کے بعد آپ کو بھول نہیں سکی وہ بھی کسی کی آپ نے اس کو جھوٹا دیا مگر اس معاملے میں عروشد کے خط نے ہماری مدد کی۔“

تاریخ زانیہ کی شادی کے بعد اپنے دن رات کے شب روز معاملات اپنی ڈائری میں لکھتی رہی جس میں آپ کا احوال ہوتا تھا بد قسمتی سے وہ کھر میں اس کی ساس کے ہاتھ لگ گئی تو اس نے فوراً ہی طور پر اپنے بیٹے کو کہا کہ وہ یہ ڈائری تازفہ کے ابو کے دکھائے اور اس کو طلاق دے۔ مگر میں نے اس کی ساس کے پاؤں پر کر معافی مانگی لی اور تازفہ نے خود خلع لے لی اور اس طرح شادی کے چوتھے ماہ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اچھی تو اس کے ہاتھوں سے ہندی بھی اتری تھی۔“

عشرت نے مجھے سسکایا لیتے ہوئے بتایا۔

”اور وہ عروشد کے خط کی کیا کہانی تھی۔“ میں نے آنسو روکتے ہوئے پوچھا۔

آپ کو بتاتا تھا کہ عروشد مذاق مذاق میں دوسروں کی لڑائی لڑوا کر انجوائے کرتی تھی۔ مگر ایک خالی بھی تازفہ کی وہ کہانوں کی جتنی بھی کسی نے اس کو بتا دیا کہ فلاں تمہارے بارے میں ہے بولا ہے تو وہ بنا تصدیق کیے اس سے بول چال بند کر دیتی تھی تو بس ایسا ہی ہوا۔ تم نے اپنے پیغامات کے لیے عروشد کو چنا اور تمہارے بولنے کا انداز اس طرح تھا کہ وہ کافی اس طرح سے پیچھے رہتی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو مگر جب تم نے انکشاف کیا تو وہ محبت کی انتہا تک پہنچ چکی تھی جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ پھر تم عروشد سے بات کرتے تو تازفہ کو ہار جازحہ کر تھاتی پھر جب اس کو معلوم ہوا کہ تم اس سے نہیں بلکہ تازفہ سے محبت کرتے ہو تو وہ جیسے مرئی گئی تو پھر تم نے اچانک سب سے رابطہ ختم کر دیا تو عروشد نے سوچا کہ اگر تم اسے نہیں مل سکتے تو وہ تازفہ کو بھی حاصل نہیں کرنے دے گی تو اس نے تازفہ کو تمہارے بارے میں اس قدر بھڑکایا اور پھر چونکہ وہ کانوں کی جتنی بھی اور کوہہ تم سے بدل ہو گئی پھر تازفہ کی شادی ہوئی مگر عروشد کو احساس ہونا شروع ہوا کہ اس نے کسی کی محبت چھین کر اچھا نہیں کیا تو اس احساس جرم میں بیکار پڑ گئی پھر ایک دن صبح اس نے اپنے آپ کو خود ہی شام تک کی ”بہت دلی کہہ کر اگر روشاں شام تک واپس آ گیا تو ٹھیک ورنہ وہ خودکشی کر

لے گی مگر تم نہیں آئے تو اس نے مرنے سے پہلے دو خط لکھے ایک تمہارے نام جو اس نے مجھے فون کر بتایا تھا کہ اگر کبھی تم واپس آ جاؤ تو تمہیں دے دوں مگر وہ خط مجھ سے تم ہو گیا تھا مگر جب اس کی موت ہوئی تھی تو میں نے پڑھا تھا تو اس میں اتنا لکھا تھا کہ وہ اپنے کیے کی سزا پارہی ہے اور شاید کسی کی محبت کو حاصل کرنے والے کا بھی انجام ہوتا ہے۔ ہو سکے تو روشاں مجھے معاف کر دینا۔ اور ایک خط اس نے تازفہ کو لکھا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ روشاں صرف تم سے بیکار کرتے تھے اور تم صرف دو تھے تیسری میں آ گئی۔ ہو سکے مجھے معاف کر دینا جب تازفہ کو حقیقت کا علم ہوا۔“

عشرت نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”مگر جب تازفہ کی شادی ہوئی تھی تو اس سے نکاح فارم پر دستخط کروانے کیا تو اس نے میری کوئی بات نہیں سنی کی اور وہ الٹا مجھے الزام دیتی رہی تھی۔“

”ہاں وہ اس بات پر بھی بہت ختمندہ ہے مگر آپ کی بد قسمتی ہے کیونکہ اس کی شادی کے بعد عروشد کو یہ احساس ہوا کہ اس نے اچھا نہیں کیا تب اس نے ساری حقیقت تازفہ کو بتائی مگر تم اس وقت یہاں سے جا چکے تھے۔ وہ تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی مگر تمہارا کوئی رابطہ نہیں تھا اگر کہیں تم مل جاؤ تو یہ خط آپ تک پہنچا دو اور اس کے علاوہ وہ تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی تھی۔“

”وعدہ!! کیسا وعدہ؟“ میں نے تیرائی سے پوچھا۔

”اس نے کہا تھا اگر تم نے شادی کر لی ہو تو ٹھیک ورنہ پلیز آپ کو ہماری محبت کی قسم شادی ضرور کر لینا۔“

”عشرت آئی یہ کیسا وعدہ لینا چاہتی وہ مجھ سے میں ایسا قطعاً نہیں کروں گا۔“

”روشاں یہ تمہاری مرضی مگر یاد رکھو اس نے تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دیا ہے اب چو اس تمہارے سامنے ہے محبت کا واسطہ یا تمہاری ضد اس کا فیصلہ تم نے خود کرنا ہے اور یہ لو تازفہ کا خط اس کو پڑھ کر مزید فیصلہ کر لینا۔“

”اچھا میں تازفہ سے خود ملنا چاہتا ہوں اس سے خود بات کرنا چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے اس کے ساتھ یہ حالات پیش آئے اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں ایک بار سے میری ملاقات کروادو۔“

”میں روشاں میں نے تازفہ کو کہا تھا کہ ایک

مرتبہ تم دونوں مل لو مگر وہ کسی صورت راضی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا مذہدار نہیں ٹھہراتی ہے۔ اس لیے تم سے بالکل نہیں ملنا چاہتی نہ بات کرنا چاہتی ہے اور بہتر یہی ہے کہ تم بھی اس کا خیال ذہن سے نکال دو اس کو بھول جاؤ اور جس نے تم کو بھولا دیا اسے بھول جانے کی دعا کرو۔“

عشرت نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے عشرت آپ کی میں کوشش کروں گا۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے روشاں بھائی میں چاہتی ہوں اپنا خیال رکھنا۔“

عشرت نے مجھ سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“

عشرت کے جانے کے بعد میں نے بے تالی سے تازفہ کا خط کھولا تو اس میں میرے نام چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

”روشاں مجھے حقیقت کا کچھ علم نہیں تھا جب علم ہوا تو میرا بچہ کچھ بھڑک چکا تھا۔ اب لفظ محبت سے بھی مجھے نفرت ہے سب مجھے دکھ لگتا ہے غریب لگتا ہے آپ کا اور میرا لفظ تقدیر میں نہیں تھا تم نے بھی درختوں پر رشم کے کیڑے کو دیکھا ہے جو اپنے ارد گرد ہی خول بنا تا ہے پھر اس کے اندر ہی پنچھن کر مر جاتا ہے بس میں بھی اس ہی رشم کے کیڑے کی طرح محبت کے خول میں پنچھن چکی ہوں جس سے رہائی ممکن نہیں اور نہ ہی تمہارے پاس واپسی ممکن ہے۔ بس اگر میری خوشی چاہتے ہو تو جیت کر جلد از جلد شادی کر کے اپنا کھر بسالو اور تم کو میری محبت کو واسطہ پلیز تم ایسا لازمی کرنا اور یہ بھی وعدہ کرو کہ جس صورت سے بھی سے بھی شادی کرو گے اس کو میرا اتمام دو گے اس سے میری طرح محبت کرو گے۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم وعدے کی پاسداری کرو گے۔“

یہ میرے لیے خط نہیں تھا بلکہ اس طرح کا سوچنا بھی سوچاں روح تھا اس طرح پریشانی میں میری آنکھ لگی۔ اتنی جگہ میں خالد اور انکل وغیرہ سے ملنا چاہتا تھا مگر اس گھر میں میرا جانے کو بالکل من نہیں کر رہا تھا جہاں سے تازفہ دوبارہ من بن کر گئی۔

☆☆☆☆

اب میری منزل دوبارہ یو کے ہی تھی۔ میں یو کے

پہنچ گیا جہاں مجھے شمس بخاری صاحب لینے آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ اب مطلق دوستی میں بدل چکا تھا۔

”ارے کیسا رہا تمہارا پاکستان کا سفر۔“ شمس صاحب نے گھر پہنچتے ہی بے تاب لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”بس کچھ نہیں ایک کئی ہوئے پتنگ کی طرح حالت ہو چکی ہے میری اور اب ایسے وعدے کی پاسداری کرنی ہے جو شاید میرے لیے ممکن نہ ہو اگر وعدہ نبھاتا ہوں تو تب بھی سوہان روح ہے اور اگر نہیں نبھاتا تو تب بھی مجھ پر قرض ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے شمس صاحب کو تازفہ کا خط بھی پڑھنے کے لیے دے دیا تاکہ ان کو پوری بات سمجھ میں آ سکے۔

”ارے یہ تو اچھی بات ہے اس نے بہت اچھا لکھا ہے۔“ انہوں نے خط پڑھ کر کہا۔

”میری آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ اچھی بات بھلا کیے ہوئی۔ میں اس کے سوا کسی ساتھ زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”روشاں تمہاری بات ٹھیک ہے محبت کے وعدے کو بھلنا میں نام لگتا ہے مگر اس نے تم کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر ٹریپ کیا ہے اور تمہارا بھلا سوچا ہے تاکہ تم یوں اکیلے در در نہ بیٹھو ایک مرد عورت کے ساتھ تو خود انام تو گرا سکتا ہے مگر اس کے بنا اکیلے پوری زندگی اکیلے کچھ میں نہیں گزار سکتا اگر وہ تم سے ایسے ہی کبھی کبھی شادی کر لو تو تم اس کی بات بالکل نہ مانتے مگر اس نے تمہیں دوسرے طریقے سے ٹریپ کیا ہے۔ اس لیے پلیز اس بارے میں ضرور سوچو۔“

”دلیکین شمس صاحب اچھی اتنی جلدی میں اس بارے میں کچھ نہیں کرنا چاہتا لیکن کوشش کروں گا تازفہ کے وعدے کی تکمیل کر سکوں۔“

☆☆☆☆

اس بات کو ایک ماہ گزر چکا تھا میرے معمولات زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں صبح اختصار نماز قرآن کی تلاوت کے بعد کام پر جانے سے پہلے تازفہ کے خط کو پڑھتا اور اسی خط سے معذرت کرتا کہ میں لے لے تمہارے وعدے کی تکمیل مانگن ہے پلیز مجھے معاف کرنا اور پھر کام پر چلے جاتا۔

ایک دن میں حسب معمول میں کام پر گیا تو شمس

صاحب نے مجھے بلا لیا۔
”کیسے بوروشان۔“

”سرخیک ہوں آپ سنا میں کیسے ہیں۔“
”میں تو خشک ہوں مگر تم نے شادی کا کیا سوچا۔“
”سر! ابھی تک دل میں کسی کی محبت کے زخم پر اسے نہیں ہونے کی محبت برسوں پر محیط ہے ان کے مراسم بہت پرانے ہیں یہ بس عشق کی پتی نصیلتیں تھیں جو ابھی پتی بنیں محض ورنہ ان کے خط سے دفا اور محبت کی جھلک نظر آتی ہے جو میں سرخ پر دھتا ہوں اور ہر رات پڑھ کر سوتا ہوں بس اسی دفا اور محبت کی جو جھلک نظر آرہی اس میں ہی جینا چاہتا ہوں۔“ میں نے بشکل اپنے آنسوؤں کو روکنے ہوئے جواب دیا۔

”روشان بیٹا دیکھو۔ تم خشک کہتے ہو اس طرح زندگی نہیں گزرتی اور کسی کے پھرنے سے محبت مرنو نہیں جاتی۔ یہ تو ایک حیل ہے اس میں عشق محبت وصل کے لئے ہوتے ہیں اور“ فلاسف فیڈرس نے کیا خوب کہا تھا کہ کھجور کی موجودگی میں کوئی عاشق بزدلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ مجھے عاشقوں کی فوج دو دہائیوں میں ساری دنیا ج کر کے دکھا دوں۔“ اور پھر تمہارا تو ابھی سب کچھ موجود ہے تم کیوں بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہو اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ کیا تم تارنہ کے وعدے کی تکمیل نہ کر کے اس کے پیار کو دھوکہ دے رہے۔“

”نہیں سر! میں اس کو دھوکہ..... نہیں سر قطعاً بالکل ایسی بات نہیں ہے۔“ روشان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے پریشانی نمودار ہوئی۔

”دیکھو بیٹا مجھے تم اپنے بیٹے اور چچے لٹے بیٹھے جیسے لگتے ہو مجھے اس لیے تم سے ہمدردی کی بانی تمہاری مرضی۔“

”میں بخاری صاحب سے میرا کیا رشتہ تھا کچھ بھی نہیں، مگر وہ ایک مخلص انسان تھے، ان کے اس پیار اور بے حد احترام پر شرمندگی بھی ہوئی مگر میں نے کہا تھا کہ سر میرا دل ماننا تھا تو رشتہ تلاش کرنے کا آپ کو کسی باتوں کا۔“

اس کے چند ماہ بعد شمس صاحب نے مجھ سے دوبارہ پوچھا تو میں خوب صورتی سے اس بات کو ٹال دیا تھا۔

ایک دن میں آفس میں بیٹھا اور بوس کی رو

ان کی فائل دیکھ رہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بج گئی
میں نے دیکھا تو اسکرین سرخس کا نام آ رہا تھا۔

”اسلام علیکم سر۔“
”روشان بھائی میں مارے بول رہی ہوں۔ ان کی بیگم! وہ شمس کو ہارٹ ایکٹ ہوا ہے آپ جلدی سے ہمارے گھر آ جائیں۔“
دوسری طرف سے مارے بھائی کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔

”اوہ! آپ ڈاکٹر کوفون کریں میں آتا ہوں۔“
”بی بھائی ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں بس جلدی سے۔“

”بی جی میں آ رہا ہوں۔“ میں نے ان کی بات کاٹ کر جواب دیا۔

میں تھوڑی دیر میں ان کے گھر پہنچ چکا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ان کا چیک اپ کر رہے تھے مارے بھیچا بھی ایک طرف کھڑی تھیں ان کی حالت کافی خراب تھی، میں نے جاتے ہی ڈاکٹر سے ان کی طبیعت کا پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا کہ ایک ناول ہوا ہے مگر یہ شکر ہے بھائی نے بردت فون کر کے مجھے بلا لیا اب میں نے ان کو آکسیجن لگا دی ہے تھوڑی تک ان کی حالت بہتر ہو جائے گی گھبراہٹ والے کوئی بات نہیں ہے بس بھائی کو جو صلہ دیں۔“

میں نے مارے بھائی کو جا کر سمجھانے لگا میرے سمجھانے پر ان کی حالت تھوڑی دیر میں سنبھل گئی میں اور ڈاکٹر صاحب دوسرے روم میں جا کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ وقفے کے بعد ایک لڑکی جائے کے دوپک لے کر اندر آئی میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا چہرہ ہی مہتاب کی طرح تھا میں اس کو گور سے دیکھنے لگا میں ایک لمحے کے لیے بھول گیا کہ سامنے ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے جلدی سے نظریں سے نظر ہٹا بیچی کر لیں، وہ لڑکی جاچکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم جائے کی فاراش ہی ہوئے تھے مارے بھائی بھائی ہوئی اندر آئی اور بولی کہ شمس کو ہوش آ گیا ہے۔“

ہم جلدی سے اندر چلے گئے۔ جیسے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ مسکراتے رہے پوچھنے سے لگے کہ۔“ آپ نے روشان کو کیوں تکلیف دی تو اس پر

مارے بھائی نے کہا کہ جب آپ کی طبیعت خراب ہوئی تو آپ نے فوراً روشان کا ہی نام لیا تھا فوراً اس کو ہی بلایا جائے۔“

ڈاکٹر صاحب نے چند ادویات دیں اور آرام کا مشورہ دیا جس میں نے کہا نہیں ہسپتال لے جایا جائے تو ڈاکٹر نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور پھر وہ اجازت لے کر چلے گئے۔

میں شمس صاحب کی طبیعت پوچھنے لگا ابھی میں ان سے باتیں کر رہی رہا تھا کہ اچانک وہی لڑکی دوبارہ آگئی اس نے آتے ہی شمس صاحب سے اداس لہجے میں پوچھا کہ شمس بھائی طبیعت کیسی ہے آپ کی۔“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اس کی آواز سن کر مجھے ایسے لگا جیسے میرے چاروں جانب کھٹکھٹوؤں کی چبکی کی بجائے آگ ہوئی۔

”جی مینا بس اللہ نے نئی زندگی دی ہے۔“ شمس کی آواز نے میرا سکتا توڑا۔

”روشان بیٹا یہ آپ کی بھائی کی بہن ہے ان کا نام مہتاب ہے اور یہ ہمارے پاس ہی رہتی ہیں، اور مہتاب بیٹا یہ روشان صاحب پاکستان سے ہیں اور میرے آفس اسسٹنٹ ہیں جن کی میں اکثر باتیں کرتا رہتا ہوں۔“ شمس صاحب نے ہم دونوں کا تعارف کر دیا۔

”جی اچھا! مہتاب نے میرا تعارف سن مجھ کو مسکرا کر سلام کیا۔ میں اس کے مسکراہٹ بھرے سلام میں ایک لمحے میں کھو گیا مگر کمرے میں دوسرے افراد کی موجودگی سے اس احساس چھپا تھا۔

میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا وہاں ان سب سے باتیں ہوتی رہیں۔ مارے بھائی اور مہتاب دونوں ہی بہت باتوں والے تھے مگر مہتاب تو دو قدم کچھ زیادہ ہی کی۔ خاصی تعلیم یافتہ تھیں اور گھر داری میں ماہر تھیں ان میں ان کے گھر میں برسوں کے بعد جی بھر کر مسکرایا تھا۔

شام کو جب میں شمس صاحب کے گھر سے کھانا کھا کر نکلا تو میں ان سب کے لیے انجینی نہ رہا تھا اور مہتاب میرے پورے دل و دماغ پر پوری طرح سوار تھی وہ میرے تصور میں مسکراتی ہی تھی ساتھ میں بھی گاؤں ڈا ریو کرتا ہوا مسکراتا جا رہا تھا۔

مگر جب میں اگلی صبح اٹھا تو معمول کے مطابق کا خط پڑھنے کے بعد مہتاب کا سراپا ایک بار پھر رائل ہو چکا تھا۔

چند دنوں کے بعد شمس صاحب ڈیوٹی پر بھی آگئے بقول ان کے اب ان کی طبیعت کافی بہتر ہے اس طرح ان کے ساتھ میری ہر روز تو ملاقات تو نہ ہوتی مگر کبھی کبھی ہو جاتی۔

ایک دن میں اپنے آفس کے کام میں مشغول تھا کہ میرے موبائل کی بیل گنگنا اٹھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر ”سرخس“ کا نام بگ بگ رہا تھا۔ یا اللہ خیر! میں نے جلدی سے فون رسیو کر لیا ہوا تھا۔

”روشان بھائی، آپ کی بھائی بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے مارے بھائی کی پریشان کن آواز سنائی دی۔

”ارے بھائی کیا ہوا سب خیریت۔“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”جی بھائی وہ آج پھر آپ کے بھائی کو ایک ہوا تھا اور ہمارے دینی ٹی ڈاکٹر ان کو ہسپتال لے گئے تھے ابھی وہ ابھی ہوتی ہے اور ابھی ان کو کچھ ہوش آیا ہے تو میں ان سے پوچھا ہے کیا روشان کو بلا لوں تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا کہ وہ بچے پریشان ہوگا، مگر میں ان سے چوری آپ کو فون کر رہی ہوں آپ کوئی بہانہ کر کے ہمارے گھر آ جائیں میرا دل بہت بھرا رہا ہے۔“

”خشیک ہے بھائی میں کوئی بہانہ کر دوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں اور میں انجی آتا ہوں۔“

میں تھوڑی کے بعد ان کے گھر موجود تھا مجھ سے دیکھتے ہی سب اور شمس صاحب یکدم پریشان ہو گئے کہ میں اچانک کیسے، لیکن چونکہ یہ پلان پروگرام تھا تو میں نے ان کو بتایا کہ میں ایک ضروری کام کے لیے جا رہا تھا تو میں نے سوچا کہ آپ سب سے ملتا جاؤں مگر آپ کے گھر میں ڈاکٹر کی موجودگی سب خیریت تو ہے نا بھائی۔“ میں نے سب کچھ بتا ہونے کے باوجود بھی انجان بنے ہوئے کہا۔

”ارے ہونا کیا تھا بھائی پھر ایک ہوا ہے تو شکر

ہے بھائی ساتھ تھی اور مجھے کال کر دی اور میں بروقت پہنچ گیا اور ان کی جان بچ گئی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔
”کیا مطلب جان بچ گئی کیوں گھر کیے۔“ اب میں نے بچ میں پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہ اپنی لئیے جان بچ گئی کہ اس دفعہ انیک کی نوعیت زیادہ بھی مگر بروقت فون کال آجائے کی وجہ سے میں جلدی آ گیا اور اس طرح ان کی جان بچ گئی مگر اب یہ شیش لاق ہوئی ہے اب ان کو یہ انیک کی بھی وقت ہو سکتا ہے اور اگر اس وقت ان کے پاس کوئی نہ ہو تو ان کی زندگی کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب پیڑیہ تو نہ کہیں۔“ ماریہ بھائی رو پاکی ہو کر راول پڑیں۔

چند لمحوں کے بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور میں شمس صاحب پر ناراضگی کا اظہار کرنے لگا کہ انہوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا مگر ان کا کہنا تھا کہ تمہاری بھائی تو کبھی رہی کہ روشان کو فون کر دیتے ہیں مگر وہ کسی بلاوجہ تکلیف نہیں دینا چاہتے اس لیے انہوں نے مجھے فون نہیں کیا۔

ان کی بات سن کر میں شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے شمس صاحب نے اندر کمرے میں جانے کو کہا جس پر میں نے ان کو سہارا دے اندر لے گیا تو وہ لیٹتے ہی مجھ سے بہت بخیرید کی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

”روشان بننا میں تم آج بہت بخیرید بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میری کوئی اولاد نہیں بس جب بھی پاکستان سے بہاول آئے تھے ماریہ کی بہن مہتاب بھی ہمارے ساتھ آتی تھی ہم نے اس کو اولاد کی طرح پالا ہے اور ہم اس کو نہ کھانا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنی نظروں سے دور کر کے پاکستان میں بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب میری طبیعت کا تم حال تم دیکھ رہے ہو میری زندگی کا کچھ بتا رہے ہو۔ میرا ساتھ سانس کی ڈور سے کب ٹوٹ جائے اور میں چاہتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے جانے کے بعد کوئی اپنے وطن اپنا کا ایسا ہو جو میری جیسی گھمنیال سے اور جو مہتاب کا چچو بن سکیں بن سکیں کہ مجھے آرام و سکون مل سکے۔“ شمس صاحب یہ سب مجھے بتاتے ہوئے گلو گئے۔

میں ان کی حالت پر ایک دم بالکل پریشان ہو گیا تھا میں تو یکدم انکا کر سکتا تھا اور نہ ہاں گھر اس وقت ان کی دل جوئی کرنا ضروری تھا تا کہ ان کا دل نہ ٹوٹے۔
”ارے نہیں شمس صاحب اللہ آپ کو لمبی زندگی دے آپ کی باتیں کر رہے ہیں۔ پیلیز آپ مایوس نہ ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دیں گے۔“ میں نے ان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”مگر بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔
”میں اب انکا تو نہیں کر سکتا مگر آپ جس طرح سے میرا خیال کرتے ہیں میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔“ آخر کار میں نے ان کی حالت دیکھ کر اپنی صند کا اڑدھاؤ حاشی دیا۔

”روشان مجھے کل ہی جواب چاہیے ورنہ میں پھر جلد از جلد اس کام کو کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ یہ نہ ہو کہ اگر میرا بلاوا آجائے تو میں سکون سے نہ جا سکوں۔“ شمس صاحب اداس مگر اہٹ کے ساتھ بولے۔

رات کی گھم گھم تباہی میں، میں اپنے فلیٹ میں لیٹا ہوا تھا اب جو تباہی مجھے سکون دیتی تھی اور مختلین اذیت دیتی تھی اب مجھے اس سے تکلیف ہونے لگی تھی اور پھر تار فک دیا ہوا وعدہ اور ساتھ شمس صاحب کا بڑھتا ہوا اصرار۔

☆☆☆

دوسرے دن میں نے شمس صاحب کو بنا شرماے ہاں بول دیا وہ میرے اس فیصلے پر بہت خوش ہوئے اور اتنی دعا میں دیں کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے ارد گرد دعاؤں کا حصار ہو۔

پھر چند دنوں تک شمس صاحب کے وہیں کے رہنے والے دوست احباب اور کچھ آفس کو لیگز نے مل کر میری منگنی کا اہتمام کیا اور تیس دن کے بعد میری شادی ہونا طے پائی اور اس میں مہتاب کی مرضی بھی شامل تھی۔

میں نے زندگی کے نئے سفر کو شروع کرنے کے لیے دوسرے دن شمس صاحب کے گھر سے تھوڑا فاصلے پر ایک اچھا سا گھر دیکھ لیا تھا اس کی تین و آرائش شروع کروادی تھی بھی اس طرح مہتابا پسند کیا رہا تھا اور بہت خوش تھا۔

☆☆☆

بالا آخر وہ صبح بھی آگئی جس دن میری شادی تھی آج میں اپنے نئے گھر میں موجود تھا کیونکہ میں پہلے مبینی کی طرف سے دیئے گئے فلیٹ میں رہتا تھا۔ کل سے میرے اس نئے گھر میں چوڑیوں کی کھکار کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز ہونے والا تھا۔

دو پہر تک میرے شمس صاحب کے اور وہیں کے رہنے والے دوست احباب اور کچھ آفس کو لیگز اور دونوں اطراف کے بارانی میرے گھر میں موجود تھے۔ ہم نے کچھ دیر شمس صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہونا تھا اور میں جانے سے پہلے آخری بار تار فک دیا ہوا وہ خط پڑھنا چاہتا مگر جب میں اپنی الماری کی طرف گیا چپاں سے کل آفس سے واپس آیا تھا اور سامان رکھا مگر اس میں مجھے تار فک کا خط نہ ملا۔

میں نے ساری الماری دیکھی، اپنا والٹ دیکھا مگر تار فک کا خط نہ ملا۔ میری پریشانی بڑھتی گئی کہ آخر وہ خط کہاں گیا۔ تو پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں کل آفس سے نکلا تھا وہ خط غالباً آفس میں ہی رہ گیا تھا۔ اب میرے دل میں کبھی بھی زندگی کے اس نئے آغاز سفر میں، میں نے وہ خط ہر حال میں لازمی پڑھنا ہے مگر اب ادھر سے کتنا مشکل تھا۔ میں نے شمس صاحب کو فون کیا کہ میں تھوڑی پریشانی میں ہوں پیلیز آپ میرے گھر آ جائیں۔

شمس صاحب کا گھر چونکہ ساتھ میں تھا وہ چند لمحوں میں آگئے مگر ان ساتھ ماریہ بھائی بھی تھیں ان دونوں کے چہرے پر پریشانی عیاں تھی کہ ہمیں میری شادی کی رائے تو نہیں بدل گئی۔

”کیا ہوا۔“ انہوں نے آتے ہی پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

”میں ہوا کچھ نہیں وہ میں نے بتایا تھا نہ کہ تار فک نے مجھے خط لکھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ شادی کرو تو اب میں چونکہ میں اپنے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کرنے جا رہا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں وہ خط آفس میں ہی بھول آیا ہوں، میں اس خط کو آخری بار پڑھنا چاہتا ہوں اور پھر جلد اپنا چاہتا ہوں تا کہ میں اپنی زندگی کا یہ نیکرا لکھ دوں اور نئے انداز سے شروع کر سکوں اور اس لیے میں نے آپ کو یہاں بلایا ہے آپ کی اجازت

لینے کے لیے۔ اگر اکیلا جاؤں گا عجیب لگے گا، ساتھ کسی آفس کو لیگ کو لے جاتا ہوں اور کوئی مہمانہ نہ کر کے ابھی آ جاتے ہیں۔“

”مگر بیٹا تم کس خط کی بات کر رہے ہو۔“ ماریہ بھابی نے پوچھا۔

”بھابی وہ آپ کو شمس صاحب بتا دیں گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا سے میں کسی کو تمہارے ساتھ روانہ کرتا ہوں اور تم یہ مہمانہ نہ کرنا کہ میں اسے بی ایم کارڈ بھول گیا ہوں تو تم کی ضرورت پر دست بردار رہے۔“

☆☆☆

”ارے کس خط کی بات کر رہا تھا، یہ لڑکا۔“ روشان کے جاتے ہی ماریہ نے اپنے شو بیکس سے پوچھا۔

”ماریہ بس چھوڑو۔ یہ جی کہانی ہے وہ تو میری مگر اس لڑکی کا بھوت ابھی تک اس کے ذہن سے نہیں اترتا۔“ مگر شمس ایسا تو نہیں کر اس کو ہمارے اس پلان کا پتا چل گیا ہو کہ تمہارا یہ سب انیک کا کہنا تھا ہو سکتا ہے اس کو کسی نے بتایا ہو۔“ ماریہ نے کہا۔

”اس کو کون بتائے گا ڈاکٹر بھی اپنا آئی تھی اور اس کو میں نے اچھا خاصا پیسا دیا تھا اور پھر انیک کو پلان اس وقت کیا گیا جب مہتاب گھر پر نہیں ہوئی تو کسی کو کیا پتا اور پھر تم نے تو کسی سے کچھ نہیں کہنا؟“ شمس نے پریشانی کے عالم میں ماریہ سے پوچھا۔

”ارے نہیں میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔“ ماریہ نے پریشانی کے جلدی سے کہا۔

”بس ٹھیک ہے اب دعا کرو کہ وہ جلدی سے یہ آجائے ورنہ سب چوٹ ہو جائے گا۔“

☆☆☆

ہمارا آفس سمندر کے ساتھ بالکل کنارے پر تھا اور ہم اس پر بیٹھ کر آنے والے بحری جہازوں اور مختلف جہیوں کی شیں، بولس کو روکنے کے احکامات جاری کرتے تھے۔ میں جیسے ہی سمندر کنارے پر بنے آفس میں داخل ہوا تو آفس کو لیگ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں شادی کے روز یہاں کھڑے تھے۔

”جی بس ڈیڑھ دوہ میں نے اپنا اسے بی ایم کارڈ بھول گیا تھا وہی لینے آیا تھا۔“ میں یہ کہہ کر

اپنے آفس کی جانب بڑھ گیا وہاں مجھے اپنی
الماری میں تار فکا خنٹ مل گیا۔

کچھ نہیں ہوگا اگر کچھ ہوا تو میں سب دیکھ لوں گا
یہ بھی اس وقت میرے سوا کوئی ٹیم کو گائیڈ کرنے

اچانک بوٹ مکمل طور پانی میں ڈوب گئی مگر ابھی
نے تار فر کورسی نہیں باندھی نہیں تھی۔

میرا سانس ٹوٹنے لگا تھا میں نے پھر جلدی سے اس کا بازو پکڑا اور جلدی سے اوپر لے جانے کی کوشش

اندھیرے درے

روحانے عبدالعظیم

اُس عورت کا قصہ بلاخبر جس نے گدی نشی کھیل بنا کر زن کھیل

وہ بار بار دروازے تک آتی اور بے چین سی
واپس پلٹ جاتی۔ سلطانہ باجی کی رُعب دار شخصیت
اور پاٹ دار آواز و انداز سے اُس جیسی تیز طرار لڑکی
بھی خائف تھی۔

سارا گاؤں کیا مرد، کیا عورتیں ہر کوئی اُن کا احترام
کر سکتا تھا۔ اُن کی بات بچہ پر نگہ کار درجہ رکھتی تھی۔
بیرجی الدین گدہ نشین کی اکوٹی بیٹی جو ان کے
چھوٹے بھائی غیاث الدین مرحوم کے بیٹے کی بیوی تھی۔
غوث علی شاہ پڑھے لکھے رحم دل انسان تھے۔
سلطانہ کے انداز انھیں سخت ناپسند تھے۔ سلطانہ سے
ان کی اولاد نہ تھی۔ تاپا نے خود ان کی شادی خاندان
میں کر دی تھی۔ دوسری بیوی فرخندہ دھیمے مزاج کی
سادہ سی خاتون تھی۔

سلطانہ باپ کی وجہ سے خاموشی پر مجبور تھی وگرنہ
غوث علی شاہ کو بہن کیسٹا نا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔
وہ کچھ بھی کر لیتی کوئی ان کے خلاف مہم نہ کھولنے کی
جرات نہیں کر سکتا تھا۔

وہ سب کی نظر میں ایک بڑی ہستی تھیں۔ بیرجی
الدین کی اکوٹی اولاد، باپ کی وفات کے بعد ہر سادہ و
سفید کی مالک۔ غوث علی شاہ کو حاکم کہلانے کا کوئی

کی روایت ہے جسے میں نے آج تک جاری رکھا
ہے۔ جمہرات کا دن اللہ اور اس کے مسکین عاجز
بندوں کے لیے باقی پورے دن مسئلے مسائل کے لیے،
جاواپس بھیج دے، کل آجائیں ساری، جو بھی مسئلہ
ہوگا دیکھ لوں گی۔ وہ سونے کے زیورات دیکھتی
اشارہ کر کے بولی تھیں۔

”جی اچھا۔“ گنبد دروازے کی سمت پلٹی۔
”اور سن؟“ پیچھے سے ان کی آواز آئی تو وہ

دوبارہ پیچھے پلٹی تھی۔
”جی باجی جی احکم“ وہی مسکین کی صورت۔
”پیغام دے کر جلدی آنا ذرا دیکھوں تو نیاز کی
دیکھیں پوری ہیں کہ نہیں۔“

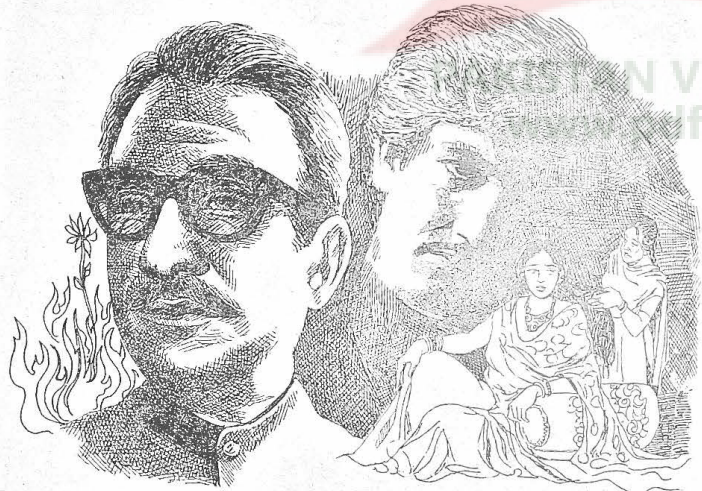
حویلی کے چھوڑے نائیوں نے بڑی بڑی
دیکھیں چڑھا کر ہوئی تھیں۔ جن کو چکھنا اور پورا جائزہ
لیتا سلطانہ نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ ویسے بھی وہی
حویلی کی کرتا دھرتائیں۔

غوث علی شاہ کو بیرجی مریدی سے کوئی دلچسپی نہ
تھی۔ اپنی ذات میں کم رہتے، گدی سنبھالنے کی باری
اب ان کی تھی مگر وہ مانتے نہ تھے اور سلطانہ ہر بار
انھیں طعنہ ضرور مارتیں۔ بزرگوں کی روح کو تر پانے کا
ذمہ دار قرار دیتیں اور دل ہی دل میں مطمئن بھی رہتیں
کہ اس گدی کے بہانے وہ ہر سادہ و سفید کی مالک بنی
بیٹھی تھیں۔ جودل چاہتا حکم جاری کرتیں۔ کسی کی مجال
نہ تھی ان کے فیصلے سے انحراف کرنے کی۔

”جو آپ کا حکم، میں بس گئی اور یوں آئی۔“ وہ
سر ہلاتی تیز تیز قدموں سے دروازہ پار کر گئی۔

انھوں نے سونے کے جھمکے پہنے، گلے میں مالا
ڈالی، انگوٹھیاں انگلیوں میں پہنی، سونے کے مونے
مونے کڑے پہنے، دو بند سر پہ جمایا، کندھوں کے گرد
شال پلٹی تب تک گنبد آ پہنچی۔

”چلیں باجی جی۔“ اُس نے ہاتھ احترام سے
آگے کر کے انھیں بڑھنے کی جگہ دی۔ وہ زمین کو گویا



قدموں سے رگڑتی، رونہی قدم بہ قدم چلے لگیں۔
حوہلی کے پچھوڑے گہنا بھی بچ گئی۔ سلطانہ بی بی
آگیں سلطانہ بی بی آگیں۔ رستہ خالی ہونے لگا، سر
بھٹک گئے۔ پھر جی الدین کی صاحبزادی کو سلامتی دی
جانے لگی۔ ہر کوئی سلام میں پہل کر کے برکتیں سمیٹتا
چاہتا تھا۔

ہر دیک میں سے سلطانہ نے چکھا، قبولیت اور
چندیدگی کی سند دی۔ ان کے ہاتھ سے پہلی نیاز بانی
گئی، پھر تو گو یا عید کا سال بندھ گیا، گاؤں کے غریب
سادہ لوح عوام انھیں دعا میں دینے لگے۔ وہ راستے
سے گزر کر حویلی آئی، دیو قامت آنسو داغی
دراز سے کی سمت جانے کے بجائے وہ بائیں باغ چلی
آئیں۔

”غیریت باجی جی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ
کی؟“، گینگنہ جوان کے ساتھ ہی حویلی میں برسوں سے
رہ رہی تھی۔ تشویش سے بولی۔ کیوں کہ وہ بہت کم اس
طرف آتی تھیں۔

”تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی
ہوں، مجھے اکیلا چھوڑ دو، کسی کو اس طرف مت آنے
دینا۔“ انھوں نے حکم دیا۔

”جیسے آپ کا حکم۔“ وہ حکم کی غلام سر ہلاتی تیزی
سے نیچے کو بھاگی تھی۔

”شکر ہے اس بلا سے تو جان چھوٹی۔“ انھوں
نے سکھ کا سانس لیا اور اسامہ فونی سامنے کر کے نمبر
ڈائل کیا۔ دوسری طرف تیل جاری تھی۔

اُن کا دل کسی نوخیز لڑکی کی طرح دھڑکنے لگا تھا
اور کیوں نہ دھڑکتا؟ وہ اُن کی پہلی محبت تھا، جو پہلی
بارش کی طرح ہر موسمِ خوشبو اور تازگی کی تصویر دیتا ہے،
دوسری طرف ہشاش بشاشی آواز ابھری تھی۔

”زے زے نصیب سلطانہ بیگم۔ ہم تو تمہارے لیے
تس کر رہے ہیں۔“

”مظفر خان ترسنا کیا ہے یہ مجھ سے پوچھو، باپ
کی محبت میں قربانی کا جانور بن گئی، سچ پوچھو آج بھی
میرے دل پر تمہاری شکرانی ہے، وہ مٹی کا پتلا غوث
علی شاہ، میرے پاتو جانوروں جتنی اہمیت بھی نہیں

اُس کی۔ بس مجبور ہوں، اپنے خاندان کی وجہ سے،
اپنے پرکھوں کی عزت کے خیال سے، تم کو سب
چیزوں سے باخبر ہو پھر کیوں میرا زخم تازہ کرتے
ہو؟“ وہ ہمیشہ کی طرح لاڈ سے بولی تھی۔

”زیادہ ڈرامہ بازی مت کرو سلطانہ بیگم! باپ
دادا کی عزت نے نہیں، غوث علی شاہ کی دولت نے
تمہیں مجبور کر دیا تھا، جیسے سیلانی صفت ہندے
سے تمہیں کیا مل جاتا۔“ وہ نوجوانوں کی طرح دل پر
ہاتھ رکھنے بنسا تھا۔

”تم کچھ بھی کہہ دو، اک تمہاری باتیں ہیں جو
بُری نہیں لگتی۔ تمہاری محبت مُندے زور بھی پر خاندان کی
بھلائی اور فائدے کے لیے مجھے قربان ہونا ہی تھا،
ذرا آ کر دیکھو تو سہی وہ دھان پان کی سلطانہ کیسے
پورے گاؤں پر اپنا حکم چلاتی ہے۔ کسی کے باپ کی
مجال نہیں کہ آٹھ اٹھ کر بھی دیکھے مجھے۔ میرے فیصلے
سے انکار تو بہت دُور کی بات ہے، یہ سب مجھے تم سے
مل سکتا تھا بھلا، اب وقت آ گیا ہے کہ سب سے
چھٹکارا کر میں تمہارے پاس آ جاؤں، بہت ہو گیا،
اب اور نہیں سہہ سکتی۔ میری ساری طاقت اور دولت
مجھ سمیت تمہاری محبت میں آدھ اسے بولی تھی۔“

”دیکھ لو تمہاری محبت میں اب تک کنوارا ہوں۔“
ایک جاندار تہمت لگا یا تھا اُس نے۔ سلطانہ کی روح
سرشار ہو گئی۔

وہ گاؤں کے اسکول سے میٹرک کا امتحان دینے
جاتی تھی۔ مظفر جو ہر خوب صورت جگہ پہنچ جاتا تھا۔
گاؤں کی خوب صورتی دیکھنے آ جاتا تھا۔ وہ مصور تھا،
شاعری اور حسن کا دلدادہ، سلطانہ کی گاڑی سے نکلایا
تھا اور یہ تصادم دونوں کو پاس لے آیا، اس کا گھر بار نہ
تھا، بھی ایک شہر میں رہتا تو بھی کسی دوسری جگہ، نہیں
ایک جگہ ٹکنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

باپ کیسے کارسریض تھا تو عدم توجہ اور پیسے کی کمی کی
وجہ سے وفات پا گیا۔ یوں وہ اگلوے غوثی رشتے سے
بھی ہاتھ دھو بیٹھا، سیما فطرت کو کوئی فرق نہ پڑا بلکہ
اب تو آوارہ گردی کو مزید موقع ملا۔ وہ مونجی کا بیٹا تھا
اور سلطانہ کرودوں کی مالک، ایک خاندانی گدی نشین

فصل کی اگلوئی بیٹی۔ بے تحاشا محبت کے باوجود بھی
سلطانہ اس واضح فرق کو غوثی بیٹیاں تھیں۔ اپنی وجہ سے
چرچی الدین کا سر نہیں جھکا جاتا تھی۔ یوں وہ غوث
علی شاہ کے نکاح میں آ گئیں۔ شادی نے بھی اُن کی
محبت کو دُور نہ ہونے دیا، راپٹے کا ہر ذریعہ درمیان میں
رہا، ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں، قسمت اچھی تھی کہ غوث
علی شاہ سے ان کی اولاد نہ تھی۔ باپ اب رہائیں تھا۔
وہ آسانی سے جان چھڑا کر مظفر خان سے شادی کر سکتی
تھیں، اس تعلق سے مظفر کو بھی فائدہ حاصل تھا۔ وہ
جب چاہتا سلطانہ سے فراموش کرتا اور یوں موتی نکلتی
رہم اور نکل لے کر ملکوں ملکوں گھومتا، اندرون ملک کے
علاء ہیروں ممالک کی بھی سیاحت کرتا، اچھا پہنتا اچھا
کھاتا، سلطانہ سے محبت اس کی لاٹھی تھی۔

وہ آسے ناراض کر کے کیوں اس لاٹھی سے ہاتھ
دھوتا، کوئی بے وقوف ہی ہوتا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر
بیٹھے آئی دولت کو کھڑک لگاتا، اپنی چینی چیز کی باتوں سے
اُس نے سلطانہ کو پوری طرح بھی میں جکڑ رکھا تھا۔
”ہمیں ملے بہت وقت ہوا۔ سلطانہ بھر کب
ملو گی؟“ مظفر نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ضمیر نے طعنہ دیا سرزنش
کی۔ پھر جی الدین کی بیٹی تھیں یہ تمام زیب دیتا ہے،
تم کیا ہو اور کیا دکھائی دیتی ہو؟ مگر دل نے ضمیر کی نہ
سننے دی اسے جب تک کھڑا دیا اور سینہ تانے کھڑا ہو گیا
بچے کی طرح چل کر منہ بسورے ضد کرنے لگا۔ وصل
..... وصل وصل !!!

”بہت جلد۔ اور دعا کرو، پھر دُوری درمیان
میں نہ آئے۔“ اپنی ہی لے میں بولی تھیں۔
”میں انتظار کروں گا۔۔۔۔۔ اپنی آخری سانس
تک !!!“ مظفر نے سُر پھونکا اور سلطانہ بچتر بن گئی
تھیں۔

”جی دیکھا ہے تو نے عشق میں دھان کا عالم۔
بس تو بی تو، تو بی تو اور تو بی تو کا عالم
مگر یہ عشق تو نہ تھا۔
زقوم کا درخت تھا۔ کروا کیا۔ اک سزا۔“

☆.....☆.....☆

آج بیٹے کا بابرکت دن تھا۔ حویلی کے احاطے
میں بڑی سی نشست پر سلطانہ کی ریاست کی ملکہ بنی
بیٹھی تھیں۔

آج کے دن وہ گاؤں کے سادہ لوح عوام کو درس
دیتی تھیں۔ ایک جہوم ان کے آگے سر جھکانے ادب
سے بیٹھا تھا۔

زیادہ تعداد غورتوں اور کم عمر لڑکیوں کی ہی تھی،
مرد خال خال تھے۔
”جیسا کہ آپ سب جانتے ہو آج میرا پسندیدہ
موضوع بیان ہوگا، یعنی پردہ۔ اور میں اس بیان میں
سورۃ نور سے ٹھوڑا حوالہ بھی پیش کروں گی، تاکہ آپ
سب خواتین کو معلوم ہو، قرآن میں پردے کا کیا حکم
ہے؟“ ان کی بات پر سارے جہوم کے جھکے سر ہلے
تھے۔

وہ آت مکمل کر کے اب سمجھائی جا رہی تھیں ساتھ
میں حدیثوں کے حوالے بھی شامل کرتی اور سارے
سادہ لوح بے علم لوگ سر دھتے بے شک، محبوب بیٹھے
تھے۔

”امید ہے آج کی نشست سے آپ لوگوں کو بہت
کچھ جاننے کا موقع ملا ہوگا۔“ وہ شال سنبھالتی تھیں۔
”گینگنہ؟“

”جی باجی جی! حکم؟“ وہ فوراً آ گئی۔
”سوغات تفسیر کرو، ہر ایک کو ملے کوئی خالی ہاتھ نہ
جائے حویلی سے۔“ وہ حکم دے کر آگے بڑھ گئیں۔
جہوم میں بے ساختہ خوشی کی لہر دوڑی تھی،
سارے با آواز بلند سلطانہ بی بی کو دعا میں دے
رہے تھے۔ یہ آوازیں ایک نیم فائدہ وجود کے دماغ
پر ضرب کی طرح پڑ رہی تھیں۔
اُن ادھ کھلی آنکھوں سے آنسو بہہ کر نکلتے میں
جذب ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆
راہداری سے گزرتی سلطانہ بیگم شکر کر زکی
تھیں۔ داخل دروازہ کھلا تھا اور اُس پارے مظفر نے
اُن کو آگ لگا دی تھی۔
تیس سالِ خوب صورت سی نازک سی فرخندہ بنی

مضی غوث علی شاہ کے قریب کھڑی ان کے کندھوں پر پیار سے ہاتھ ڈالے۔ اٹھلا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ اور وہ مسکرا کر اُسے دیکھ رہے تھے۔

(ہونہر بالوں میں چاندی اتر آئی، مگر کرم عمر بیوی سے محبت کا بخار نہ اتر سکا، کبھی مجھے تو اتنی محبت سے دیکھا نہیں؟ ہونہر مجھے ایسے انداز اور ایسی ادائیں بھی کہاں آتی ہیں؟) وہ خود ہی سے سوال اور خود ہی سے جواب دے رہی تھیں۔

رقابت یونہی آگ لگاتی ہے وگرنہ وہ سوچتی تو بہت مشکل سے کوئی ایسا لیتا جب وہ غوث علی شاہ کے قریب کھڑی ہوں یا اُن سے محبت سے بات کی ہو۔ غوث علی شاہ کو رخصت کر کے فرخندہ مسکرائی ہوئی اندر داخل ہوئی تھی سامنے سلطانہ کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ سبٹ گئی۔

بہت پر پرزے نکل آئے تمہارے..... کہاں تو شروع شروع میں دو پند منہ میں دالے بھی تھے ہی اس حویلی میں پھرتی تھی، لگتا ہے مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا۔“ سلطانہ تھخڑا اڑاتے ہوئی لگی۔

”بیوی ہوں میں غوث علی شاہ کی۔“ وہ ذرا کمزور پڑی تھی، مقابلے میں سلطانہ جیسی شخصیت کا ہونا کوئی عام بات نہ تھی، ان کی ذات میں کوئی عجیب سی طاقت اور کشش تھی۔

”ہونہر بیوی!“ سلطانہ تہقہہ لگاتی سر جھٹکتے مذاق اڑاتے ہوئی تھیں۔ ”بی بی اس بھول میں مت رہنا، سارے پر کاٹ ڈالو گی، تم مجھے ابھی سچ طرح سے جانتی نہیں۔“ جیرجی الدین کی بیٹی ہوں میں..... پورے خاندان میں ہمارے ہم پلہ کوئی نہیں نہ دولت میں اور نہ منصب میں..... تم اگر میری سوتن بنی ہو تو صرف میرے بابا جیرجی الدین کی وجہ سے، وگرنہ تم میں سے ہی کیا سوائے خوب صورتی کے؟“ سلطانہ طیش میں آگئی تھیں۔

مارے تو تین کے فرخندہ کا چہرہ منگ اٹھا۔ (تم میری بیوی ہو کسی سے بننے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں کوئی پتھر اٹھائے تو تم اینٹ اٹھائیں، کمزور پڑنے کی ضرورت نہیں، سلطانہ طاقت ور سہمی، پر میری بیوی ہے ماں نہیں، تم پر میری ماں کی اطاعت فرض ہے کیوں کہ وہ

ہتی آپ کی سوچ سے بھی زیادہ طاقت ور اور بڑی ہے۔“ اُس نے ہمت کر کے جواب دیا تھا۔

سلطانہ وہاں سے بغیر جواب دیے جا چکی تھی۔ فرخندہ نے اپنے بازو سے آستین ہٹا کر دیکھا، وہاں سلطانہ کی انگلیوں اور انگوٹھیوں سے نکل پڑ گئے تھے۔ تکلیف کی زیادتی سے اس کی آنکھیں جھجک گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ سلطانہ مظفر خان کے کھٹکالے منہ سے پڑ رہی تھیں اور شرارتی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ”ہاجی جی! دروازہ کھولیں باجی جی۔“ گنگینہ اونچی آواز میں صدادتی دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔

”کیا آفت آگئی..... کسے موت آگئی جو یوں دادیلا جا رہی ہے کہیں۔“ وہ کس میں سارے کھٹ ڈال کر بند کر رہی دروازے تک آئی اور دروازہ کھولا۔ سامنے حواس باختہ گنگینہ کھڑی تھی۔

”بگو، کیا بات ہے؟“ وہ کھٹ کھٹانے کو دوڑیں۔ (جیری کا غش جو کہیں کا نہ رہنے دے، بے جا رہی سلطانہ)

”وہ بڑی بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے، میر صاحبہ۔ ان کے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں، جلدی آئیں۔“ اُس نے پھولے لائیں کے درمیان بات مکمل کی۔

”تو یہ کون سی بات ہے، جو تم نے اتنا شور مچا رکھا تھا، بڑی بی بی کی طبیعت تو روز خراب ہوتی ہے اور وہ منٹ میں پھر سے سنبھل جاتی ہے۔ یہ تو روز کا ڈرامہ ہے۔ سارے بوڑھا ستیا ناس کر دیا۔“ غصے سے کہہ کر انھوں نے گنگینہ کے سر پر پھیاری ہاتھ مارا اور بگڑے تیوروں سے شال تھیک کرتی باہر آئی تھیں۔

بڑے کمرے میں غوث علی شاہ اپنی پیار منظر دار مال کے پاس بیٹھے ان کا ہاتھ سہلارہے تھے۔ بڑی بی بی جو فاقہ کش تھیں بہت مشکلوں سے انھیں کچھ بتانے کی کوشش میں تھی۔

(یہ اور بات کہ غوث علی شاہ ان کے اشاروں کنایوں میں ہی باتوں کو سمجھ نہ سکے تھے، وہ ہر بار سلطانہ سے بے زاری ظاہر کرتیں اس کی شکایت

کرنے کی کوشش کرتی تھیں) ”کیا ہوا بڑی بی بی کو؟ کیا بہت طبیعت خراب ہے۔“ سلطانہ اندر داخل ہو کر تشویش اور فکر مندی سے بولی تھیں۔

”اب طبیعت بہتر ہے، میں نے دوا کھا دی ہے۔“ وہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ سلطانہ نے غوث علی شاہ سے نگاہیں ہٹا کر پاس کھڑی فرخندہ کو ناگوار انداز سے دیکھا تھا۔

”آپ نے آج پھر بڑی بی بی کو دو انہیں کھلائی۔ بہت انہوں ہوا۔ آپ تو بہت ذمہ دار طبیعت کی مالک ہیں پوری حویلی کے معاملات خوش اسلوبی سے چلا رہی ہیں۔ پھر کیوں آج کل آپ سے اس معاملے میں کوتاہیاں ہو رہی ہیں؟ آپ جانتی ہیں مجھے اپنی ماں سے کتنی محبت ہے، اور مجھے آپ سے زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں، ابھی ان کی ذمہ داری آپ کو دے کر میں باہر کے کام مطمئن ہو کر سنبھال ہوں۔“ وہ دکھ سے بولے تھے۔ سلطانہ تھوڑا سا شرمندہ ہوئی تھیں۔

آپ جانتے تو ہیں، اتنی بڑی حویلی کے انتظامات مجھے ہی سنبھالنے پڑتے ہیں۔ پھر گاؤں کے لوگوں کے معاملات، ہر آگے لگنے کا خیال، بس صبح سے جو مصروف ہوتی ہوں تو سنبھالنے کی بھی مہلت نہیں ملتی، وگرنہ آپ جانتے ہیں۔ پیچھے ہیں برسوں میں، میں نے کیسے ہر کام سنبھال رکھا ہے، اس بات کے آپ بھی گواہ ہیں۔“ کون سا مہرہ کس دقت کیسے استعمال کرنا ہے یہ سلطانہ سے بہتر کون جانتا تھا۔

غوث علی شاہ قائل ہو گئے۔ ”یہ تو میں جانتی ہوں، تاہم جیرجی الدین مرحوم نے اس حویلی کے لیے بالکل آپ کا انتخاب کیا تھا، اپنے پڑھوں کی ہر روایت کو آپ نے اب تک زندہ رکھا ہے، آپ کی ذہانت کا تو سارا گاؤں گواہ ہے۔“ وہ غصہ سے بولے۔

سلطانہ اُن لوگوں میں سے تھی جو سامنے تو غرور کی طرح بیٹھے ہوتے ہیں، مگر وارہ ہمیشہ پیچھے ہٹ کر قائل ہوتے ہیں، اُس نے بھی ساری زندگی گڑبگ میں

غوث علی شاہ کی جڑیں کھائی تھیں۔

وہ معصوم سادہ سے انسان سلطانہ کے دوسرے مکروہ روپ سے ناواقف تھے۔

”شاہ صاحب اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک بات عرض کروں؟“ فرخندہ نے بالآخر خاموشی کو توڑا۔

”بولو... بابا اجازت کی کیا بات ہے۔“ وہ محبت سے بولے تھے۔

”میں سارا دن فارغ رہتی ہوں، اگر بڑی بی بی کی ذمہ داری مجھے دی جائے تو میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔ بزرگوں کی خدمت ہی ہمارے خاندان کی شان ہے۔“ وہ اپنا بیٹے سے بولی تھی۔

”بات تو سو فیصد درست تھی تم نے فرخندہ! آپ کیا کہتی ہیں؟“ وہ اب سلطانہ کی سمت متوجہ ہوئے۔

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“ اندر سے اُس کی چالاک پر تلملائی مگر بظاہر مسکرا کر بولی تھیں۔

”تو بھیک ہے فرخندہ اب تم نے بڑی بی بی کی خدمت کرتی ہے۔“ ان کا خیال رکھتا ہے۔ سلطانہ نے استے برسوں میں اچھی طرح اپنی ذمہ داری پوری کی

اب اسے آرام ملنا چاہیے۔“ وہ مسکرائے۔

”بڑی بی بی نے خوش ہو کر ہاتھ بڑھانا چاہا کچھ بیماری کی نقابت، ہاتھ واپس پیچھے جا بڑا غوث علی شاہ نے محنت سے تمام کمر اپنے سر پر رکھا اور ان کی دعائیں لی تھیں۔“

سلطانہ جیسی بلا سے ان کی جان چھوٹی تھی، وہ جتنا خوش ہوتیں کم تھا۔ فرخندہ نے آگے بڑھ کر سر نیچا کیا،

بڑی بی بی نے محبت سے ان کا سر چومنا۔

وہ سیدھی ہوئی تو جتنی نظروں سے سلطانہ کو دیکھا، ان کی تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”تمہارا تو اب کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا، پر لمبے کر لیے ہیں، اس سے پہلے کے اوجھی اڑان بھرو، تمہارے پر کاٹ کر تمہیں اڑنے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گی، تب تمہیں یاد آئے گا اور چھپتا دوگی، سلطانہ سے دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی فرخندہ

تیکم۔ غوث علی شاہ کمرے سے نکل گئے فرخندہ بھی

ان کے پیچھے گئی تھی۔

”تم جاؤ میں میں ابھی آتی ہوں۔“ سلطانہ نے گھنٹہ کو حکم دیا وہ فوراً سر ہلاتی چلی گئی تھی۔

سلطانہ قدم قدم چلتی بڑی بی بی تک آئیں۔ انھوں نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

”کس حال تک پہنچ گئی ہو تم بڑی بی بی، مگر اڑو ویسے کی ویسے ہی ہے۔“ افسوس کہ تم بول نہیں سکتی ہو، اگر بول بھی لیتیں تو میرا کچھ نہیں بگڑتا، کون تمہارا یقین کرتا؟ میں جو کرتی ہوں بڑی صفائی سے کرتی ہوں، اپنے بیٹے اور نام نہاد بھوکے دُغم میں یہ مت سمجھنا تم مجھ سے میری طاقت چھین لوگی۔ وہ دونوں میری بساط پہ کچھے مہرے ہیں۔ جب چاہوں، انھیں پیٹ سکتی ہوں۔ شاد و رات میرے ہاتھوں میں ہے، آخری بار کہہ رہی ہوں میرے راستے میں مت آؤ، کم زور ہو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“ نہیں تو تمہیں ختم کرنے میں مجھے کیلند بھی نہیں لگے گا۔“

ان کی آخری بات نے بڑی بی بی کو کپکپا کر رکھ دیا اور منہ ان کی طرف موڑ کر دیکھا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔

”افسوس اور ملامت کے آنسو۔“ ان کے خاندان میں ایسی زہریلی ناگن کیسے پیدا ہو گئی تھی۔

”گھینہ، مٹی کو بلاؤ، مجھے کچھ ضروری حساب کتاب کرنا ہے۔“ سلطانہ بہت جلدت اور بے تابانی میں نظر آ رہی تھی۔ گھینہ سر ہلاتی تیزی سے گئی تھی اور پندرہ

میں منٹ بعد نشی سمیت واپس آئی تھی۔

”کھڑکی میں کھڑی سلطانہ نے مٹی کو دیکھا تو شال درست کرتی نیچے باغ کی طرف آئی تھیں۔

”تم جاؤ۔“ گھنٹہ کو حکم ہوا وہ چلی گئی۔

”سلام بی بی جی۔“ وہ ہاتھ باندھے سر جھکائے کانپتے ہوئے بولا۔

(جانے حساب کتاب میں پھر سے کیا غلطی ہوئی جو انھوں نے اتنی جلدی پیش کی کے لیے بلایا تھا؟) اُس کا ڈر سچا تھا۔

”تم سے ایک ضروری کام تھا، تمہارے سوا کسی

پرہیز کرنے کو دل نہیں مانا، امید ہے میری توقع پر پورا اڑو گے، کام بڑا ہے، راز داری شرط۔ بڑے کام کا بڑا معاوضہ بھی دوں گی۔ اگر کر سکتے تو؟“

سلطانہ نے ہاتھ پٹا کیا۔

وہ بے چارہ غلام تھا انکار کر کے موت کو گلے لگانا تھا کیا۔ نوراجی بھری۔

جو آپ کا حکم، جان مانگیں گی تو وہ بھی حاضر ہے، برسوں آپ کا نمک کھایا، آپ کے کام نہ آ کر نمک خراں ہوئی کرتی ہے۔“ وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔

”یہ تو تم نے سولہ آنے درست بات کی ہے، کام ہی بڑی راز داری والا ہے۔“

”آپ حکم کریں؟“ وہ ان کی بات پر نہایت ادب سے بولا تھا۔

”غیر غوث علی شاہ کی دوسری بیوی فرخندہ کا چچا زاد، جو اس کے بچپن کا منگیتر بھی تھا معظم علی... مجھے اُس سے ملنا ہے۔“ مگر یہاں۔۔۔ حویلی کے حدود سے

زور اور ادب سے ملاقات جتنی جلدی ہو، اتنی ہی اچھی بات ہوگی، بولو، انتقام کرو گے؟“ وہ جھکے ہوئے۔

”خیر تم تو بے بی بی! معظم علی سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟“ وہ ہنسنا یا۔

”حد میں رہو... یہ مت بھولو کہ تم ہمارے غلام ہو اور غلام بالوں سے سوال نہیں کرتے۔“ وہ حسب عادت غلطی میں آ گئی تھیں۔

”غلطی ہوئی بی بی... معاف کر دیں۔ آپ کا حکم آ نکھوں پر،“ وہ گھبرا کر بولا تھا۔

”کیا آج دو پہر تک ہو جانا چاہیے۔“ وہ کہہ کر جانکجی میں۔ شامت مٹی کی آگئی اگر غوث علی شاہ کو

جنگ بھی پڑ جائی، اس کا زندہ بچنا ممکن نہ تھا۔

☆☆☆

”بلے کی آگ میں جلنا کیسا ہے، مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا معظم علی۔“ بچپن کی لگائی کو ذرا سی غلامی چٹپٹاش کی وجہ سے توڑ دینا چھوٹی بات نہیں۔

تمہاری غیرت اور عزت کا سوال تھا، تم تو پھر اچھے تھے کہ بزرگوں کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی گئے، اب بھی رات ہے، میرا ساتھ دو گے تو وہ کبھی کسی کا گھر

نہ بسا پائے گی، تمہیں اجازت دیکھا وہ کیسے خود سے بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ مٹی خوش رہ سکتی ہے۔“ سلطانہ اُسے بھڑکانا چاہتی تھی، وہ تو جیسے پہلے سے ہی جلتے تو بے پروا بننا تھا۔

”ایسا بدلوں کا اُس سے اور اس کے بھائیوں سے کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“ اس کے منہ سے آگ لگی تھی۔

سلطانہ کے کچھے میں ٹھنڈا آڑ آئی۔

”تمہیں خود کو بلکان کرنے کی ضرورت نہیں میں جو کہوں بس اُس پر عمل کرتے جاؤ، باقی سارا کام میرا دیکھنا ہے۔“ دُغم میں اُسے اور اُس کی ہنستے ہنستے گھر کو اجاڑتی ہوں۔“

”آپ واقعی ایک بہادر اور ذہین عورت ہیں، جتنا سنا تھا اُس سے بڑھ کر پایا ہے۔“ وہ متاثر نظر آیا۔

میرے ساتھ مل کر کام کرو گے تو تمہاری ذہانت دو چند ہو جائے گی۔“ ان کی بات پر معظم علی نے قہقہہ لگایا تھا۔

☆☆☆

فرخندہ کی حرکات و سکنات آج کل غوث علی شاہ کو دل چل چوکا رہی تھیں۔ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی رہنے لگی تھی۔ اکثر ایسے بڑے بڑا جیسے اچانک اُسے نیند سے بیدار کیا گیا ہو، سلطانہ نیلی جلا کر اب خاموشی سے تیل کی دھار دیکھتی جا رہی تھیں۔

وقت آنے پر انھوں نے اپنا حصہ بھی ڈالنا تھا مگر فی الحال وہ خاموش تھیں۔

آج بھی وہ غوث علی شاہ کے ساتھ ناشتا کر رہی تھیں۔ فرخندہ کافی دیر سے فون پر کسی سے بحث کر رہی تھی۔

آواز تو اتنی دور سے سنائی نہ دے رہی تھی مگر اس کی حرکات اور چہرے کے زاویوں سے معلوم پڑ رہا تھا۔

”دیکھیں تو ذرا آج کل اس کے کچھ زیادہ ہی فون نہیں آنے لگے؟ جب دیکھو فون پر لگی رہتی ہے یا کسی نہ کسی بہانے حویلی سے نکل پڑتی ہے۔ آپ

معلوم تو کریں خیریت ہے؟“ وہ شیطانی سے کہتی آخر
میں فکر سے بولیں۔ ان کی بات نے غوث علی شاہ کو
سوچ میں ڈال دیا۔
”مجھے بھی یہ آج کل کچھ بدلی ہو رہی ہے۔
کافی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں، سوچتا تھا شاید
میرا وہ ہم ہو۔“ تیر نشانے پر لگا تھا۔ ڈانگ ٹیل سے
لاؤنج میں رکھا ہوا اور لگہ و لگھائی دے رہی تھی،
وہ فون رکھ کر چہرے پر ہاتھ پھیرتی خوفزدہ سے انداز
میں دائیں بائیں دیکھ کر ماتھے کے لیے جھلے نظروں
سے سلام کر کے سلطان کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔
”خیریت؟ کس کا فون تھا؟ اور تمہاری رنگت
کیوں پتلی پڑ رہی ہے؟“ غوث علی شاہ کا انداز
تشویش بھرا تھا۔

”نہیں تو..... خیریت ہی ہے..... کیا ہونا ہے
مجھے؟“ وہ منہ پر ہاتھ دھرتے خوفزدہ ہوئی۔
صاف لگ رہا تھا وہ کچھ چھپانے کی کوششوں میں
ہے۔ بھلا انہی سے زیرک عمر رسیدہ شخص سے کیسے کچھ
پوشیدہ رہتا۔ سب صاف صاف نظر آ رہا تھا۔
”فون کس کا تھا؟“ اب کی بار ان کا لہجہ بدل
چکا تھا۔

سلطان کا جی چاہا تھقبے لگا کر خوشی منائے مگر لب
بھینچ گئیں۔
”وہ..... میری سہیلی تھی۔“ اُس نے خشک
ہوتے لبوں پر زبان پھیر لی تھی۔ گناہ گار نہ ہوتے
ہوئے بھی وہ گناہ گار ثابت ہو رہی تھی، موت کا مقام
تھا، مگر وہ بے بس تھی۔

”کون سی سہیلی، جھپٹے دو سالوں میں مجھے یاد
نہیں پڑتا تمہاری ایسی کوئی سہیلی تھی جو تھیں دن
میں کئی کئی بار فون کرے؟“ خشک کے ناگ کو
موقع مل گیا تھا۔ غوث علی شاہ کو دل پڑ رہا تھا اور
ٹھیک وقت پڑ رہا تھا۔

وہ بے میری ایک سہیلی، بچپن کی دوستی ہے، کافی
عرصہ سے ہمارا رابطہ نہیں تو اب اکثر ہم بات کر لیتے
ہیں۔“ اُس سے بات بھی ٹھیک سے ہوئیں باقی۔
”بات کہاں کرنی ہو؟ مجھے تو لگتا ہے بس جھگڑتی

ہی رہتی ہو۔“ سلطان نے پتا چھینکا۔
فرخندہ کی رہی سہی بھی ٹوٹنے لگی۔
غوث علی شاہ نے جواب میں کچھ نہ کہا کرسی
دھکیلتے اٹھے اور بغیر ناشائے چلے گئے۔
فرخندہ بمشکل آسوسٹھ کرتی اوپر کمرے کی
طرف بھاگی تھی۔ سلطان نے مزے سے ناشائے مکمل کیا
اور کمرے میں آ کر دروازہ لاک کر کے مظفر کا نمبر
ڈائل کرنے لگی۔ پہلی بیل پر ہی کال ریسپونڈ کر گئی۔
”اجازت ہو تو میں بھی شامل آ کے اُن میں
ہو جاؤں۔“

سائے کل تیرے در پہ جو عوام عاشقان ہوگا۔“
”واہ تمہاری یہی اداسیوں تو مجھے اچھی لگتی ہیں۔
بہت چالاک ہو مظفر، ہر حال میں جان جاتے ہو کہ
میرے دل میں کیا ہے۔“ سلطان بہت خوش تھیں۔
”تو کب مل رہی ہو پھر؟“ وہ لطف لیتے بولا۔
آج کل میں بڑی لیٹی کا پتا کٹ جائے گا،
بس یہی آخری مہرہ بچا ہے، فرخندہ کو تو پھر آسانی
سے انگلیوں میں مسک کر ختم کر لوں گی، یہی
دوکانٹے بچے ہیں۔“ اور غوث علی شاہ؟ مظفر
ٹھٹھکا۔ آخر کور تیب تھا۔

جب سب کچھ ختم ہو جائے گا تو بھلا رسوائی کیسے
جینے دے گی۔ وہ تو پھر خود ہی ختم ہو جائے گا اور پھر
ہمارے خاندان کا آخری چراغ ہے وہ۔ اُسے ختم
کر کے کیوں بزرگوں کی بددعا لیں..... یہ گناہ
مجھ سے نہیں ہوگا۔“ وہ آخری جھلے پہ انگلیں سی آواز
لگا لٹی ہوئی تھیں۔

”کتنی ذلالت ہے تم میں، اور کتنی کتنی شریف
ہو، واہ بھی واہ تمہیں تو اپنی بہترین اداکاری پر سرکاری
اعزاز ملنا چاہیے۔“ وہ مکاری سے بولا تھا۔
کافی دیر تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ فون
بند کر کے وہ الماری کی طرف پڑھنے لگیں کہ دوبارہ
فون بجنے لگا۔ مظفر علی کی کال تھی۔ انھوں نے کان
سے موبائل لگا یا۔
”مظفر علی کل تیار رہنا تمہارا انتظار آخری
مرحلے میں ہے، غوث علی شاہ پوری طرح اُس سے

بٹن ہو چکا ہے اور تمہیں اس کے قریب دیکھ کر یہ
بھی یقین میں بدل جائے گا، آخر کو تمہاری اس
بے محبت کوئی دھکی پھینچی بات تو ہے نہیں، کل جمعہ ہے
مزار پر حاضری دینے جانا ہے۔ فرخندہ پہلے جائے گی
نہاں موجود رہنا، میں غوث علی شاہ کے ساتھ میں
ہاٹم پر پہنچ جاؤں گی، مگر یاد رہے..... تمہیں فرخندہ
کے نزدیک آنا ہوگا۔ اتنا نزدیک کہ غوث علی شاہ بغیر
سوچے سمجھے اُسے جان سے مار ڈالے۔“ وہ نفرت
سے بولی تھیں۔ ”میں تیار ہوں، پوری طرح سے
تیار۔“ وہ گہری سانس لیتا فون بند کر گیا۔

☆☆☆

”میں نے کہا میرا راستہ چھوڑو۔ کیا یہ ہے سب؟
اب کیوں میرے راستے میں آ کر مجھے زسوا کرنا
چاہتے ہو۔ کیوں ایسا کر رہے ہو میرے ساتھ؟“
فرخندہ مزار کے اٹھانے میں اک طرف کھڑی تھی۔
مظفر علی اُس کے سامنے تھا، وہ سچ نہیں کہتی تھی
اُسے گریبان سے نہیں کپڑے کتنی تھی۔ جس شخص نے اس
کی زندگی اُس پر تنگ کر رکھی تھی وہ لوگوں کا خیال اور
اپنی عزت کی وجہ سے اُس کو کچھ کہہ بھی نہیں پاری
تھی۔

”میں تم سے آج بھی بہت محبت کرتا ہوں
فرخندہ۔ میرا یقین کرو، تم کسی سے مت ڈرو۔ تمہیں
غوث علی شاہ سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں
ہوں تمہارے ساتھ، ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ ایک
بار میری بات مان لو۔“ وہ التجائیہ لہجے میں بولا تھا۔
”جواس بند کر دو۔ ہوش میں تو ہو؟ یہ تم کیا کہہ رہے
ہو؟“ وہ ہنسنے لگی آواز میں غرائی تھی۔
”مجھے کی زیادتی ہے اس کا نازک وجود کانپ رہا
تھا۔“ اپنی گندی زبان سے میرا یا میرے شوہر کا نام
پال لیتا دوبارہ دلالت ہے تم جیسی گندی ذہنیت والے
شخص سے، میرا تم سے کوئی لینا دینا نہیں، آئندہ میرے
راستے میں مت آنا۔ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا
کچھ تم؟“ وہ اٹھ اٹھا کر تنبیہ کرتی۔ دائیں طرف
سے لنگھتی کہ مظفر نے پھر سے اس کا راستہ روکا۔
”بھونسا ہے۔“ مجھے تمہاری صورت سے بھی

نفرت ہے۔“ وہ نفرت سے بولی تھی۔
مگر مجھے تم سے آج بھی اتنی ہی محبت ہے۔ بہت
محبت۔“ اُس نے فرخندہ کے دونوں ہاتھ تھامے
تھے۔

اب کی بار فرخندہ پتھر بن گئی تھی معظم کی
حرکت نے نہیں کسی اور بات نے اُسے بت بنایا
تھا۔ اُس نے فرخندہ کی نظروں کے تعاقب میں
پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔

غوث علی شاہ، سلطان کے پہلو میں گم صم سے
کھڑے انہی کی طرف متوجہ تھے۔ فرخندہ کے
ساتھ معظم کو دیکھ کر ان کا چہرہ تارک پڑ گیا تھا۔
اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا یا کرتا غوث علی شاہ
پیچھے کھڑی گاڑی میں بیٹھے تھے اور آندھی
طوفانوں کی طرح چلے گئے۔

مظفر علی نے برف بنی فرخندہ کے ہاتھ چھوڑ
دے، وہ وہیں کسی بے کس خالی ہاتھ فقیر کی طرح
زمین پر گر کر روئے گئی۔

مظفر اور سلطان میں نظروں کا تبادلہ ہوا وہ آگے
بڑھ گیا۔ سلطان، فرخندہ کے پاس آ کر اُسے سہارا
دے اٹھانے لگی تھیں۔ مقصد پورا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”یوں لگ رہا ہے بھرے مجمع میں کسی نے
میرے منہ پر کا لک نسل دی ہو، خود کسی حرام نہ ہوئی تو
میں اس لمحے زندہ نہ ہوتا۔“ غوث علی شاہ کا لہجہ بہت
شکست خوردہ تھا۔

”اے باتیں مت کریں، اس خاندان کے
وارث ہیں آپ، انکوٹے بیٹے، آپ کو ایسی باؤں کی
باتیں زیب نہیں دیتی۔“ سلطان نے انہیں تکی دی
تھی۔ وہ خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔
”سلطان؟“ خاموشی بھرا سکوت ان کی بھاری

آواز سے ٹوٹا۔
”جی! وہ دھڑکتے دل سے منتظر تھیں۔
آریا پار فیملی ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چاہتی
تھی۔ تو سفاک سے سفاک بات کر کے انہیں قائل
کر سکتی تھیں۔“

”آپ لوگوں کے فیصلے کرتی ہیں، گاؤں کا ہر فیصلہ آپ کی مرضی سے ہوتا ہے، اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟“ ان کی بات پر وہ کچھ مل کے لیے سست رہی۔
”بولیے؟“ وہ بتاتی سے بولے تھے۔
”آپ کو برا ننگ جائے۔“ وہ جھجکی تھی۔
”میرا دل بول رہا ہے، اگر آپ کچھ جانتی ہیں تو بلا جھجک کہہ دیں، میں سبہ لوں گا۔“ ان کی آواز ذرا سی کانپتی تھی۔
سلطانہ کو ان جیسے مضبوط شخص کی یہ کمزوری کچھ عجیب سی لگتی تھی۔

”آپ کے جانے کے بعد میں نے معظم علی سے بات کی تھی کافی برا بھلا کہا، وہ قسم کھانے کو تیار ہے کہ اکیلا وہ گناہ گار نہیں، فرخندہ خود اسے فون کر کے سنے پر مجبور کرتی ہے۔“

”اور یہ ملاقاتوں کا سلسلہ کب سے جاری ہے؟“ آواز جیسے کنوئیں سے برآمد ہوئی تھی۔
”کافی عرصے سے۔۔۔۔۔“ وہ خاموش ہوئیں تھوڑا وقت لیا، اور یہ ملاقاتیں۔۔۔۔۔ ”صرف دن تک ہی محدود نہیں رات کے اندھیرے میں فرخندہ سنے جاتی ہے معظم علی سے۔“ سلطانہ نے بات بمشکل مکمل کی تھی۔
یہ بات نہیں تھی بھلا تھا جو کسی نے غوث علی شاہ کے سین دل پر بیہوش کیا تھا۔ انھوں نے مضبوطی سے سینہ تھاما، یوں لگ رہا تھا کہ ان کے دل سے خون ابل ابل کر بہہ رہا ہو۔

”مجھے لگتا ہے جس وارث کو وہ پیر خاندان کا کہہ رہی ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔“ سلطانہ نے بالآخر تابوت پر آخری کیل ٹھونک ہی دی۔

”گاؤں کے ایسے کسی مسئلے میں آپ کیا فیصلہ کرتی ہیں؟“ ان کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”میں کسی انگریزی قانون کو نہیں مانتی، ہمارے گاؤں میں بابا مرحوم اسلامی حدود نافذ کر گئے تھے، میں اب بھی اسی قانون پر عمل کرتی ہوں، آپ نے بھی دیکھی لینے کی کوشش بھی نہ کی۔۔۔۔۔ کتنے بے خبر رہے آپ۔“ وہ اسوس سے بولیں۔

”اسی بے خبری نے تو آج یہ دن دکھایا ہے۔“ وہ

کہہ کر ہنر پر لٹ گئے اور آنکھیں موند لیں۔
”اس موضوع پر پھر بھی بات ہوگی، ابھی اُس سے کہہ دیں، میرے سامنے نہ آئے۔“ وہ آنکھیں بند کیے ہی گویا ہوئے تھے۔

سلطانہ نے ساری لائیں آف کیں اور کمرے سے نکل آئیں۔ اس رات فرخندہ ان کے پاس آئی تھی بہت دور رہی تھی۔ ان سے مدد کی ہچک چھکی مانگی۔ مگر انھوں نے دھتکار دیا، غوث علی شاہ کی بات من و عن دہرائی، وہ بہت نڈھال سی ان کے کمرے سے نکلی تھی۔

☆☆☆

”گھنٹہ یہ شور کیسا ہے۔“ سلطانہ سیدھی ہوئیں، گنبد جوان کی ٹانگیں دباری تھی باہر کی طرف بھاگی۔
سلطانہ تب تک بیڈ سے اتر کر دوپٹہ چپک کیے تیار کھڑی تھیں۔

”بابی جی! پیر صاحب نے فرخندہ بی بی کی ہوت بہت مارا ہے، وہ رو رہا کہ معافی مانگ رہی ہیں، مگر صاحب بہت غصے میں ہے۔“ وہ اس بات سے بھی تکی۔
سلطانہ باہر آئیں، تو فرخندہ کو غوث علی شاہ کے قدموں میں گرے روئے پایا۔ وہ گریہ کر رہی تھی۔
”پیر صاحب میں بے گناہ ہوں، یہ بہتان ہے جھوٹ ہے، میں معصوم ہوں، آپ کے سوائے کسی مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ وہ شخص جھوٹ کہہ رہا ہے۔ میری کوکھ میں پیر خاندان کا وارث چل رہا ہے کوئی گند اخون نہیں۔ میرا یقین کریں۔“ غوث علی شاہ نے اسے پیر کی شوکرے پر سے لیا تھا۔

”سلطانہ اس بد ذات عورت سے کہو، چلی جائے میرے سامنے سے، مجھے اس کی صورت سے بھی نفرت ہے۔ چاہے یہ کتنی صفائیاں دے، جھوٹی قسمیں کھائے مجھے اس کا یقین نہیں۔ یہ میری نظروں سے گر چکی ہے۔“ وہ سلطانہ بیگم سے مخاطب ہوئے تھے۔

”شادی شدہ عورت جب زنا کرتی ہے تو اس پر کیا حد لگتی ہے ذرا یہ بھی بتادیں اس سے شرم اور ذہبت عورت کو۔“ ان کی بات پر فرخندہ مزید تڑپتی تھی۔
”نہیں پیر صاحب خدا کے لیے مجھ پر ایسی ہمت

مت لگاؤں۔ میں زانیہ نہیں۔ معصوم ہوں۔ رحم کریں۔“ غوث علی شاہ نے اس کی گریہ و زاری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہہ کر تھارت سے اس سے منہ پھیرا تھا۔
”شادی شدہ مرد و عورت کے لیے سنگساری کا حکم ہے، اور یہ سنگساری عبرت کے لیے کچھ لوگوں کے سامنے یعنی محلہ جمع میں دی جائے گی۔ معظم علی کو سو کوڑے لگیں گے اور فرخندہ کو سنگسار کیا جائے گا، مگر فرخندہ تو ماں بننے والی ہے اور بچے کی پیدائش تک اسے ہم سنگسار نہیں کر سکتے۔“ سلطانہ نے سفائی کی حد کر دی تھی فرخندہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔
غوث علی شاہ نے اپنی سرخ آنکھیں دکھائیں۔

”مجھے اس بچے سے کوئی سروکار نہیں۔ آج میں شہر سے باہر جا رہا ہوں ایک ضروری کام سے۔ سلطانہ آپ انتظام کروں، خاندان کے لوگ اور گاؤں کے کچھ لوگوں کو تیار کر لیجئے یہ سزا اکل ہی دی جائے گی۔ اس جیسی عورت کا انجام ہر کوئی دیکھے گا۔ جس نے ہمارے خاندان پر بھلا گادیا۔ پیر خاندان کو سزا اٹھانے کے لائق نہ چھوڑا کل تک میں واپس آ جاؤں گا انتظام ہر صورت مکمل ہونا چاہیے۔ میں مزید اسے اس حویلی میں برداشت نہیں کروں گا۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے جانچے تھے۔

”میں اس انجام کی حق دار نہیں۔ میرا یقین کریں۔ آپ چار گواہ لائے بغیر مجھ پر ایسا سنگین جرم ثابت نہیں کر سکتے۔ مت کریں ایسا۔ نفرت کی آگ خود برائی مت حاوی کریں۔ روز حشر کیا جواب دیں گے انڈو کہ پلڑے دقت دیں۔ یوں رسوا مت کریں۔“ میں بڑی عورت نہیں ہوں۔“ وہ زار و قطار رو رہی اور اپنا چارہ چھٹی۔

سلطانہ بھی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

غوث علی شاہ جانے کی تیاریوں میں تھے، سلطانہ بھی مصروف پاکر بڑی بی بی کے کمرے میں چلی آئیں۔ ان تو ان کی پتا صاف کردوں۔ آج یہ، فرخندہ۔ دونوں کا نکل جانے تو راستہ صاف ہوگا، پھر مجھے اور مظفر کو کوئی الگ نہیں کر سکے گا۔ یہ

چھپ چھپ کر ملنا بھی ختم، میں اب تھک گئی ہوں۔ مزید یہ چچن چچانی نہیں کھیل سکتی۔ کھیل اب ختم ہونا چاہیے۔“ وہ نیم اندھیرے میں نیکر اٹھا کر بڑی بی بی تک آئیں وہ سکون کی نیند سو رہی تھیں۔

”تمہارا اپنا کتہ چکا بڑی بی بی، یہ آخری لمحے ہیں۔ اب آنکھ اٹکے جہاں ہی کھلیں تمہاری۔“ وہ بھی اس سے پہلے کہ نیکر ان کے منہ پر رکھیں دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ سیدھی ہوئیں چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”ارے آپ۔۔۔۔۔ اس وقت یہاں؟“ غوث علی شاہ کو کچھ کر دھنسنے لگی تھیں۔
”جی میں غلطی کے لیے نکلتی ہی لگتا سو جا بڑی بی بی نے تل لوں، سو رہی ہیں؟“ وہ آگے آئے تھے۔

”جی بس میں یہی دیکھنے آئی تھی، سکون سے سو رہی ہیں، میں نے وقت پر دوا کھلا دی تھی۔“ وہ کچھ کو نائل کرتے بولیں۔

ایک آپ ہی تو ہیں اس حویلی میں سب کا خیال رکھنے والی۔ ہم تو خود سے بھی غافل ہیں۔“ وہ اداسی سے بولے اور ماں کے پاس آ کر کان کا ہاتھ چوما۔

”میں جا رہا ہوں، کل صبح تک واپسی ہوگی، تب تک حویلی اور اُس میں رہنے والوں کا خیال رکھیے گا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ نکل گئے، سلطانہ ان کے پیچھے چلی تھیں۔

انھیں رخصت کر کے جب وہ اندر کی طرف آئیں تو فون بج رہا تھا۔ پوری حویلی میں ہو گا عالم تھا، ہر طرف آوازیں اور دیرانی چھائی ہوئی تھی۔

”اس وقت کون ہے؟“ انھوں نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے مظفر تھا۔ وہ حویلی کے باہر کھڑا، اندر آنے کی اجازت چاہ رہا تھا۔
”تم واپس چلے جاؤ۔۔۔۔۔ پہلے ہی ہم پر مصیبت آئی ہوئی ہے، دو تین دن تک مزید میرے کولو۔ پھر انتظار ختم۔“ وہ کوفت سے بولی تھیں۔
”تم جانتی ہو میں ضد کا کیا بول، اور اب تو میرا غوث علی شاہ بھی چلا گیا، حویلی میں کوئی نہیں ہے جس کا ڈر ہو۔۔۔۔۔ وہ دو کمزور عورتیں ہمارا کیا بگاڑ لیں گی؟“ وہ

بشاش لہجے میں بولا تھا۔
”کچھ دن انتظار نہیں کر سکتے تم؟“ وہ ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

”نہیں..... کچھ دن تو کیا ایک لمحہ، ایک پل بھی نہیں۔ یہ صرف خالی غولی دھمکی نہیں۔ جملہ فون بند کرلو۔ دروازہ مت کھولو۔ مگر میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہلوں گا۔ پھر دیتی رہنا لوگوں کو جواب۔ میں کون ہوں اور تم سے میرا کیا تعلق ہے۔“ اس نے لاڈ سے کہتے کہتے ہتھ لگا دیا تھا۔

”ذلیل انسان کو وہ ہیں رہتا، میں آ کر دروازہ کھولتی ہوں، جانتے ہو تمہاری کوئی بات رد نہیں کرتی..... اس لیے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو میری محبت کا۔“ اس نے مصنوعی غصہ دکھا کر یو دیتا ہوا تین کس اور فون بند کر کے احتیاط سے ادھر ادھر دھکی دھکی ڈال دی۔ دروازے کی طرف آئیں۔

بہت راز داری سے محتاط سی وہ اُسے اپنے کمرے تک لائی تھیں۔ وہ پہلی بار نہ آیا تھا وہ جوئی کے ایک ایک چپے سے چپے سے واقف تھا۔ چپچلے برسوں میں کی بارود یہاں آچکا تھا۔

مگر آج کی رات کچھ عجیب سی تھی، سلطانہ اس کی آمد سے خوش تھیں مگر عجیب سی بے چینی نے دل کو گھیر رکھا تھا۔ ظاہری طور پر تو وہ مظفر کی سحر انگیز شخصیت کو دیکھ کے بہل گئی تھیں۔

اچانک سے موسم کے تیور بدلے تھے، بادل گرہنے لگے، بجلی کی چمک کانوں کے پردے تک چیر رہی تھی۔

”دیکھو ذرا..... میں اتنے ظالم موسم میں اپنی محبت سے ملنے آیا ہوں، وہ دیکھو بارش شروع ہوگئی۔ کتنی طوفانی بارش ہے۔ یہ جان بھٹکا۔ یہاں کے سر پر کن اور تھوڑے بغیر اپنی پرواہ کے تم تک آ گیا تم مجھے نالتی رہیں مگر میں آبی گیا۔ بہت گلہ ہے تم سے۔ بدلے لگنے کی ہوا ہے تم، کہیں مجھے چھوڑ کے اُس غوث علی شاہ سے تو محبت نہیں ہوگی تمہیں؟“ موسم نے اس کے شاعرانہ مزاج پر اثر کیا تھا۔

”غوث علی شاہ سے محبت کرنے لگیں میرے

دشمن۔ آئندہ مجھے ایسی گالی مت دینا۔“ سر سے دوہینہ گرایا اور وہ ان کے گھٹے لیے بالوں کی چوٹی کے بل کھولنے لگا۔

”مجھے تمہارے ساتھ ساتھ، تمہارے بالوں سے بھی عشق ہے۔ آج تک میں نے کسی عورت کے اتنے حسین بال نہیں دیکھے، یا شاید تم ہوئی اتنی خوب صورت کہ مجھے مہبوت کر دیتی ہو۔“ اس کا لہجہ بدلنے لگا۔

”تمہاری یہ دیوانگی ہی تو ہے، جس نے مجھے باندھ رکھا ہے، ورنہ میرے بال آج تک پیر غوث علی شاہ تک نہ نہیں دیکھے، تمہارا میرے لیے جنوں ہی دراصل میرا عشق ہے، میری آج تک کسی نے ایسی تعریف نہیں کی۔ نہ ہی کسی نے ایسا حق جتایا۔ جیسے تم میری ذات کو معتبر کر دیتے ہو، میرے لیے والہانہ بین جھلکتے ہو، میں اول روز کی طرح آج بھی صرف تمہاری ہوں۔ تمہاری سنگت مجھے وہی کم عمر سلطانہ کی الدین بنا دیتی ہے۔“ وہ سرشار تھی۔

”ہم نے یہ حق کی کو دیا ہوتا تو حق جتنا وہ بیچارہ۔“ مظفر نے ان کی چوٹی کا آخری بل کھولا اور جھینکا دے کر بالوں کو بھر دیا۔

گھٹے لیے بالوں نے ان کے پورے وجود کو ڈھانپ لیا۔

”آج میں بڑی بی بی کو ختم کرنے لگی تھی کہ میں ناظم پر غوث علی شاہ پہنچ گئے اور میں ہاتھ پائی رہ گئی۔

تمہاری محبت نے مجھے کتنا ظالم بنا دیا ہے۔ فرخندہ بھی کل سنگسار ہو جائے گی، مجھ سے مقابلہ کرنے چلی تھی۔ پیر خاندان کا وارث کیا پیدا کرتی میں نے اُسے کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ چھوڑا۔ پھر ہم دونوں ہی ہوں گے، پیر صاحب اپنے زخم اکیلے پیٹھ کر چائے پئیں گے۔“ انھوں نے قہقہہ لگا دیا۔

”اور وہ فرخندہ کا منگیتر ہے تم نے اس کے پیچھے لگایا تھا؟“ مظفر کو یاد آیا مظفر علیؒ

”اس کو تو میں نے ہماری معاوضہ دے کر فرار کروا دیا ہے۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو آج جانے گا۔“ پیچھے میں بڑی طاقت ہے۔ سب کا منہ بند ہو جائے گا۔“ وہ اپنی ہی ذم میں مبتلا تھیں۔

”بے چاری فرخندہ کے ساتھ تم نے بڑی زیادتی کی، جو کچھ تم کرتی رہی ہو وہ سب اس کے سر منڈھ دیا۔ بڑا قابلِ رحم ہے پھر غوث علی شاہ کہ تم جیسی ناگن ہاک کے بیچ کیا کیا کرتی رہی اور وہ ساری زندگی بے خبر رہا۔ اس کے رشتوں، اس کی دولت اور اس کے بھروسے کا خون کرنے والی سلطانہ ہی اس کے گھر اور ہر شے کی مالک بنی بیٹھی ہے، واہ مالک۔ تیرے رنگ زلے۔“ وہ مکاری سے بولا تھا۔

”کیونے (مونی سی گالی) میرا کھاتے ہو اور مجھ پر ہی بھوکتے ہو، تمک حرام! سلطانہ نے ہنستے ہوئے اس کے سینے پر مکا مارا۔

”تو کیا میں نے جھوٹ بولا؟ یہ سارے کارنامے تمہارے نہیں؟“ اس نے بھی ہنس کر جواب مانگا تھا۔ ”باقی ہوں اور اعتراف کرتی ہوں یہ سب میں نے کیا۔ اب خوش؟“ سلطانہ نے لاڈ سے اس کے کندھے پر سر رکھا تھا۔

”ہاں خوش ہوں میں بہت خوش۔ تم بڑی عورت ہو اور اہم باقی بھی ہو، بڑا دل کردہ ہے تمہارا۔“ اسے اعتراف کرنا پڑا۔

ہاں مگر صرف تمہارے سامنے۔ باقی دنیا تو مجھے بہت اچھا انسان سمجھتی ہے جالا کہ میں ایک بڑی عورت ہوں۔ بہت بڑی۔“ وہ مظفر کے قربت میں آنکھیں بند کر کے بہت جذب سے بولیں تھی۔

پیر غوث علی شاہ جو کچھ دیر پہلے سلطانہ کے کمرے میں کس کی ضروری فائل بھول گئے تھے سن کر کھڑے کھڑے گر گئے تھے۔

اتنا دھوکا۔ اتنی مکاری..... اتنی برائی۔ ان پر اک پل میں قیامت گزرتی تھی۔

ان کے وقار اور عزت کو بھروسہ کر کے سلطانہ نے انھیں کسی قابل نہ چھوڑا تھا۔ وہ عورت جس کی ہر بات کو انھوں نے بند آنکھوں سے تسلیم کیا تھا۔ وہ اس قابل تھی ہی نہیں کہ اُس پر بھروسہ کیا جاتا۔ ساری دنیا لڑکھی سلطانہ کے خلاف کھڑی ہو جاتی۔ پیر غوث علی شاہ دنیا کو بھٹلا دیتا مگر اپنے کانوں سے سنا ان کا ہر اعتراف وہ نہیں بھٹلا سکتے تھے۔

ہمت کر کے انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ دھکیلا اور جو منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی تکلیف اور ذلت کے لیے دنیا کا بڑے سے بڑا لفظ بھی چھوٹا تھا۔

بساط اُٹ چکی تھی، جو کونواں انھوں نے فرخندہ کے لیے کھودا تھا وہ خود اُس میں جاگری تھیں۔

مظفر جھگٹے سے سلطانہ سے الگ ہوا اور اپنا سامان اٹھا کر کھڑکی سے کود گیا۔ ساری ذلت سلطانہ کا مقدر بن گئی۔ جس عشق کو وہ سب کچھ تھیں تھیں اپنا نجات دہندہ کھو چکی تھی۔

”اپنی صفائی میں تم کچھ نہیں ہوگی۔ کیونکہ تمہارے پاس کچھ کہنے کو بچا ہی کب ہے؟ مجھے اللہ نے سبق سکھایا ہے اس رات کی مہلت فرخندہ کی خوش نصیبی نہیں تمہاری بد نصیبی کے لیے تھی۔

مجھے اللہ نے اک معصوم کے قتل سے بچالیا۔ میری نسل کو ختم ہونے سے بچالیا۔ تم بڑی عورت ہو، خود اپنی زبان سے تم نے افرار کیا ہے، میں تمہیں مزید بڑا بھٹلا نہیں کہنا چاہتا۔

تمہاری ذات اب قابلِ رحم ہے۔ آج کی اس طوفانی رات میں، تم تیرے سامنے بے نقاب ہوئی ہو..... کل کی ذلت ابھی باقی ہے۔ جب دن کے آجائے میں لوگ تمہاری اصلیت سے واقف ہوں۔ تم نے مجھے ہی نہیں یہاں کے سادہ لوح انسانوں کو بھی دھوکا دیا ہے۔ ہمارے بھروسے کا خون کیا ہے، کل کے دن کی رسوائی ہی تمہاری سزا ہے، اس سے بڑی موت کیا ہوگی۔ جب سنگسار کا حکم دھڑلے سے سنانے والی میری بی بی الدین کی بیٹی خود بھی سزا جھیلی گی۔ تم کیا تھیں اور کیا بننے کی کوشش کرتی رہیں۔ نہ اس دنیا کی رہتی اور نہ اس جہاں کی ظلم کی مدت بچتی ہو گی۔

سرکاری اور پولیس ہوتی ہے۔ سلطانہ بیگم کے ہونٹ سفل تھے، اور رسوائی کے خوف نے ان کے لبوں کو قفل کر دیا تھا۔ کل کے کوڑے انھیں آج ہی اپنی پیٹھ پر برستے محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆

پتھر میرا نصیب

نانکھ طارق

اُس عورت کی در ماندگی کا قصہ، الم، جسے ہر بار قدرت نے زیر کر دیا تھا

میں نے جب بھی کوثر بی بی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ہمیشہ ہلکورے لیتا درود بوس کیا۔ میں سوچتی کہ اس عورت کو آخر ایسا کون سا غم ہے جس کا اظہار اُس کی آنکھیں کرتی ہیں۔ میں سوچ کر بھی اُس سے پوچھ نہ سکتی تھی۔

آخر کار مجھے یہ موقع قدرت نے دے ہی دیا، ہوا یوں کہ میرا ٹیلی فون ڈیڑ گھنٹہ پہلے بج رہا تھا، سو مجبوراً مجھے کوثر بی بی کے گھر فون کے لیے جانا پڑا۔ دروازہ خود انہوں نے کھولا۔ مجھے دروازے پر دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی۔ مگر کچھ بھر میں وہ حیرت پھر بے اداسی میں بدل گئی۔ میرے ذہن میں آواز گونجی۔

”اُف کیسی ہیں ان کی آنکھیں، پل میں رنگ بدلنے والی۔“

مجھے ہنسی کھڑی کر کھڑا دیکھ کر وہ بولیں۔

”ارے آپ.....؟ آئیے آئیے آپ کا اپنا گھر ہے۔“

”کوثر باجی مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے اگر آپ کا فون.....؟“ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”تو اس میں اتنا اثر مانے کی کیا بات ہے؟ تم

فون کرو اتنی دیر میں میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔“

میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود باجی کوثر چائے بنانے چلی گئیں۔ میں فون کر کے فارغ ہوئی تھی کہ وہ چائے لے کر آ گئیں۔ چائے پینے کے دوران ہم ادھر ادھر کی گپ لگاتی رہیں۔ آخر کار کوثر باجی مجھ سے بولیں۔

”سنا ہے تم رسالوں میں کہانیاں لکھتی ہو؟“

”جی ہاں لکھتی تو ہوں لیکن صرف سچی کہانیاں۔“

میں نے جواب دیا۔

”اگر میں تمہیں ایک سچی کہانی سناؤں تو کیا تم لکھو گی؟“

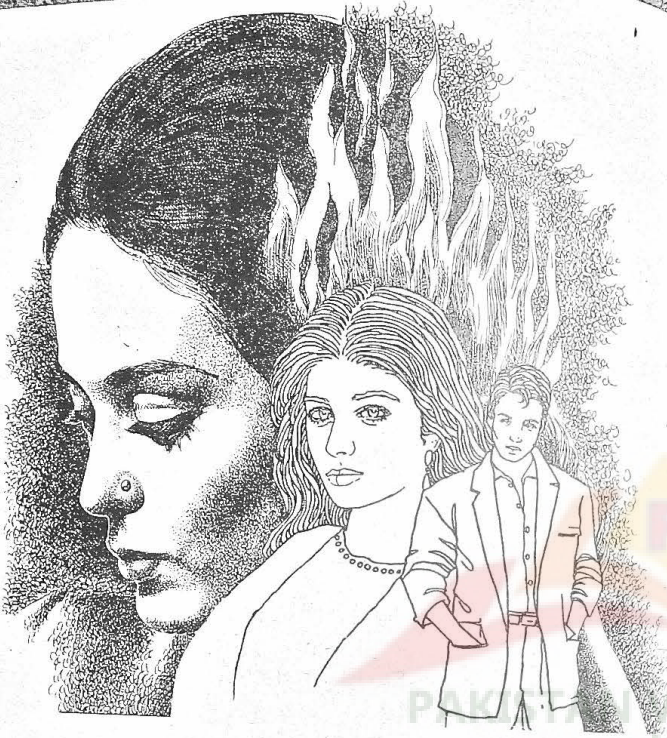
”کیوں نہیں لکھوں گی۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں آپ مجھے بتائیں۔“

”آج نہیں بلکہ کل چار بجے میرے پاس آنا پھر میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گی۔“

”میں نے کچھ لمحے سوچا اور پھر کہا کہ ٹھیک ہے میں کل چار بجے آؤں گی۔“ اگلے دن پورے چار بجے



میں کوثر باجی کے گھر میں موجود تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ یوں مخاطب ہوئیں۔

”میں سینہ باندی بنی ہوں۔ چنانچہ میرے والد کو سینہ کیس نے کہنا شروع کیا تھا۔ لیکن میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے والد کو سینہ کے روپ میں ہی دیکھا۔“

”میری ماں غلام غلام ایک سیدھی سادی اور ملنسار عورت تھی۔ میں اور میرا بھائی عباس سارا دن کھیلتے اور رات کو نیندوں کے لیے سفر پر چلے جاتے۔“

”وہ رات بھی ایک ایسی ہی رات تھی جب میری آنکھ کل گئی۔ میری ماں اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔“

”ماں..... ماں کہاں ہو تم؟“ میں نے ڈر کر پکارا۔

میرے بار بار پکارنے پر بھی جواب نہیں ملا۔

عباس جو کہ برابر والے بیڈ پر سویا ہوا تھا، میں نے اُسے اٹھایا۔

”بھائی او بھائی اٹھو ماں اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔“ عباس میری پکار پر فوراً اٹھا۔

ہم ابھی مجھے میں جیسے بستر پر بیٹھے، باہر ٹپکنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں سسکیوں کی آواز سنائی دی۔

”ارے کوثر یہ تو ماں کی آواز ہے۔“ عباس بولا۔

ماں کی آواز سیریزوں سے آ رہی تھی، جلد ہی ہم سیریزوں کے پاس پہنچ گئے۔

”ماں تم کیوں رو رہی ہو؟“ عباس بولا۔

ماں نے کھنٹوں سے چہرہ اٹھایا تو اک لمحے کے لیے میں کانپ گئی۔ بال بھرے ہوئے، چہرہ سرخ اور

آئیں سوچی ہوئی تھیں۔ یوں لگا جیسے ماں کافی دیر سے دوری ہے۔
”تم؟ اس وقت کیوں اٹھ گئے۔“
”اس کوڑھ کی بچی نے مجھے اٹھا دیا اور بولی کہ ماں اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔“ عباس نے تفصیل سے جواب دیا۔

”ماں تم رو کیوں رہی ہو؟“ میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ عباس بھی سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”میں کب دوری ہوں..... وہ تو مجھے اپنے بستر پر نیند نہیں آ رہی تھی تو میں سو جا کہ میری جلدی آئینوں، میاں خوب ہوا ہے؟“ ماں جلدی جلدی بولی۔ میں نے تو خیر نہیں کر لیا لیکن عباس کی آنکھوں میں ابھرنے لگی۔

”ماں تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟“ عباس بولا۔

”دیکھو اگر تم نے سب کچھ مجھے سچ نہیں بتایا کہ تم کیوں دوری تھی تو میں کچھ بھی کہیںوں گا۔“ عباس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ ماں چونک گئی۔
”میں تمہیں بتانا چاہتی لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تمہیں بتانا پڑے گا۔“ ماں دھمے لہجے سے بولی۔

”تمہارے ابو نے دوسری شادی کر لی ہے۔“
”کیا؟“ کیا کہا..... ابو نے دوسری شادی کر لی ہے؟“ میں اور عباس دونوں چونک گئے۔

”ہاں میرے بچو میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ ماں روتے ہوئے بولی۔

”بس آج کے بعد مت رونا، میرے ہوتے ہوئے تمہیں رونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مجھے یوں لگا جیسے عباس مجھ سے بڑا ہے۔ اُس کے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ میں اُس سے بڑی ہوتے ہوئے بھی یکدم سہم سی گئی۔ اسی دن سے عباس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ اور زمینیں سنبھال لیں۔ وہ یکدم سے جوان ہو گیا تھا۔
ابوئی شادی کے بعد عباس سے جھگڑنے لگے تھے۔

اور میں تو انہیں دیکھ کر ہی کمرے میں چھپ جاتی۔
نجانے وہ کیسا خوف تھا جو میرے اندر جم سا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب عباس ابو کے سامنے کھڑا ہوا تو وہ کچھ نہ بول سکے اور چپ کر کے پچاس مریبے بھائی کے حوالے کر دیے۔

عباس کو اک چپ سی لگ گئی تھی۔
میں بھائی کی حالت دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ ابو ہمیں چھوڑ کر نئی بیوی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔

پہلے تو وہ ہماری خیر خبر بھی رکھا کرتے تھے۔ لیکن جب سے عباس نے اپنی زمینیں سنبھالیں وہ ہم سے بالکل لائق ہو گئے تھے۔ اور وقت پر لگا کر اڑتا جا رہا تھا پھر اُن کی بیوی سے بھی ایک بیٹا ہو گیا۔

میرے سوتیلے بھائی کا نام علی رضا رکھا گیا۔ مجھے تو علی رضا بھی اتنا ہی پیارا لگتا جتنا کہ عباس۔ میرے لیے تو دونوں بھائی برابر تھے۔

وہ بھی عام دنوں جیسا ایک دن تھا جب میری شادی کی بات ہونے لگی۔ میری پھوپھو کا ہمارے گھر کافی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں بتا چلا کہ وہ اتنا کیوں آتی تھیں۔

میری ماں نے بھائی عباس سے مشورہ کر کے اُن کو ہاں کہہ دی تھی اور وہ دھوم دھام سے میری برأت لے آئیں۔ دہن بن کر میں خود کو ہوا اڑتا میں محسوس کر رہی تھی۔ رخصتی کے وقت میں روئی بھی جاری تھی اور موقع بابتے ہی اپنے شوہر احمد عباس کو بھیجی کہ انکیوں سے دیکھتی تھی۔ وہ مجھے بہت پیارا لگ رہا تھا۔

میں بہت خوش تھی کہ برادری میں سب سے زیادہ خوبصورت اور ذہین نوجوان میرا ہم سفر بنا ہے۔ میری شادی یہ میرے بھائی عباس نے بہت پیار سے خرچ کیا تھا جبکہ ابو ہیمان بنے رہے تھے کیونکہ وہ دوسری بیوی کے اشاروں پر رہتے تھے۔

میں اپنی آنکھوں میں نئے خواب اور دل میں نئی انگلیں سجا کر سہرا لپیٹی۔ احمد عباس بہت اچھا انسان تھا۔ دوستوں کا دوست، ہمدرد اور نیک طبیعت کا مالک، لیکن کانوں کا ذرا کچا تھا۔ ماں کی ہر بات کو حدیث سمجھتا

تھا۔ میں نے کبھی دنوں میں جان لیا کہ دیور فضل عباس انتہائی لالچی، مطلب پرست اور خود غرض انسان ہے۔ جبکہ نند بختااور فضل عباس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اب انہی کے ساتھ گزارا کرنا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے بیخود کر لیا تھا۔

وقت کا کام ہے گزرتا رہا مگر احساس بھی دلاتا رہا کہ زندگی بڑی کٹھن ہے۔ اس دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی کسی کمراس کی آواز آئی۔

”کوڑھ اری اور کوڑھ، کم بخت ماری ایک پکار پر جواب نہیں دیتی ہے۔“
”آئی پھوپھو!“ میں بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔

”حرامزادی کسی یار کے پاس تھی جو میری آواز سنائی نہیں دی۔“ وہ جھپٹیں۔
میں اس الزام پر تڑپ کر رہ گئی اور ادا طلب نظروں سے دیور کی طرف دیکھا جو مجھے بھرپور نظروں سے گھورتا تھا۔

”اب کھڑی کھڑی میرا منہ کیا کیا رہی ہے، جا جلدی سے جا کر میرے لیے دودھ پتی بنا کر لا۔“
گھر میں کئی نوکر تھے۔ لیکن پھوپھو ہر کام مجھ سے کرواتیں۔

”اس بار احمد عباس آجائے تو اُس سے میں کھل کر بات کروں گی کہ اس کی رکھوالی اب ہم سے نہیں ہوتی ہے۔“ پھوپھو کی بڑبڑاہٹ میں نے چن تک سنی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

احمد شکار کھینے سندھ کے جنگلوں میں گئے ہوئے تھے۔ سوچ دیکھ کر میں نے پھوپھو سے کہا۔

”پھوپھو اگر آپ کی اجازت ہو تو میں امی اور بھائی سے مل آؤں؟“ دراصل اس روز میرا دل بہت اُداس تھا اسی لیے میں نے ساس سے اجازت مانگی تھی۔

”جانا ہے تو چلی جاؤ لیکن یہ سوچ کر جانا کہ پھر

اور آئے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اللہ کے واسطے پھوپھو مجھ پر یہ ظلم تو نہ کرو۔“

مجھے ایک بار اپنے بھائی سے ملنے دو۔“ میں

روتے ہوئے بولی۔

”میرے آگے کبواس کرتی ہے، بھونکتی ہے میرے آگے۔ ذلیل، کسکی بظہر میں تجھ سے ابھی پوچھتی ہوں۔“ میری ساس نے یہ کہہ کر مجھے چپا سے پکڑ لیا اور مارنا شروع کر دیا۔ میری نند بختا اور کئی اُن کے ساتھ شامل ہو گئی۔

”میں رو رہی تھی، چلا رہی تھی لیکن میری فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ نوکروں کے کان میرے ہو گئے تھے۔ میں خاموشی سے چپ رہی تھی کہ ایک لات میرے پیٹ پر لگی اور مجھے یوں لگا جیسے میرا کلیجہ منہ کے ذریعے باہر نکل آئے گا۔ پھر ایسا لگا کہ خون کا دریا پھر اُٹھا اور اس ہلکی وہ آس جو چار ماہ سے قائم تھی ٹوٹ گئی۔ گھر میں کلکاری غونجنے سے سلیختم ہو گئی۔

اس ظلم پر کبھی نہ آسان ٹوٹا اور نہ ہی زمین پھٹی۔ بس میں بے ہوش ہو گئی تھی اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں موجود تھی۔

مجھ میں بلے تلنے کی سکت بھی نہ تھی۔
اُسی رات احمد عباس آگے۔ میری حالت دیکھ کر وہ بھی سکتے میں رہ گئے۔

”کوڑھ میری جان! یہ کیا حالت تم نے بنا رکھی ہے؟“ احمد مجھے اپنی ہانہوں میں لے کر بولے۔

میں نے جو ذرا سا ہمدرد لہجہ سنا تو بکھر گئی اور پھر میں یوں تڑپ تڑپ کر روئی کہ خدا کی خدائی بھی جوش میں آجائے۔ میرے رونے کی آواز سن کر ساس میرے دروازے تک آ گئی اور پھر اُس نے فوراً ہی احمد کو بلایا کہ اسے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ احمد کو جاتے دیکھ کر میرا دل کا پ

کر رہ گیا کہ اب میری ساس نہ جانے کیا لگائی بھجائی کرے گی۔ اُن کی باتیں سننے کے لیے میں دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اُن کے کمرے تک پہنچ گئی اور دروازے پر کھڑی ہو کر اندر کی باتیں سننے لگی۔ پھوپھو کہہ رہی تھیں۔

”احمد میں تمہاری ماں ہوں تم میری بات کا کہاں تک یقین کرو گے؟“
”امی جان خدا کے بعد میں آپ کا مقام سمجھتا

ہوئے ہوئے بولی۔

ہوں۔ آپ میری ماں ہیں۔“ احمد کی مودب آواز سنائی دی۔

”تو میری بات غور سے سنو، کوثر اب تمہارے قاتل نہیں ہے۔“ ساس کی آواز نیچے تو پائی ہوئی محسوس ہوئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان!“ احمد کی آواز میں حیرت تھی۔

”میں خشیک کہہ رہی ہوں احمد عباس! میں نے سوچا تھا کہ کوثر کے ساتھ تمہاری جوڑی خوب رہے گی۔ تم دونوں مل کر رہو گے۔ لیکن مجھے انہوں نے بے پناہ کھینچ کر اپنے بیوی نہ دے سکی۔ کوثر کے ایک شخص سے ناجائز تعلقات ہیں اور وہ شخص عباس کے پاس آتا تھا ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان؟“

”ہاں میرے بیٹے، میں خشیک کہہ رہی ہوں۔ آج جب کوثر نے مجھ سے اپنے جانے کی اجازت مانگی تو میں نے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ احمد آج آئے تو اس کے ساتھ چلا جانا لیکن کوثر نے میری ایک نہ مانی اور مسلسل ضد پر جی رہی۔ میرے انکار پر اس نے مجھے بے ضابطہ کرنے کی دھمکی اور آخر کار اس نے پتا نہیں کیا چیز کھائی جس سے بچے ضابطہ ہو گیا۔ مجھے کتنی حسرت تھی کہ میرے بیٹے احمد کے بچے ہوں اور میں انہیں کھلاؤں۔“ یہ کہتے ہی پھوپھو نے روننا شروع کر دیا۔

”ماں! اسلام میں حکم ہے کہ اگر تمہاری بیوی تمہارے قاتل نہیں ہے یا وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو پھر اس کی مرضی کے مطابق اسے طلاق دے دو بجائے اس کے کہ تم نے کوئی غلطی ہو جائے۔“

”بے شک اللہ تعالیٰ عادل ہے۔“ اس سے پہلے کہ احمد مزید کچھ بولتے پھوپھو نے اسے روک دیا۔

”بس چپ ہو جاؤ۔ میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اگر تم نے کوثر کو طلاق دے دی تو پھر میرا امرامناہ دیکھنا۔“

”پلیز ماں! ایسا تم کو بھلا میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں۔ جیسے تم کو بھی میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔“ احمد تجسسے رو رہا ہے۔

”جاؤ تم اپنے کمرے میں۔۔۔۔۔ اور سنو احمد کوثر سے کچھ نیچے مت کہنا۔ میں اپنے طور پر یہ معاملہ سنبھال لوں گی۔“

میں ایسی حالت میں بھی تیزی سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ دونوں کمرے برابر برابر میں تھے۔ مگر یہ فیصلہ بھی میں نے یہ مشکل طے کیا تھا۔ احمد کمرے میں آکر خاموشی سے لیٹ گئے تھے۔

میری زبان پر حیرت نے فضل لگا دیا تھا۔ پھوپھو ہر کو بھی انہوں نے روایتی ساس جیسا انداز اپنایا تھا تو مجھے اتنی حیرت نہیں تھی۔ مگر آج انہوں نے جو جو کچھ کہا تھا اس نے مجھے کیسے میں ڈال دیا تھا۔ اب میں احمد کے رد عمل کی منتظر تھی۔ میں خود سے انہیں چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔ بس دیکھنے جا رہی تھی۔ رات کے بعد جب کوثر کو کچھ نہ بولے بس ان کا رویہ سرد رہا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں احمد؟“

”نہیں تو بھلا میں تم سے ناراض کیوں ہوں گے؟“

”پلیز احمد اب اور دکھ اور درد میں آئی سر دھری کو ختم کر دو۔۔۔۔۔ اب اور مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں تم سے صرف تم سے محبت کرتی ہوں احمد۔ مجھے خود سے دور نہ کرو۔“ میں نے اختیار رو پڑی۔

”بس اب چپ کر جاؤ، موت رو مجھے تکلیف پہنچا رہی ہے۔“ احمد کا اس پاکرا نگلے ہی لمحے میں خود سے بھی بے گانی ہو گئی۔

حالات ایک ہی دھارے پر رہے۔ میں بھی زبان پر فضل لگائے رہی۔ پھوپھو نے زیب النساء اور دیور فضل میرے سکون کو حیرت بھری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں احمد کو ایک بار پھر شکار کا شوق چڑھا اور وہ سب کچھ بھلا کر اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر چلے گئے۔

انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ میں پھر امید سے ہوں۔ اس بار میں نے کسی کو بھی ہوانہ نہ لگے دی۔

جب چوتھا مہینہ شروع ہوا تب میری ساس کو پتا چلا اور انہوں نے کہا۔

”کڑیہ میں کیا کر رہی ہوں؟“

”میں کچھ بھی نہ بول سکی، بس نظریں جھکا کر رہ گئی۔“

”میرا حکم ہے کہ تو یہ بچہ گرا دے۔“

”نہیں پھوپھو جان مجھ پر یہ ظلم نہ کریں، میں احمد کے بچے کو جنم دینا چاہتی ہوں۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”بس زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔“ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولیں۔

”اور ہاں رحمت بوا کو ہر کوئی دانی کو بولا اے تاکہ تم اس بوجھ سے آج ہی نجات پا سکو۔“

اس سے پہلے کہ میری ساس رحمت بوا کو بولا تو وہ خود ہی چلی آئی۔

”بیکم صاحبہ بھوکے بھائی صاحب آئے ہیں۔“

”کیا کھانا آ گیا ہے؟“ میں دوسرے ہی لمحے گیٹ کی طرف بھاگی۔

عباس مجھے اس طرح سے آتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”کیا ہو گیا ہے کوثر اس طرح سے کیوں بھاگ رہی ہو؟“

”عباس اگر تمہیں میرا تھوڑا سا بھی خیال ہے تو مجھے اپنے ساتھ کھلے چلو ورنہ پھوپھو اس آئینے میں پھول کھٹنے سے پہلے ہی اسے مٹ دے گی۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”جو صلہ کہ کوثر! میں ہوں ناں پھر تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

”پلیز عباس مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔“

”چلو کھیک ہے آؤ میرے ساتھ۔“

اور یوں عباس مجھے اپنے گھر لے آیا۔

میں نے راستے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ تو غصے میں بھر اٹھا تھا مگر میں نے اسے اپنی قسم دے دی۔

مجھے میکے آئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ مگر احمد مجھے لینے نہ آئے اور وہ وقت بھی آ گیا جس روز میں نے بہت خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔ یہ خبر پھوپھو

کو بھی دی گئی۔ بیٹے کی پیدائش کا سن کر احمد بھی چلے آئے۔ میری قسم کی لاج رکھتے ہوئے عباس بھائی نے خوش دلی سے اُن کا استقبال کیا۔ پھر انہیں میرے پاس انتہا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

”آپ کو اب میری یاد آئی، میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔“

”یاد تو روز آتی تھی لیکن شاید تم نے قسم کھائی تھی مجھے سے نہ ملنے کی؟“

”میں نے قسم کھائی تھی؟ آپ سے ملنے کی قسم کھائی تھی؟“

”ارے کوئی اپنی جان سے بھی علیحدہ رہ سکتا ہے؟“

”پھر تم اپنا گھر چھوڑ کر کیوں آ گئیں؟“

”میں اس لیے آئی تھی احمد کہ مجھے وہاں اپنے بچے کے لیے خطرہ تھا۔ پھوپھو نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں یہ بچہ ضابطہ کروادوں۔ اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے عباس بھائی کے ساتھ چلی آئی۔“

آہستہ آہستہ میں نے ساری بات احمد کو سنا دی۔ سب کچھ سن کر بھی وہ خاموش رہے صرف اتنا بولے۔

”خشیک ہے تم ادھر ہی رہو میں آہستہ آہستہ سب سنبھال لوں گا۔“

احمد نے مجھے گلے سے لگالیا تو میں اپنے سارے غم بھول گئی۔ بیٹے کا نام انہوں نے ہی یوسف رکھا۔

یوسف بہت بیدار بچہ تھا۔ لوگوں نے دباؤ ڈالا تو پھوپھو بھی آ گئیں۔ انہوں نے یوسف کو بیدار کیا اور پانچ ہزار میرے ہاتھ پر رکھ کر چلی گئیں۔

مجھے تو اب کیلئے کو اک خوبصورت سا کھلونا مل گیا تھا۔ سارا دن بس یوسف میں ہی مست رہتی۔ بعض دفعہ احمد میرے پاگل پن پر خوب ہنستے۔

یوسف ابھی چار ماہ کا تھا کہ میں دوبارہ امید سے ہو گئی۔

”اُف احمد اب کیا ہوگا؟“

”ارے ہوگا کیا جان سن اک پیاری سی بیٹی ہوگی اور بس۔“

”سچی کہانیاں“

”لیکن احمد ابھی تو یوسف بہت چھوٹا ہے۔“

میری گود سے معارج کو لیا اور ڈھیر سارا پیار کر کے مجھے واپس کر دیا۔

چھوپو کے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری بچی معارج ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے شور مچا کر پورا گھر اٹھا کر لیا۔

سب سے پہلے بھائی عباس کو ہوش آیا، اُس نے لپک کر مجھ سے معارج کو چھینا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ باہر مردانے میں اُن کا دوست گاڑی اسٹارٹر کے کھڑا تھا۔ آندھی طوفان کی طرح عباس ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور اُسے ساری صورت حال سمجھائی۔

ڈاکٹر فوراً معارج کو آپریشن ٹیبل پر لے گیا۔ پورا ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد ڈاکٹر معارج کو بچانے میں کامیاب ہوا۔

”بچائیں اس بچی کو ایسی کون سی چیز دی گئی تھی کہ آہستہ آہستہ زہر اس کے بدن میں پھیل رہا تھا۔ اگر اسے بروقت نہ لاتے تو یہ مر جاتی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ڈاکٹر عباس بھائی کا دوست تھا اس لیے پولیس کیس نہ بنا۔“

مجھے جب ساری صورت حال کا پتا چلا تو میں تڑپ گئی۔ عباس مرنے مارنے پر مل گیا تھا کہ امی نے واسطے دے کر اُسے دھپکا کیا۔

”چھوپو نے آخر ایسا کیوں کیا؟“ میں اور عباس سوچتے رہے۔

ان باتوں کا ذکر جب میں نے احمد سے کیا تو وہ مجھ سے اور عباس سے لڑ پڑے کہ تم دونوں بہن بھائی میری ماں پر الزام لگا رہے ہو۔ بھلا کوئی ماں اپنے بیٹے کے ساتھ ایسی زیادتی کر سکتی ہے کہ اُس کی اولاد کو مار دے۔ تم یہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہو، میں چپ رہا۔ بلکہ براہِ خرچہ بھی دیتا رہا۔ تم نے جیسا کہیں نے ویسا ہی کیا۔ اُدھر میری ماں مجھے بہت کچھ بتی رہی اور میں چپ رہ کر سنا رہا صرف اس لیے کہ ہمارا تماشنا نہ بنے۔ لیکن اب حد ہو گئی ہے کہ میری ماں پر یہ الزام کہ اس نے بچی کو زہر دیا ہے۔“

عباس اور میں بالکل چپ بیٹھے رہے۔ آخر کار

”ارے بابا چھوپو نے تو کیا ہوا؟ اب یہ تو خدا کی مرضی ہے۔ بہر حال ہوتے ہیں اُس کی مرضی میں دخل اندازی کرنے والے۔“ احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

میں چپ رہ گئی کیونکہ احمد کے ساتھ بحث فصول تھی۔ وقت گزرتا رہا اور خدا تعالیٰ نے میری گود میں بچی دے دی۔ بچی کی پیدائش پر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ اس بار ہم دونوں میاں بیوی کو بچی کی خواہش بھی موصولہ نے ہماری خواہش پوری کر دی۔

میں نے اس کا نام معارج رکھا۔ یوسف کے مقابلے میں معارج کافی کمزور پیدا ہوئی تھی۔ اسے پیدا ہونے پر چند دن ہو گئے تھے مگر میری سانس نہیں آتی تھی۔

”احمد! مجھے لگتا ہے کہ چھوپو کو بچی کی خوشی نہیں۔“ نہیں، نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، اصل میں اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ورنہ وہ ضرور آتیں۔“

میں سمجھ گئی کہ احمد مجھے بہلا رہے ہیں، سوچ رہی تھی۔

ابھی ہم آپس میں باتیں کر رہی رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ میری ساس اور میرا پورا فضل عباس اور نند بھتیجہ آئے ہیں۔ احمد کو میرے پاس دیکھ کر میری ساس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”تم بروقت ادھر ہی گئے رہتے ہو یا زمینوں پر بھی جاتے ہو؟“ چھوپو دھڑکا۔

”ارے امی جان دیکھیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتنی پیاری پوتی دی ہے۔“ احمد نے ماں کا دھیان بنانے کو کہا۔

چھوپو نے معارج کو گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ احمد بھی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اپنے بھائی فضل کو لے کر باہر چلے گئے۔

چھوپو اور بھتیجہ دوکانی پر تک بیٹھی رہیں۔ امی اور عباس بھائی نے کھانا پکوا دیا اور کئی طرح کی ڈشیں پکوا دیں۔

چھوپو نے رخصت سے کھانا کھا یا بھی میں دل میں شکر ادا کرتے ہی کہ اللہ کرے ایسا ہی امین رہے۔

ہاں بولے۔

”احمد بھائی میں بھی چپ رہ کر حالات کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ میری بہن کے ساتھ جو جزیادتیاں ہوئی ہیں وہ میرے علم میں ہیں۔ میری بہن مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ میں ساری زندگی اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ لیکن اگر ہمیں اپنے پاس ہی بھائی ہوں تو پھر اُن کی شادی کرنے کا کیا فائدہ؟“

اگر چھوپو کے پاس میری بہن محفوظ رہتی تو میں کبھی بھی اسے وہاں سے نہ لاتا، رہنے کی الزام کی بات تو بھلا مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں الزام لگاؤں جو حقیقت تھی ہو کہہ دی۔ ”وہ سانس لینے کے لیے رُکے پھر بولے۔“

”اب بھی میرا مشورہ ہے کہ تم عورتوں کی نظر سے حالات کو مت دیکھو بلکہ اپنی سوچ کی گہرائیوں سے حالات پر نظر رکھو جو حقیقت کیا ہے ہمیں خود ہی احساس ہوجائے گا۔“

”دیکھ اب میں ہی کوئی فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ احمد یہ کہہ کر چلے گئے۔

پورا ہفتہ اسی شرمش میں گزر گیا کہ احمد کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ عباس بھائی بالکل چپ تھے اور میں اپنی قسمت کے فیصلے کی منتظر تھی۔

آخر ایک دن احمد مسکراتے ہوئے آئے۔

”بھائی عباس نے بڑی گرجوٹی سے اُن کا استقبال کیا۔ عباس! تمہاری باتیں مجھ پر اثر کر گئی تھیں اور میں نے تمہاری باتیں میرا ہوا سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کیسا باپ ہوں کہ اپنی اولاد کی حفاظت نہیں کر سکتا اور میں کیسا شوہر ہوں کہ اپنی بیوی کی بھی حفاظت نہ کر سکتا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو علیحدہ رکھوں گا۔ میں نے علیحدہ گھر لے لیا ہے۔ کوثر اور میرے بچے علیحدہ رہیں گے۔ اُن کے ساتھ دو ملازماں بھی رہیں گی، جبکہ گیت پر ایک اور ملازم بیہرہ دے گا۔“ احمد مضبوط سمجھے میں بولے۔

میں احمد اور عباس بھائی کے ساتھ اپنے گھر آئی۔ میری ماں نے مجھے آٹھ سو روپے کے سنگ اور بارہ روپے تک کیا۔

اب میں تھی احمد کی محبت تھی اور درود و رستگ پھولوں کی راہ گزرتھی۔

میری ساس نے پہلے تو احمد کو خوب باتیں سنائیں، دودھ نہ بننے کی دھمکی بھی دی۔ پھر تھک ہار کر چپ ہو گئی۔

احمد نے حالات کو بخوبی سنیا لیا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے قطع تعلق کر رکھا تھا اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا کہ ایک روز چھوپو میرے گھر آ گئیں۔ انہوں نے درود کر مجھ سے فریاد کی کہ میں احمد کو سمجھاؤں۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ میں نے ہاں بھری۔ احمد بھی اب خوش رہنے لگے تھے کہ اُن کی ماں مان گئی ہے۔

میرے اللہ نے ایک بار پھر مجھے خوشی دکھا دی میں دوبارہ امید سے تھی۔ یوسف زیادہ تر بھائی عباس کے پاس رہتا۔

جیسے جیسے میرے دن قریب آ رہے تھے۔ میں گھبرا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

احمد مالٹوں کے ٹرک سندھ کی طرف بھیجتے تھے۔ حیدر آباد اور ساکھڑ میں تو ہمارا مالنا خوب فروخت ہو جاتا تھا۔ کراچی میں البتہ دیر ہو جاتی۔ احمد نے فیصلہ کیا کہ اس بار وہ خود ٹرک کے ساتھ کراچی جائیں گے۔ آخر کار احمد چلے گئے اور جاتے جاتے مجھے خوب حوصلہ دے گئے۔ میری ساس اور نند میرے پاس تھیں۔

بھائی عباس بھی اپنے دوستوں کے ساتھ میری کمر کو گئے ہوئے تھے جبکہ امی اپنے کمر پر ہی مصروف تھیں۔

میں دن رات دعا مانگتی کہ اللہ تعالیٰ مجھے خیر و خوشی کے ساتھ فارغ کر دے۔ مجھے رات کو تکلیف ہو گئی۔ میری ساس کی نوکرائی بھاگ کر اپنی پرانی دانی کو بلا لائی۔ ساری رات میری تکلیف میں ہی گزرتی۔ صبح کو میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔

دانی نے جلدی سے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر میری چادر پانی کے پیچھے چھپک دیا۔

”کیا کر رہی ہو دانی ماں تم نے بچے نیچے کیوں چھپک دیا ہے؟“ میں نے تقاضے سے پوچھا۔

”تم نے مردہ بچے کو جنم دیا ہے کوثر بی بی اس لیے میں نے بچہ چار پائی کے نیچے پھینک دیا ہے۔ تم اٹھنا مت میں ذرا تمہاری ساس کو خبر کر آؤں۔“

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ میں بے آواز رو رہی تھی، جب میری ساس اور اُس کی نند اندر کمرے میں داخل ہوئیں۔ پیچھے پیچھے دانی بھی تھی۔

”بچہ ہے بیگم صاحبہ۔“ دانی نے بچے کو چار پائی کے نیچے سے نکالے ہوئے کہا۔

”ادھر کچھ دو۔“ جب پھوپھو نے اپنے پوتے کے اوپر سے کپڑا اٹھایا تو دیکھا کہ بچہ ساس لے رہا تھا۔ مجھے بھی محسوس ہو گیا تھا کہ میرا بچہ زندہ ہے۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا لیے تاکہ پھوپھو مجھے بچہ دیں۔ میں جیسے جیسے ہاتھ آگے کرتی وہ بچے کو پیچھے کر لیتیں۔

”تمہیں بیٹا چاہو؟ کوثر؟ بھلا تمہاری شکل ایسی ہے کہ تم بیٹا پیدا کر سکو۔“ پھوپھو غوغا لہجے میں بولی۔ میں کانپ کر رہ گئی۔

”پلیز پھوپھو میرا بچہ مجھے واپس کر دیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ میرا بیٹا کچھ دے دیں۔“ میں نے گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں ہو یہ لو اپنا بیٹا۔“ پھوپھو نے بچے کو میری طرف بڑھایا جیسے ہی میں ہاتھ لگی اُس نے فوراً ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں رو پڑی۔

”ابھی سے کیوں رو رہی ہو ابھی تو تمہیں بہت کچھ دے رکھتا ہے۔ یہ ایک نظارہ دیکھو۔“ یہ کہتے ہی میری ساس نے میری آنکھوں کے سامنے میرے بچے کو ایک ہاتھ سے پکڑا اور اس کا گلا اپنی گرفت میں لے کر بچے کی سانس ختم کر دیں۔ میرا بیٹا میری آنکھوں کے سامنے تھم کر دیا گیا۔ میری ظالم ساس نے اپنے ہی پوتے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا۔

نفخا خاموش تھی، ہوا میں ساکت ہو چکی تھیں اور تو اور خدا کی خدائی بھی چپ تھی۔ میں تو جیسے سکتے میں آگئی تھی۔

”مائیکر ڈائنا میگر۔“ میری ساس نے اپنے پالتو

کی جات میں کچھ کر میرا کلیجہ کانپ کر رہ گیا۔

ہم اسپتال میں پندرہ دن رہے اور جب احمد پوری طرح سے صحت مند ہو گئے تو ہم واپس آئے۔ گھر آ کر اچھے بھرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”اچھے بھٹھے معاف کر دینا کہ میری ماں ایک بار بچہ اپنا ہار کر گئی ہے۔ اور میں کتنا مجبور ہوں کہ ماں کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ ہاں بس اتنا کر سکتا ہوں کہ ساری زندگی ماں کو اپنا منہ نہیں دکھاؤں گا۔“ بھائی عباس اور میں چپ کر کے بیٹھے رہے۔ پھوپھو نے اس بار اپنا وار خوب کیا تھا۔ میں نے اپنا معاملہ خدا کو سونپ دیا تھا۔ احمد جب بالکل ٹھیک ہوئے تو اپنے بھائی فضل عباس کے پاس گئے اور زمینوں کے بنوارے کی بات کی۔

”بھائی احمد مجھے ای سے منع کر دیا ہے کہ احمد کو ایک مزل نہ دو کہ ابھی نہیں دینا ہے پھر میں کیسے آپ کو مارا دھڑے دوں؟“ فضل کینٹی سے بولا۔

”اچھے بہت زور لگا کر دیکھا لیکن انہیں زمین نہ ملی رادری نے بھی بہت زور لگا دیا لیکن پھوپھو نہ مانی۔ ہم بھر بھر کر کے بیٹھ گئے۔ فضل عباس کی موج ہو گئی کہ مالے کے باغات اور ساری زمینیں اُسے منت میں مل گئیں۔

ایک بار پھر عباس بھائی نے مجھے سہارا دیا۔ انہوں نے میرے ہاتھ کی زمین تین تین مربع اور مالے کا باغ میرے نام کر دیا۔ میں نے مختار نامہ احمد کو دے دیا۔

”اچھا لیکن سنجیدہ ہو گئے تھے۔ وقت اور حالات نے وہ لگاؤ لگائے کہ ابھی بھی ختم نہ ہوں۔ سب دوست اور غریب ختم ہو گئے تھے۔ سارا دن اپنے رقبے پر گزرتے اور غم کو گھر آجاتے۔ یوسف اور معارج میں تو گویا اُن کی جان تھی۔ وقت پر لگا کر اڑتا رہا احمد اپنے قول پر شہر ہے۔ اس دوران میرے جڑواں بچے ہوئے۔

”یہ گناہ میں نے یوسف کر لکھا اور بیٹی کا نام ماندہ رکھا۔ میرے بچوں کی پیدائش پر میرے سر چھپ کر آئے۔ میں تو پھر بھی اُن سے بول پڑی لیکن احمد بالکل ٹھیک نہ ہوئے اور اُنھ کے باہر چلے گئے۔ میرے سر سے ٹھوڑی دیر نہ گزری اور واپس چلے گئے۔

پھوپھو کو اپنے میاں پر بھی خوب رعب تھا۔ وہ بیچارے کچھ بھی نہ کہہ سکتے تھے بس ایک خاموش تماشا بنی تھے۔ باہر البتہ وہ خوب گل کھاتے تھے۔

جائیداد وہ اپنی بیوی کے نام کر چکے تھے۔ اس لیے کسی بھی معاملے میں وہ نہ بولتے۔ زیب پھوپھو نے اپنی شادی کے کچھ عرصے بعد اُن کی ساری دولت جائیداد اپنے نام کر دلی تھی۔

کچھ دنوں سے میں عباس کا رویہ بھی بدلا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ بھائی جو میری ہر بات پر سر جھکتا تھا اب اُس کے تیور بدلے سے نظر آ رہے تھے۔ میں پریشان تھی کہ عباس کیوں بدلا سا لگتا ہے۔ ایک روز مجھے موقع ملا تو میں نے بھائی سے پوچھا۔

”عباس کیا بات ہے تمہارا رویہ مجھے تبدیل سا لگتا ہے؟“

”نہیں تو کوثر میں بھلا کیوں تبدیل ہوں گا۔ بس سارا دن اپنی زمینوں پر رہتا ہوں اُسی کی پیشکش رہتی ہے۔“ عباس دھستے لہجے سے بولا۔

”میں نہیں مانتی عباس تمہاری اس بات کو تم پہلے بھی مصروف رہتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ میرا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔ اور اب تو کوئی ٹی دن گزر جاتے ہیں تمہاری صورت ہی نظر نہیں آتی ہے۔ اور تو روہ بچے بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔ تم اپنی مصروفیت میں انہیں بھی بھول گئے ہو۔“ میں نے بھائی سے شکوہ کیا۔

”میں شرمندہ ہوں کوثر کہ بچوں سے غافل ہوا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ بچے کہاں ہیں؟“

”ہم یہاں ہیں ماموں جان۔“ یوسف کی آواز دروازے سے آئی معارج بھی ساتھ تھی۔

”آؤ میرے یار کہاں تھے تم؟“ عباس مسکراتے ہوئے بولے۔

”میں تو یہیں پر ہوتا ہوں ماموں جان لیکن لگتا ہے آپ کسی اور جہاں میں کم ہیں۔“ یوسف شرارت سے بولا۔

”بڑا شیطاں ہو گیا ہے یار تو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری بڑھائی کبسی ہو رہی ہے؟“

”بس سوسو ماموں جان۔“ ویسے ایک بات

بتاؤں میرا پڑھائی میں بالکل بھی دل نہیں لگتا ہے۔
 ”بڑی بات یوسف! ایسا کیوں کہتے؟ تمہیں پڑھنا ہے اور بہت زیادہ پڑھنا ہے۔ معارج کا بھی خیال رکھا کرو تا کہ اُس کی پڑھائی بھی خوب ہو۔“ عباس بخیرگی سے بولے۔
 ”میری پڑھائی کو چھوڑیں ماموں آپ بھی تو آج کل خوب پڑھ رہے ہیں۔“ یوسف نے شوکی سے کہا۔
 ”میں پڑھ رہا ہوں؟ وہ کیسے بھلا؟“ عباس نے حیرت سے پوچھا۔
 ”وہ ایسے کہ آپ آج کل نہت اکڈی میں کچھ زیادہ ہی پڑھ رہے ہیں اور باقاعدگی سے وہاں جا رہے ہیں۔“ یوسف کی بات سن کر عباس گھبرا گیا، جبکہ میں چونک گئی۔
 ”آؤ یار باہر بیٹھے ہیں تھوڑی سی گپ شپ لگا میں۔“ عباس یوسف کو باہر لے کر چلا گیا، جبکہ میں نہت میں کھوئی تھی۔
 ”نہت رشتے میں میری کزن لگتی تھی۔ میری ساس کی سندی اکھوٹی بیٹی۔ میری ساس کی وہ بی بی جس نے میری ساس کے ساتھ مل کر میرے بیٹے کا قتل کیا تھا۔ لیکن عباس وہاں کیوں جاتا ہے؟“ میں سوچنے لگی۔
 اب یوسف آئے تو میں اُس سے سارا حال پوچھوں۔ یوسف کے آنے تک میں کئی چکر گیت کے لگا چکی تھی۔ اور جب وہ آیا تو میں تھک کر آرامے میں بیٹھی تھی۔ عباس باہر سے ہی چلا گیا تھا۔
 ”یوسف تم کپڑے تبدیل کر کے میرے پاس آؤ۔ مجھے تم سے کچھ اہم اور ضروری بات کرنی ہے۔“
 ”جی امی میں ابھی پانچ منٹ آیا۔“ یوسف کے آنے تک میں نے کمرے میں کافی چکر لگا لیے تھے اور جب وہ میرے پاس آیا تو میں صوفے پر بیٹھی تھی۔
 ”جی امی فرمائیے کیا بات کرنی ہے؟“
 ”یوسف جنتا مجھے یہ بتاؤ کہ یہ نہت والی کیا بات ہے؟“ یوسف نے چونک کر مجھے دیکھا۔
 ”اسکی تو کوئی بھی بات نہیں ہے امی جان۔“ مجھے یوں لگا جیسے میرا اپنا مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔

”دیکھو بیٹا تم مجھے سب کچھ بتا دو جو کچھ بھی تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔“ میں نے قدرے سختی سے پوچھا۔ یوسف میرے قدموں تلے بیٹھ گیا اور بولا۔
 ”امی جان میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ماموں عباس آج کل نہت آئی کے گھر بہت پکڑا رہے ہیں۔ اور میں نے خود کی بارائیں وہاں پر دیکھا ہے۔“
 ”لیکن تم وہاں کیا لینے جاتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میرا دوست حمزہ وہاں رہتا ہے، نہت آئی کے پڑوس میں اُن کا گھر ہے۔ میں حمزہ سے ملنے جاتا ہوں اس لیے آتے جاتے میں نے کئی بار ماموں کی گاڑی وہاں کھڑی دیکھی ہے۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ اور سنو کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ مت کرنا۔“
 ”جی بہتر امی جان۔“ یوسف سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ میرا بھائی تو ایسا بالکل بھی نہیں تھا پھر وہ وہاں کیسے پھنس گیا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ نہت کی ماں اور میری ساس نے مل کر مجھ پر کتنے ظلم کیے ہیں؟ وہ تو سب کچھ جانتا ہے پھر وہاں کیوں جاتا ہے۔“ میں پریشان ہو گئی۔ چند دن امی پریشانی میں گزر گئے۔
 عباس آیا تو میں نے اُس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
 ”مجھے چاہیے کہ بتاؤ عباس تم نہت کے گھر کیلئے جاتے ہو؟“ میرے اس طرح پوچھنے سے عباس گھبرا گیا۔
 ”میں نے بھلا وہاں کیا لینے جاتا ہے۔ آپ کو کوئی غلط اطلاع دی ہے۔“
 ”مجھے کسی نے بھی غلط اطلاع نہیں دی ہے بلکہ میں خود رانا گھر گئی تھی۔ میری ایک ملنے والی نے مجھے ملنا دیشرف پر بلوایا تھا، تب میں نے وہاں تمہاری گاڑی دیکھی تھی اور وہیں سے مجھے پتا چلا کہ تم وہاں روزانہ جاتے ہو۔“ میں نے غصے سے کہا۔
 ”اصل میں کوثر بات یہ ہے کہ میں نہت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عباس نے نظریں جھکا کر

بولے کہا۔
 میرے بھائی نے بات نہیں کی اک دھماکہ کر دیا تھا جیسے حایرے دل پر ہوا۔
 ”تم کیا کہہ رہے ہو عباس.....؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اُس کی ماں نے میری ساس کے ساتھ مل کر مجھ پر کتنے ظلم کیے ہیں۔“ میں روتے ہوئے بولی۔
 ”معاف کرنا کوثر..... میں اب کوئی بھی گزری بات نہیں دہراتا چاہتا اور پھر اس معاملے میں بیماریا نہت کا کیا قصور ہے؟ اُس نے تو کسی کو بھی نہیں سکھایا کہ تم پر ظلم کیا جائے۔ وہ اچھی لڑکی ہے اور پھر اپنے خاندان کی ہے اس لیے میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں امی جلد ہی وہاں جانے والی ہیں۔“ عباس مضبوطی سے بولا۔
 ”مجھ پر تقدیر ایک بار پھر وار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میں جان کی سی کہ عباس کو پھنسانے میں جس کا ہاتھ ہے، لیکن افسوس کہ اب معاملہ کافی آگے بڑھ چکا تھا خیرا بھائی مجھ سے اتنا دور ہو جائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“
 شام کو جب احمد گھر آئے تو میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی۔
 اور مجھ کو فیصلہ امید ہے کہ وہ میری بات مان جائے گا۔ احمد مجھے دلاسا دیتے ہوئے بولے۔
 ”اور اگر وہ نہ مانا تو.....؟“ میں پریشان ہو گئی۔
 ”میرے خیال میں یہ وہ میری بات مان جائے گا تم تو اچھی طرح سے جانتی ہو کہ عباس میرا بہت لحاظ کرتا ہے اور میری بات مانتا ہے۔ یقیناً وہ میری بات مجھ کے لئے ہو رہا ہے؟ امی جان پہلے میری شادی نہت سے کرنا چاہتی تھیں لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ میں جینی ہوئی چاہتا تھا وہ ویسی نہیں تھی۔ اور پھر دل جس پر آئے وہی زندگی کا سہارا بننا ہے اور چونکہ میرا دل تم پر آ گیا تھا اس لیے میں نے نہت کو گھر کر تمہارا ہاتھ لگائیے مانگا تھا۔“ احمد جب شرارت سے بولے تو مجھے شرم آ گئی۔

”چھوڑیے بھی آپ تو ہر بات میں اپنی اور میری بات لے آتے ہیں۔“ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔
 جواب میں احمد کا بھرپور قہقہہ فضا میں پھیل گیا۔
 ☆.....☆.....☆
 ایکشن قریب آچکے تھے احمد کے دوست بڑے پرجوش تھے کیونکہ اُن کا ایک قریبی دوست ایم این اے کی سیٹ پر ایکشن لڑ رہا تھا۔ احمد سارا دن مصروف رہتے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا اور نہ ہی کچھ پینے کا ہوش تھا۔ میں بعض دفعہ مذاق کرتی۔
 ”مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آپ کا دوست ایکشن نہیں لڑ رہا بلکہ آپ خود ایکشن لڑ رہے ہیں؟“
 ”نہیں یوں ہی مجھ کو کہ میں خود ایکشن لڑ رہا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔
 ”ارے ہاں کوثر تم شام کو ذرا تیار کر رکھنا اور بیویں کو بھی تیار کر لیتا۔ ہم سب آج عباس سے ملنے جائیں گے۔“
 ”کیوں جناب خیریت تو ہے۔ میری ماں اور بھائی سے ملنے کا خیال کیسے آ گیا ہے؟“ میں نے قدرے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔
 ”جی جناب بالکل خیریت ہے آپ اپنی والدہ سے مل لیجئے گا اور میں ذرا اپنے سالے صاحب سے دو دو ہاتھ کر لوں گا۔ سنا ہے موصوف میرے مخالف گروپ میں ہیں۔“ احمد شرارت سے بولے۔
 ”مخالف گروپ.....؟“ میں کچھ نہیں سمجھی۔
 ”ایک تو تم بہت بھولی ہو کوثر..... مخالف گروپ کا مطلب یہ ہے کہ عباس ہمارے مخالف امیدوار سے مل گیا ہے۔ وہ اور اُس کے تمام دوست ہمارے خلاف حماز بننا چکے ہیں۔ ہر جگہ پر ہماری مخالفت کر رہے ہیں، حالانکہ عباس اچھی طرح سے جانتا ہے کہ جس شخص کا وہ ساتھ دے رہا ہے وہ بھٹک نہیں ہے۔ کئی بار وہ جیل کی سیر کر چکا ہے اس کے باوجود وہ اُس کے ساتھ ہے۔“
 ”میں حیران ہوں احمد کہ عباس ایسا کیوں کر رہا ہے..... حالانکہ وہ کبھی بھی ہمارا مخالف نہیں ہوا ہے بلکہ اُس نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے۔“ میں دکھ سے بولی۔

ماند خوش تھے کہ ان کا ماموں لندن جا رہا ہے۔ وہ اک خوشگوار صبح تھی۔ صبح سے آسان پر کالے کالے بادل تھے اور خوب چمکندی ہوا چل رہی تھی موسم یکدم اچھا ہو گیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بھجا بھجا سا تھا۔ عباس اپنے چند دوستوں کے ساتھ میرے گئے گیا ہوا تھا۔ آج کل اُس نے نشہ چھوڑ رکھا تھا اس لیے اُس کے دوست اُس کا دھیان بنانے کو کہیں نہ نہیں لے جاتے تھے۔

میں اور ای باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک گیٹ زور سے بھا..... یا الٹی خیر میرا دل زور سے دھڑکا۔

میری نوکرانی نورال گیٹ کھولنے لگی دوسرے ہی لمحے وہ بھاگتی ہوئی واپس آئی۔

”باجی باجی وہ عباس بھاگی“ اُس نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا ہوا عباس کو؟“ میں اور امی گیٹ کی طرف بھاگ پڑیں۔ عباس کے دوست چار پائی پر اُسے لے کر اندر داخل ہوئے۔ عباس بالکل ساکت تھا۔

”اُسے کیا ہوا ہے محمود بھائی؟“ میں نے چیخے ہوئے کہا۔

”کوثر باجی ہم سب میرے کمرے کے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک برف خانے پر عباس رک گیا اور ہم سے بولا کہ یہاں اُس کا ایک دوست رہتا ہے اُس سے بھی مل لیا جائے۔ ہم سب مل کر برف خانے چلے گئے اور وہاں گھنٹہ بیٹھے رہے، پھر ہمیں عباس کے کمرے میں کیا سہانی کہ اُس نے برف خانے کے سرد پانی میں نہانا شروع کر دیا۔ ہم سب نے منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ نہانے کے دوران ہی اُسے کچھ ہو گیا۔ کم نور اُدھر عباس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے لیکن ڈاکٹر نے ہمیں جواب دے دیا ہے اُس کا کہنا ہے کہ اُس کا دل بالکل سرد ہو گیا ہے۔ اندر خون جم گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔“

”نہیں نہیں ایسا تم کہو۔ اللہ کرے میرے بھائی کو کچھ نہ ہو۔“ میں رونے لگی۔ امی تو بھانے کب بے ہوش ہو چکی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بھائی عباس

میرے سامنے دم توڑ گیا میں کچھ بھی نہ کر سکی۔

لوگوں کا ایک جھوم ہمارے گھر میں اُٹھنا تھا۔ سب ہی عباس کی جوان مرگی پر رورہے تھے۔ میری اور امی کی تو حالت ہی خراب تھی۔ میرا چھوٹا بھائی علی اور میرے ابو ہمارے پاس ہی رہ رہے تھے، جبکہ چھوٹی امی روز آتی تھی اور رات کو واپس چلی جاتی تھیں۔

امی ابھی تک کوئے میں تھیں اور دن رات انہیں مختلف ڈاکٹرز اینڈ کر رہے تھے۔ اُن کی حالت بے حد سیریس تھی۔ آخر ایک دن مسلسل بے ہوشی میں مرتے ہوئے وہ بھی انتقال کر گئیں۔ مجھے پر تو کیے بعد دیگرے ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

میں بھی کتنی بد قسمت تھی کہ کوئی بھی رشتہ مجھے راس نہ آسکا۔ امی کے چہلم کے بعد میں نے ابو کے پاس رہنے کی خواہش کی۔

”نا..... بابا نا..... ہم تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتے ہیں۔“ نئی امی چمک کر بولی۔

”جو بھی تمہارا دیا ہے وہ مر گیا ہے۔ تم محسوس ہو سبز قدم ہو۔ ہم تمہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے لیے مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ ہم سے جہاں تک ہو سکا ہم تمہاری مدد کر دیا کریں گے۔“ میری چھوٹی امی یہ سب کہہ کر ابو اور علی کو لے کر چلی گئیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور میں اکیلی جان.....

عباس کی سب زمینوں پر میرے ابو قبضہ کر چکے تھے۔ میرے حصے کی وہی زمین تھی جو عباس نے میرے نام کی تھی۔

ایک دن میں ہمت کر کے اپنے سرسرا چٹائی۔ میری ساس اپنے کمرے میں ہی موجود تھیں۔ میں چپ کر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

میری ساس کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی وہ چیخ پڑی۔

”اری متھوس ادھر کیا کرنے آئی ہے؟ تیرے قدم جہاں بھی پڑتے ہیں وہاں موت پھیرا مار رہی ہے ادھر کیا لینے آئی ہے؟“

”چھو پو آپ کو اللہ کا واسطہ ہے ایسا تم کہیں۔“

میں اب کی بہو ہوں، آپ کی جتنی بھی ہوں۔ آپ نے مجھ کو کیا ہے۔ میں نے صبر سے کام لیا لیکن اب میں ٹھنکی ہوئی۔“

”میں کتنی ہوں یہاں سے دفع ہو جا ورنہ دھکے دے کر کال دوں گی۔“

”چھو میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں میرے بچے بچک جائیں گے۔ آپ کے احمد کے بچے بچک جائیں گے۔“ میں رونے لگی۔

”میں کتنی ہوں میرا تیرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جہاں گیا احمد وہیں ہی اُس کی اولاد۔“ زریب چھوٹی تھی۔ اب تو میں وہاں سے مایوس لوٹ آئی۔

اب میں تھی اور میرے بچے۔ اس صورت حال میں مجھے چھوڑ چکے تھے۔

میں نے اپنی زمینوں پر خود ہی کاشت کاری کرنے کا سوچا۔ اس سلسلے میں جب میں اپنی زمینوں پر گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہاں پر تو میرے دیور فضل عباس کا قبضہ ہے۔ وہ بھی وہیں پر موجود تھا۔

”فضل تم میری زمینوں پر کیا کر رہے ہو؟“ میں نے جرائی سے پوچھا۔

”تمہاری زمینیں.....؟ بھلا تمہاری زمینیں کہاں سے آئیں؟“

”یہ تو میری ہیں۔“ فضل مکاری سے بولا۔

”اپنی زندگی میں ہی عباس یہ زمینیں مجھے فرخند کر چکا تھا۔“

”لیکن یہ تو میرے نام تھیں۔“ میں نے پریشانی سے کہا۔

”آج کل بھلا کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ ہم نے بھی تھوڑا سا میرے خرچ کیا اور سب کچھ ہمارے نام ہو گیا۔“

”یہ دھوکہ ہے، فراڈ ہے۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”اگر یہ دھوکہ ہے فراڈ ہے تو عدالت میں ثابت کر دیاں پر کیا لینے آئی ہو۔“ فضل عباس ہنستے ہوئے بولا۔

میں اکیلی عورت بھلا میری کس نے سنی تھی میں

ایک بار پھر اکیلی ہو گئی تھی۔

بچوں کی خاطر میں نے لوگوں کے کپڑے سینا شروع کر دیے۔ اُن کا روزگار بھی تو بنانا تھا۔ میں دن رات محنت کر رہی تھی تاکہ میرے بچے پڑھ لکھ سکیں۔

اس دوران میری ساس نے مجھ پر ہزاروں الزام لگائے۔ ہر آئے گئے کو میرے بارے میں فرضی کہانیاں سناتی رہتی۔ جو عورتیں مجھ سے کپڑے سلوانے آتی تھیں وہ مجھے سارے حال کہہ دیتی تھیں۔ میں صبر و شکر سے وقت گزار رہی تھی۔ مجھ پر جتنے بھی ظلم ہوئے تھے میں نے اُن کا حساب اپنے خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا بڑا بیٹا یوسف میٹرک میں تھا، معارفِ فیم جماعت میں تھی، جبکہ پوتوں اور ماندہ آٹھویں جماعت میں تھے۔ وقت کا کام ہے گزرنا سو گز رہا رہا۔

مجھے اپنے سرسرا اور سیکے کچھ خبر نہ تھی۔ نہ ہی اُن لوگوں نے میری کوئی خبر رکھی اور نہ ہی میں نے اُن کی کوئی خبر کر لی۔

ایک دن رانا گھر سے مجھے ایک عورت ملنے آئی۔ وہ میری ساس کی کوئی ملنے والی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔

”کوثر بھئی مجھے تمہاری نند نے بھیجا ہے۔ اُس نے تمہیں بلایا ہے۔“

”میں نے حیرت سے پوچھا۔“

”تمہاری ساس بہت بیمار ہیں اور اُس کی حالت ایسی ہے کہ اُس کا دم اٹک گیا ہے۔ وہ نہ مری ہے اور نہ ہی جی رہی ہے۔ تم اک بار اُس کے سامنے چلی جاؤ ہو سکتا ہے تمہیں کچھ کروہ سکون سے مرے۔“

میں نے لوگوں سے سنا تو تھا کہ زریب چھو پو بیمار ہیں لیکن ایسی حالت میں ہوں گی یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں دم بخود تھی۔ آج وقت میرے ہاتھ میں تھا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں؟

”کوثر کیا سوچ رہی ہو؟“ ماسی سکینہ بولی تو میں چونک پڑی۔

”میں رانا گھر نہیں جا سکتی ہوں جس جگہ سے میں دھوکا رہی ہو وہاں نہیں جاؤں گی۔ چاہے جو کچھ

سچی کہانیاں

111

بھی ہو جائے،" ہاں سکینہ آخرا بوس واپس چلی گئی۔
پھر اُس کے بعد میرے پاس کوئی لگے لیکن
میں نہ گئی۔

ایک دن میرے سر آگے اور میرے سامنے
ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے سامنے میں مجبور
ہو گئی اور اُن کے ساتھ رانا گر چل پڑی۔
جب میں پھوپھو کے گھر پہنچی تو برادری کے سب
لوگ موجود تھے۔

میں سیدھی پھوپھو کے سامنے پہنچی۔ چار پائی پر یہ
بیٹا عورت قطعاً میری پھوپھو نہیں لگ رہی تھی۔ یہ تو کوئی
اور ہی عورت تھی۔ پھوپھو سر سے بالکل عجیب و غریب تھیں
چلیں اور ہنسون بھی غائب تھیں۔ سارے جسم میں
کیڑے بڑے پکے تھے، اس قدر بد بو تھی کہ لوگ دور دور
ہو کر بیٹھے تھے۔ پھوپھو نے مجھے دیکھا تو میرے سامنے
ہاتھ جوڑ دیے۔ میں تو خدا کا انصاف دیکھ رہی تھی۔

قدرت نے پھوپھو کو ہمت کا نشان بنا دیا تھا۔
مجھے رہ رہ کر اُس کی زیادتیاں یاد آ رہی تھیں۔
پھوپھو نے شاید میرے چہرے سے میرے دل کا حال
پڑھ لیا تھا، اُس نے ایک بار پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑ
دیے۔ میں خوف خدا سے کانپ اُٹھی۔

اگلے ہی لمحے میں کھڑی ہو گئی اور بلند آواز سے
بولی۔

"پھوپھو آپ نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا اُس
کے لیے میں آپ کو اس جہان میں معاف کرتی ہوں،
اُس جہان میں بھی معاف کیا۔"
میری اتنی کہنے کی دیر بھی اور پھوپھو کا دم نکل گیا۔
میں سر جھکائے وہاں سے نکل آئی کیونکہ اب وہاں کوئی
کا نہیں تھا۔

میری سلائی کا زور تھا۔ میری محنت کا مجھے خوب
بھل ل رہا تھا۔ میں تمام رشتے داروں سے علیحدہ بس
اپنے بچوں میں ہی مصروف تھی۔ میں جانتی تھی کہ
میرے بچے اس معاشرے میں اپنا ایک علیحدہ مقام
حاصل کریں۔

میرے پاس ایک لڑکی طاہرہ کیڑے سلوانے آتی
تھی۔ میں اگر فارغ ہوتی تو اُس کے ساتھ خوب گپ

شپ لگاتی۔

اب کچھ دنوں سے طاہرہ کا والد قادر بھی آتا اور
کیڑے لے جاتا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ طاہرہ بیمار ہے۔
ایک دن میں جلدی کا م سے فارغ ہو کر طاہرہ کے گھر
چلی گئی وہ مجھے باہر صحن میں ہی بل گئی۔

"ارے آنٹی آپ.....؟ زبے نصیب زبے
نصیب۔" طاہرہ مجھے دیکھ کر خوش دلی سے بولی۔

"میں نے سنا ہے کہ تم بیمار ہو؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں بس ایسے ہی کچھ دنوں سے بیمار ہو گیا تھا اور
آپ کو تو علم ہے کہ میری والدہ موجود نہیں ہیں، میں
چھوٹی سی تھی جب وہ فوت ہو گئی تھیں اس لیے کام کا
سارا بوجھ مجھ پر ہے۔ برادری والے اس مشکل گھڑی
میں ساتھ چھوڑ چکے ہیں، اس لیے بعض دفعہ آنٹی کام
کے بوجھ سے میں تھک سی جاتی ہوں۔" طاہرہ رنجیدگی
سے بولی۔

میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ آگے
بڑھ کر میں نے طاہرہ کو سینے سے لگایا۔
"نہ اداں ہو میری بچی..... مجھے اپنے ماں کی طرح
سمجھو۔"

"ہائے سچ آنٹی۔ بالکل سچ طاہرہ۔" میں نے
مسکراتے ہوئے کہا۔

نجانے کیوں مجھے اُس وقت طاہرہ پر بے حد پیار
آ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری بیٹی معارج میرے
سامنے موجود ہے۔

اب طاہرہ مجھ سے دنیا جہان کی باتیں کرتی اور
مجھے بھی اُس کی باتوں میں مزہ آتا۔

آہستہ آہستہ میں قادر بھیجی سے بھی بات چیت
کرنے لگی۔ اُس کی اپنی رشتیں تھیں۔ پیسے کی گنجائش
بالکل بھی نہیں تھی۔ طاہرہ اب مجھے اور بھی زیادہ پیار
لگتی تھی۔

وہ مجھ سے کیڑے سیدنا سکھ رہی تھی۔ صبح کو قادر بھیجی
اُسے میرے پاس چھوڑ جاتا اور رات کو واپس لے
جاتا۔

یوسف اور قادر بھیجی کی آپس میں خوب دوستی تھی۔
دونوں کا مشترکہ شوق تھا کبڈی۔ قادر بھیجی خود بھی کبڈی

کا بہترین کھلاڑی تھا۔ یوسف بھی کبڈی کا شوقین تھا اس
لیے دونوں کی آپس میں خوب دوستی ہو گئی تھی۔
معارج اور مائند البتہ اُس سے بچکتی تھیں۔ رہ گیا
پنس تو اُسے اپنی بڑھائی سے ہی فرصت نہیں تھی۔

مجھے پتا بھی نہ چلا اور قادر بھیجی میرے حواسوں پر
سوار ہو گیا۔ اب میں دن رات اُس کے خیالوں میں ہی
کھوئی رہتی۔ میری اس کیفیت کو سب سے پہلے معارج
نے محسوس کیا۔

"بی بی خیریت تو ہے، اب آج کل بڑی گم گم
سی رہتی ہیں؟" اب ہم پر بھی وہ توجہ نہیں ہے۔ خیریت
تو ہے؟

"ہاں بیٹا خیریت ہے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے
بس آج کل طبیعت کچھ خشک نہیں ہے۔"

"ای بی ہمارا آپ کے علاوہ کون ہے، ہماری
خاطر آپ اپنا خیال رکھا کریں۔" معارج نرمی سے
بولی تو مجھے اس پر بے اختیار پیار آ گیا اور میں نے
آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔

میں قادر بھیجی کو بھول نہیں پارتی تھی۔ وہ میرے لیے
امستون بنتا چارہا تھا۔ میں اپنی نمک کا سوچتی تو شرم سے
پالی پالی ہو جاتی کہ دل مجھے کن راہوں پر لے چلا تھا۔

میری اس بدلی کیفیت کو شاید قادر بھیجی نے بھی
محسوس کر لیا تھا۔ اب اُس کی نگاہیں مجھے پیغام دیتی نظر
آئیں۔ ایک دن دروازہ بجا میں دروازے پر کئی تو
آگے قادر بھیجی کھڑا تھا۔

بچے اسکول گئے ہوئے تھے، جبکہ یوسف اور
معارج کاغذ میں تھے۔

"آپ اس وقت.....؟ خیریت تو ہے۔" میں
نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بالکل خیریت ہے، میں نے آپ سے کچھ
ضروری بات کرنی تھی اس لیے حاضر ہوا ہوں۔" وہ
انکساری سے بولا۔

"اس وقت میں گھر پر اکیلی ہوں یعنی صاحب
آپ بچر کی وقت تفریف لے آئیں۔" میں نے تنبیہ کی
سے جواب دیا۔

"دیکھئے مگر میں بھی ایک شریف اور عزت دار آدمی

ہوں۔ مجھے خود سے زیادہ آپ کی عزت پیاری ہے۔ میں
آپ سے جو بات کرنا چاہتا ہوں اُس کے لیے مجھے تنہائی
کی ضرورت ہے۔ آپ مجھ پر مکمل بھروسہ رکھیں اور آرام
سے میری بات سن لیں۔" میں نے قادر بھیجی کی طرف ایک
نظر ڈالی اور پھر کچھ سوچ کر راستہ دے دیا۔

"ہاں اب بولیں مجھ سے کون سی ضروری بات
کرنی ہے.....؟" قادر بھیجی جب کمر پر آرام سے بیٹھ
گیا تو میں نے تنبیہ کی سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ کوثر صاحبہ کہ میں آپ سے خلوص
دل سے شادی کرنا چاہتا ہوں....." قادر بھیجی نے گویا
میرے سر پر دھماکا کیا۔

"جی.....؟" میں لو کھڑا گئی۔

"میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے اس
معاملے میں بات کروں لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔
بس آج ہمت کر کے چلا آیا ہوں۔ اصل بات کچھ یوں
ہے کہ آپ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ میں دل سے آپ کی
عزت کرنے لگا۔ جب مجھے طاہرہ کے ذریعے آپ کے
حالات کا پتا چلا تو میرے دل میں آپ کے لیے اور بھی
عزت بڑھ گئی۔ میری بیوی کو فوت ہوئے دس سال
ہو گئے ہیں، میں نے اپنی بیٹی کو ماں اور باپ کا پیار دیا
ہے۔ اُس کی ہر بات مانی ہے۔ لیکن اب میرا دل چاہتا
ہے کہ میری بھی کوئی ساتھی ہو جو میرے دکھ سکھ بانے،
میرا تخیل رکھے، مجھے پیار کرے۔ میں نے جب بھی
اپنی ساتھی کے بارے میں سوچا آپ پیغم سے میری
نگاہوں کے سامنے آ سکیں۔ میں نے دن رات آپ
کے بارے میں سوچا ہے اور اب طاہرہ سے مشورہ
کر کے آپ کے پاس آیا ہوں۔"

میں جو قادر بھیجی کی باتوں میں گئی آخری بات پر
چونک گئی۔

"جی کیا کہا آپ نے..... طاہرہ سے مشورہ۔"

"ارے آپ تو گھبرا گئی ہیں، اصل میں طاہرہ کو
جلدی ہے کہ آپ اُس کی امی بن جائیں، مجھ سے پہلے
اُس نے اپنی اس خواہش کا اظہار مجھ سے کیا ہے۔"
لیکن مجھے صاحب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ایک
بیوہ عورت ہوں اور میرے چار بچے بھی ہیں جو ماکہ

پھر صبح ہوگی!

محمد سلیم اختر



چند لکھاری کی طرف سے، کشمیری پریس منظر پر ایک یادگار داستان

کشمیری وادی اس دن سورج کی کرنوں سے منور تھی۔ ہر چیز صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔ کیواڑہ سے تین کلومیٹر پر ایک بڑا قبرستان ہے۔ جہاں سیکڑوں آزادی کے مجاہد شہادت کے درجہ پاتہ پڑے ہیں۔ قبرستان کے ارد گرد پہاڑیاں اور جنگل ہے۔ اکثر مجاہدین کا ٹھکانہ یہی جنگل اور پہاڑیاں ہیں۔ بھارتی فوجیوں سے اکثر جھڑپیں اسی علاقہ میں ہوتی ہیں۔ قبرستان کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ جو بھی بھیجی ہی آباد ہوتی ہے۔ جب مجاہدین اس مسجد سے آکر نماز ادا کرتے ہیں۔ بھارتی سولہ مسجد میں بھی ان پر گولیاں برسائے سے باز نہیں آتے۔ مسجد کا امام امین نامی ایک شخص ہے۔ جو نہایت ہی منطقی شخصیت اور بہادر انسان ہے۔ وہ مجاہدین کا ہمدرد اور ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ بھارتی فوج اکثر اس مسجد کو بھی مسمار کر جاتے ہیں مگر مولوی انھیں پھر سے خدا کے گھر کو آباد کر دیتا ہے۔

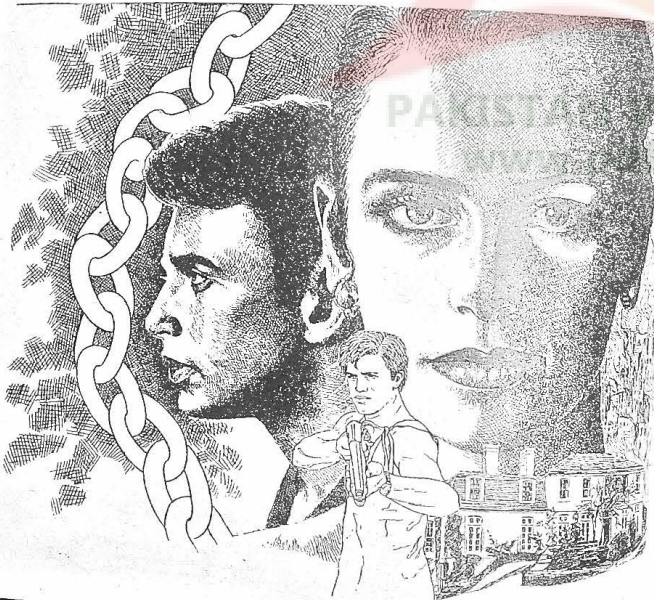
اس روز بھی مولوی امین مسجد کی مرمت میں مصروف تھا۔ وہ درود پاک کا ورد کرتا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ درود پاک کا ورد کرتا ہوا

اداسنا کی شہادت کا سن کر رونے لگی ہے۔
مولوی صاحب! تم ہماری یہاں آنے کی وجہ کو غلط سمجھ رہے ہو۔ میں میجر راکیش ہوں اور یہ میری بہن ارچنا ہے۔ یاسین ہمارا احسن ہے ہم اس کا شکر یہ ادا کرتے یہاں آئے ہیں۔
”ایک مجاہد، تمہارا احسن۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
مولوی امین حیرت بھرے لہجے میں بولا۔
”سچ ہے مولوی صاحب! آپ ہمیں اس کی قبر تک لے جائیں۔“ میجر نے جواب دیا۔

مولوی امین نے چند لمحوں سوچا اور پھر ان دونوں کو ساتھ لے کر ایک طرف چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ نینوں میں ہی بھارتی فوج نے یاسین کو بڑی بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔ مولوی صاحب نے یاسین کی قبر کے سر پر کچھ کران کو بتایا کہ یاسین شہید کی قبر ہے۔ یہ کشمیر کے مجاہد کی آخری آرام گاہ ہے۔“
میجر کی بہن ارچنا قبر کے قریب بیٹھ گئی اور میجر

دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جبکہ میجر راکیش دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی تھی۔ مولوی امین نے ان ہولناکیوں کی طرف دیکھنے لگا کہ یاسین نے ان لوگوں پر کون سا احسان کیا تھا کہ ایک ہندو میجر احترام کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے اور ایک ہندو لڑکی اس کی قبر پر بیٹھی رو رہی ہے۔ اسے یہ سب کچھ ناقابل یقین لگ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہندو اور وہ بھی فوجی تمام کشمیریوں کے جانی دشمن ہیں۔ ان سے کسی قسم کے انصاف اور ہمدردی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی اسے ان دونوں بہن بھائی کا یہ انداز کوئی ڈرامہ ہی لگ رہا تھا۔ اس نے آج تک کسی بھارتی کی زبان سے کسی مجاہد کے لیے ایسے الفاظ سنے تھے۔ اس نے پوچھا۔

”میجر صاحب! میں جاننا چاہوں گا کہ یہ یاسین شہید نے آپ پر کون سا احسان کیا تھا کہ جن کا بدلہ



چکانے آپ قبرستان تک چلے آئے ہیں؟“
”مولوی صاحب! میں بتاتی ہوں کہ یاسین شہید نے مجھ پر کون سا احسان کیا ہے۔“
ار چنا بولی۔ پھر اس نے بتانا شروع کیا۔

☆☆☆

ہمارے پتا جی آری میں کرل تھے۔ اب وہ ریٹائرڈ ہو چکے ہیں ان کی اولاد میں ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ میں راکیش بھیسا ہے چھوٹی ہوں۔ ہم دونوں کو بڑے ناز و نعم سے بالا لگایا۔ ہم دونوں کی ہر خواہش پوری کی گئی۔ راکیش میزک میں تھا اور میں مڈل میں تھی۔ جب ہمارے پتا جی کا تھلا کہ کشمیر کر دیا گیا۔ ہمیں اور ماما جی کو بھی ان کے ساتھ ہی آنا پڑا۔ کشمیر کے قدرتی حسین اس کی برف پوش چوٹیوں اور دلکش نظاروں کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی۔ وہاں ہی ہم نے تعلیم بھی حاصل کی۔ اور کشمیر کے بارے میں بہت ساری معلومات بھی ملیں۔ پتا جی کی زبانی میں یہ سننے بھی کہ کشمیر میں دہشت گرد رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی جان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ وہ بہت ظالم اور بے رحم ہیں۔ وہ نہ صرف بھارتی فوج کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بلکہ وہاں کے مقامی باشندوں کو بھی لوٹنے اور مارتے ہیں۔

پتا جی کا یہاں تک کر اور وہاں کے مقامی لوگوں کو دیکھ کر میں سوچتی کہ یہ مٹھی بھر دہشت گرد کیوں ہماری فوج سے ٹکر لیتے ہیں اور وہ کیا سوچ کر جان آگاہی پر لیے پھرتے ہیں۔ پتا جی مجھے ان مجاہدین کی بے رحمی کی ایسی کہانیاں سنا تے کہ میں ان سے نفرت کرنے لگتی۔ میں نے یہ غم نہ کر رکھا تھا کہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ان مجاہدین پر تحقیقات کروں گی۔ اور اصل معاملہ تک پہنچ کر دم لوں گی۔

☆☆☆

یوں ہی برسوں گزر گئے۔ پتا جی ریٹائرڈ ہو گئے اور ہم لوگ بھی میں رہنے لگے۔ اس عرصہ میں راکیش بھائی بھی آری میں بھر بی ہو گئے تھے۔ پتا جی کے ایک دوست بھی کرل ریٹائرڈ تھے۔ ان کی آپ بے

میں گہری دوستی تھی۔ کرل مہتا کا ایک بیٹا بلرام بھی کیپٹن تھا۔ میں نے ایک دو بار سی اسے دیکھا تھا۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس کی حرکات ہی ایسی تھیں۔ پتا جی میری شادی بلرام سے کرنا چاہتے تھے۔ مگر میں نے بلرام کے ساتھ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بلرام مجھے پسند کرتا تھا۔ اس لیے میرے انکار نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اور ایک روز سر بازار مجھے روک کر درازنگ دی کہ یہ اس سے شادی سے انکار مجھے بہت مہنگا پڑے گا۔ مگر میں نے اس کی کسی دھمکی اور دھونس کی پرواہ نہ کی اور سر بازار اس کے چہرے پر تعجب جڑ دیا۔ اور غصے سے ٹپکھانی ہوئی گھر لوٹ آئی۔

راکیش اور بلرام کی یونٹس الگ الگ تھیں۔ پھر بھی ان میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان دنوں دونوں کی یونٹس کشمیر میں ہی موجود تھیں اور آج بھی ہیں۔ میں نے اپنی تعلیم مکمل کی تو مجھے شملہ اور کشمیر کی سیر کا شوق چرایا۔ ساتھ ہی میں کشمیری مجاہدین کی زندگی کے بارے میں بھی جاننا چاہتی تھی۔

پتا جی سے بڑی مشکل سے اجازت ملتی تھی۔ مگر انھوں نے گاڑی اور ڈرائیور میرے ہمراہ کر دیا اور راکیش بھائی کو بھی اطلاع کر دی کہ میں کشمیر آ رہی ہوں۔ وہ میرا خیال رکھے۔ اور مجھے اکیلا وادی میں نہ گھومنے دے کیونکہ مجاہدین نہ صرف دہشت گرد ہیں بلکہ ہماری عورتوں کی عصمتوں کے لیے بے رحم بھی ہیں۔

☆☆☆

گاڑی جب کشمیر کی حدود میں داخل ہوئی تو راستے میں کئی فوجی چوکیوں پر ہماری گاڑی کو روک دیا گیا۔ میں بھائی کا حوالہ دیتی تو ہمیں آگے جانے دیا جاتا۔ کشمیر کی وادی میں داخل ہو کر یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں کسی اور دیس میں نکل آئی ہوں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اونچے اونچے پہاڑ اور ان پر چڑھ کے لیے لیے درخت، صاف خترا آسمان اور پھر جھاگ بنائی ہوئی ندیاں۔ کشمیر کے فطری لازوال حسن نے مجھے مسحور کر دیا۔ ہمارا ڈرائیور کشمیر ہی کا رہنے والا تھا۔ مگر وہ ہندو تھا۔ اسی لیے پتا جی

نے اسے میرے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ کشمیر اور وہاں کے باشندوں کے بارے میں معلومات رکھتا ہے۔ اسے میں خوش تھی کہ یہ مجھے کشمیر کی خوب سیر فراہم کرے گا۔ ابھی ہم نہیں کلو میٹر ہی آگے گئے تھے کہ ہمیں ایک فوجی چوکی پر روک دیا گیا۔ وہاں ایک فوجی بی کمری تھی۔ اس میں ایک کیپٹن اور پانچ مسلح فوجی بھی سوار تھے۔ کیپٹن کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ جب چوکی پر مجھے سے شناخت کرانے کو کہا گیا تو میں نے اپنے بھائی کیپٹن راکیش کا نام لیا تو جیب میں سوار کچن فوراً آٹرا۔ تو میں اس کو دیکھ کر گھبرا گئی وہ کیپٹن بلرام تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔

”اس کی شناخت کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے لوگوں کے ہاتھ کے انداز میں کہا۔ میں پھر چونک گئی۔ اس نے توبی کر دی تھی۔

”تم بوش میں تو ہو بلرام۔ میں ار چنا ہوں۔“ میں غصے سے بولی۔

”اس سے کیا فرق پڑے گا۔ آج تو میں نے تم سے خیر کا حساب چکانا ہے۔ جو تو نے مجھے سر عام مارا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ تم مجھے بہت مہنگا پڑے گا۔ اور وہ وقت آج خود ہی چل کر میرے قدموں میں آ گیا ہے۔ آج رات تم میری سہان ہوگی۔“ ”بکواس بند کرو کیپٹن بلرام۔“ میں نے غصے سے کھولے ہوئے کہا۔ ”مجھے جانے دو ورنہ یہ تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔“ میں نے پھر دھمکی کے انداز میں کہا۔

”کیا اچھا ہوگا اور کیا برا؟ یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ ابھی تو میرے ساتھ چلو۔“ اس نے میری گاڑی کا دروازہ کھولے ہوئے کہا۔

”ڈرائیور! گاڑی بھگاؤ۔“ میں پوری قوت سے جیٹی۔

ڈرائیور نے گاڑی تیزی سے بے گادی۔ مگر بلرام نے بھی اپنی فوجی گاڑی پر ہمارا پیچھا شروع کر دیا۔ دونوں گاڑیوں کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ میں اس وقت بہت ہی پریشانی کا شکار تھی اور اس وقت کو کوئے لگی۔ جب میں نے کشمیر کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔

”ڈرائیور! گاڑی اور تیز چلاؤ۔“ وہ حرام زادہ ہمارے قریب آچکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ڈرائیور اپنی پوری کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اندھا دھند گاڑی چلا نا بھی تو خطرناک تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف اتنی گہری کھائیاں تھیں کہ ان میں گر کر زندہ رہنا ناممکن تھا۔

”ار چنا جی اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ باقی ہے کہ ہم کسی گاؤں کے قریب گاڑی روک کر آبادی کی طرف بھاگ نکلیں۔ یوں ہمارے بچے کی امید ہو سکتی ہے۔“ ڈرائیور نے مخاطب کر کے بولا۔ ”ہم کو کون پناہ دے گا؟ اور ہم وہاں کیسے پہنچیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم کوشش اور بہت سے کسی آبادی میں پہنچ سکتے ہیں۔ جو ہوگی تو مسلمانوں کی گروہ ہماری حفاظت کی حامی بھر لی تو ہم پر کوئی آج نہ آنے دیں گے۔ یہ ان لوگوں کی ریت ہے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ جیسے تم مناسب سمجھ کر دو۔“ میں نے سب کچھ ڈرائیور کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

اس عرصہ میں ہماری گاڑی کافی آگے نکل آئی تھی۔ تاہم فوجی گاڑی مسلسل ہمارے تعاقب میں تھی۔ ایک جگہ آبادی دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی کچے راستے پر اتاری۔ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب اس نے گاڑی روکی۔ ہم اترے اور اندھا دھند آبادی کی طرف بھاگنے لگے۔ ہم تھوڑی ہی دور پہنچے تھے کہ پیچھے سے ایک فائر ہوا۔ میں نے دیکھا ڈرائیور خون میں لٹ پت ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مگر میں نہ رکی اور اپنی زندگی اور عزت سے بچانے کی خاطر بھاگتی رہی۔ مجھے یہ یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے زندہ بچا نہ جائیں گے۔ آخر کار میں ایک بستی میں داخل ہو گئی۔ ایک گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا تو میں اس کے اندر جا گھسی سامنے ایک عورت بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔

”آپ..... مجھے پناہ دے دو۔ بھگوان کے لیے میری زندگی خطرے میں ہے۔“ میں کہتے ہوئے اس عورت کے پاس جا کر گر پڑی۔ اس عورت نے مجھے اٹھایا۔ تسلی دی اور پوچھا۔

”کیا بات ہے بیٹی! اتنی بدحواس کیوں ہو؟“
 ”وہ... مم... میرے پیچھے۔“ میں نے
 بدحواسی سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 اتنے میں سامنے والے کمرے کے اندر ایک بزرگ
 نکلے اور بولے۔
 ”کون ہے تمہارے پیچھے بیٹی؟“
 ”وہ... بلرام... فوج کیپٹن۔“ میں نے
 بولکھلاہٹ میں جواب دیا۔
 ”تم اب کوئی فکر مت کرو بیٹی۔ انھوں نے
 مجھے دلا سہ دیتے ہوئے کہا۔“ اس تم ہماری مہمان ہو
 ہماری پناہ میں ہو۔ اب ہم یوں تمہیں کسی کے حوالے
 نہیں کریں گے۔ ہم گھر آئے مہمان کی حفاظت کرنا
 خوب جانتے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر کوئی
 آج نہ آنے دوں گا۔“
 اتنے میں ایک دوسرے کمرے سے ایک
 نوجوان لڑکی نکلی اور میری اور اپنے باپ کی طرف
 سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کے باپ نے اسے
 بتایا کہ بیٹی! یہ ہماری مہمان ہے۔ فوج اس کے پیچھے
 لگی ہے تم اسے اندر گودام میں جا کر چھپا دو۔“
 وہ لڑکی آگے بڑھی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے
 کے اندر لے گئی اور پھر وہاں سے ایک تنگ اور
 تاریک راستے کے ذریعے ایک اندھیرے کمرے
 میں داخل ہوئی۔ جہاں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اس
 لڑکی نے چراغ جلا یا تو میں نے دیکھا کہ وہاں غلے کی
 بہت سی بوریاں پڑی تھیں۔ اس لڑکی نے مجھے ان
 بوریوں کے پیچھے چھپنے کو کہا۔ کہ جب تک میں نہ ہوں
 باہر نہیں نکلتا اور نہ ہی آواز نکالتی ہے۔ یہ کہہ کر اس
 نے چراغ بجھایا اور وہاں سے چلی گئی۔
 میں پریشان ہی ہوئی اور سوچنے لگی کہ کیا یہ لوگ
 واقعی میری حفاظت کریں گے؟ کہیں میں کسی نئی مشکل
 میں نہ پھنس گئی؟ پھر میں نے خود کو حالات کے
 دھارے پر چھوڑ دیا اور دل ہی دل میں ہنگاموں سے
 خیریت کی دعا مانگتی رہی۔ کچھ دیر ہوئی تو باہر
 سے دروازہ پینے کی آواز آئی۔ تو میرے دل کی
 دھڑکن بے ترتیب ہو گئی۔

”یہاں ایک لڑکی آئی تھی بڑھ! وہ کہاں
 ہے؟“ مجھے بلرام کی زوردار کھٹ آواز سنائی دی
 اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
 ”کپتان صاحب! آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی
 ہے۔ یہاں تو کوئی لڑکی نہیں آئی۔“ بوڑھے نے کہا۔
 ”جھوٹ مت بول بڑھ۔ مجھے یہی اطلاع ملی
 ہی کہ وہ لڑکی اس گھر میں داخل ہوئی ہے۔“
 بلرام کی آواز سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے
 میری جان گھٹی میں لے لی ہو۔
 ”کپتان صاحب! آپ تسلی کر لیں۔ یہاں کوئی
 لڑکی نہیں آئی۔“ بوڑھے نے پراعتاد انداز میں کہا۔
 ”میں نے وائرلیس پر اطلاع دے دی ہے۔
 مزید فوجی پیچھے والے ہیں۔ پھر میں دیکھوں گا کہ لڑکی
 یہاں سے کیسے برآمد نہیں ہوئی۔“ بلرام کی غصہ بھری
 آواز سنائی دی۔
 کچھ ہی دیر بعد کوئی اس اندھیرے کمرے میں
 آیا۔ اس نے چراغ روشن کیا تو میں نے دیکھا کہ یہ
 وہی بوڑھی عورت تھی جس نے مجھے اٹھایا تھا۔ اس کے
 ہمراہ ایک دہیبہ، دروازہ دروازہ کی خوب صورت
 نوجوان تھا۔
 ”بیٹی! اس کیسے کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم یہاں
 ہو۔“ اس عورت نے کہا۔
 ”اب کیا ہوگا؟“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے
 میں کہا۔
 ”بیٹی تم بے فکر ہو جاؤ۔ ہم وعدہ تمہانے والوں
 میں سے ہیں۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے یاسین۔ یہ تمہیں
 گھر کے عقیقی دروازے سے نکال کر لے جائے گا۔
 کیونکہ یہاں اب شدید خطرہ ہے۔“ اس بوڑھی عورت
 نے کہا۔
 ”مگر آپ لوگ میری خاطر اتنا بڑا خطرہ کیوں
 مول رہے ہیں۔ آپ مجھ اجنبی کے لیے اپنی زندگی
 خطرے میں کیوں ڈال رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی
 معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آئی ہوں؟“
 میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔
 ”بیٹی! ہمیں ان باتوں کی پروا نہیں ہے۔ ہم

نہیں پتا وہ کی ہے۔ اب اگر ہماری بوئیاں بھی
 لڑائی جا میں تو ہم تمہیں کسی کے حوالے نہیں کریں
 گے۔“ اس بوڑھی عورت کا لہجہ مضبوط اور اٹھل تھا۔ پھر
 ”اچھے بیٹے کہنے لگی۔
 ”یہاں یاسین! اس لڑکی کی حفاظت اب ہماری
 ذمہ داری ہے تم نے اس کی حفاظت اپنی جان سے
 بڑھ کر کر لی ہے۔ اس لڑکی پر آج آئی تو مجھے پورے
 نیکر کی مہمان نوازی پر داغ لگ جائے گا۔ یہ بھی یاد
 رکھو۔ اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا اور تم زندہ بچ کر لوٹ
 آئے تو میں اپنا دودھ تمہیں بھی نہ بخشوں گی۔“
 ”آپ فکر نہ کریں مامی! میں اپنی ریت نبھانا
 خوب جانتا ہوں۔ میں نے اس اجنبی بہن کو اس کے
 دلوائے پر بچپنا کر ہی لوٹوں گا۔“ یاسین نے تسلی دیتے
 ہوئے ماں سے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا
 اور کہنے لگا۔
 ”جلدی چلو۔ ہمیں رات کی تاریکی میں ہی
 کپواڑہ پہنچنا ہے۔“ یاسین نے میری سست رفتار دیکھ
 کر کہا۔ پھر اس نے اپنا کوٹ اتار کر مجھے پہنا دیا۔
 کیونکہ میرے پاس تو دوپٹہ تھا۔ جس وجہ سے میں
 سردی سے کانٹنے لگی تھی۔ ہم کچھ دیر بعد ایک کچی
 سڑک پر آ گئے۔ اب میں آسانی سے اس کے ساتھ
 چل رہی تھی۔ کافی آگے جا کر ہمیں دو بھارتی فوجیوں
 نے روک لیا۔ تو میری ٹانگیں کانٹنے لگیں۔
 ”تم لوگ کون ہو؟ اور اس وقت کہاں جا رہے
 ہو؟“ انھوں نے ہمیں روک کر پوچھا۔
 ”مہاراج! یہ میری بیٹی ہے شدید بیمار ہے۔ زود کی
 قصبہ دوائی لینے جا رہا ہوں۔“ یاسین نے بہانہ بنایا۔
 ”اچھا! میں بھی زرا دیکھو تمہاری بیٹی کو۔“ ایک
 فوجی شیطانی لہجے میں بولا۔ اور میری طرف بڑھنے
 لگا۔ یاسین کو غصہ آ گیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی اٹھل کا
 ہٹ اس کے سر پر مارا۔ اس فوجی کی ہلکی سی جھجک نکلی اور
 وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔
 ”اچھا! اب جلدی سے یہاں سے بھاگ
 نکلو۔“ یاسین نے کہا تو ہم نے سڑک چھوڑی اور جنگل
 میں گھس گئے۔ بھاگتے ہوئے دو چار منٹ ہی
 گزرے ہوں گے کہ پیچھے سے فائرنگ شروع ہو گئی۔
 ”ہاں میں بھائی کے پاس کپواڑہ جانا چاہتی
 تھی اس کا پتا مجھے معلوم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”چلی رہو تم میرے ساتھ۔ یہاں سے کچھ

فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ باڈیاں“ وہاں میرا ایک
 دوست رہتا ہے۔ میں اس سے گھوڑا ادھار لے کر
 تمہیں کپواڑہ چھوڑاؤں گا۔“ یاسین نے کہا۔
 ”یاسین بھائی! اب اگر تم جاؤ تو بھارتی فوجیوں
 کی زیادتیوں کا بدلہ ایک کیپٹن کی بہن سے لے سکتے
 ہو۔ مجھے یہ فرما لیا۔“
 ”اچھا بہن! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہم ایک
 باوقار اور اصول پسند قوم ہیں۔ ہم متوہنت ہیں لیکن
 دشمن کی ہستی خاتین اور بچوں کو قتل کرنا ہمیں کسی حال
 میں بھی منظور نہیں۔ ہمارا مذہب اور ہمارا معاشرہ اس
 بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔“
 میں مطمئن اور خاموش ہو گئی۔ ہم چلتے رہے۔
 شدید سردی اور بھوک کی وجہ سے میری رفتار دھیمی
 پڑنے لگی تھی کہ یاسین بولا۔
 ”جلدی چلو۔ ہمیں رات کی تاریکی میں ہی
 کپواڑہ پہنچنا ہے۔“ یاسین نے میری سست رفتار دیکھ
 کر کہا۔ پھر اس نے اپنا کوٹ اتار کر مجھے پہنا دیا۔
 کیونکہ میرے پاس تو دوپٹہ تھا۔ جس وجہ سے میں
 سردی سے کانٹنے لگی تھی۔ ہم کچھ دیر بعد ایک کچی
 سڑک پر آ گئے۔ اب میں آسانی سے اس کے ساتھ
 چل رہی تھی۔ کافی آگے جا کر ہمیں دو بھارتی فوجیوں
 نے روک لیا۔ تو میری ٹانگیں کانٹنے لگیں۔
 ”تم لوگ کون ہو؟ اور اس وقت کہاں جا رہے
 ہو؟“ انھوں نے ہمیں روک کر پوچھا۔
 ”مہاراج! یہ میری بیٹی ہے شدید بیمار ہے۔ زود کی
 قصبہ دوائی لینے جا رہا ہوں۔“ یاسین نے بہانہ بنایا۔
 ”اچھا! میں بھی زرا دیکھو تمہاری بیٹی کو۔“ ایک
 فوجی شیطانی لہجے میں بولا۔ اور میری طرف بڑھنے
 لگا۔ یاسین کو غصہ آ گیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی اٹھل کا
 ہٹ اس کے سر پر مارا۔ اس فوجی کی ہلکی سی جھجک نکلی اور
 وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔
 ”اچھا! اب جلدی سے یہاں سے بھاگ
 نکلو۔“ یاسین نے کہا تو ہم نے سڑک چھوڑی اور جنگل
 میں گھس گئے۔ بھاگتے ہوئے دو چار منٹ ہی
 گزرے ہوں گے کہ پیچھے سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

جادو	ایم اے راحت	800/-
تیری یادوں کے گلاب	شازیہ اعجاز شازی	300/-
کالج کے بچوں	غزالہ طیل راؤ	500/-
دیا اور گنو	غزالہ طیل راؤ	500/-
انائیل	غزالہ طیل راؤ	500/-
جیون جیل میں چاند کرنیں	فیصلہ آصف خان	500/-
عشق کا کوئی ات نہیں	فیصلہ آصف خان	500/-
سلگتی دھوپ کے صحرا	عطیہ زاہرہ	500/-
یہ دیکھنا ہے پائے	محمد سلیم اختر	300/-
دش کنیا	ایم اے راحت	400/-
درندہ	ایم اے راحت	300/-
تعلی	ایم اے راحت	200/-
بحرم	ایم اے راحت	200/-
چیون	خاقان ساجد	400/-
دھواں	ساروق انجم	300/-
دھڑکن	ساروق انجم	300/-
درفشاں	انوار صدیقی	700/-
آشیانہ	اعجاز احمد نواب	400/-
جزیرہ	اعجاز احمد نواب	500/-
ناگن	اعجاز احمد نواب	999/-

نواب سنز پبلی کیشنز

1/92، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ
کینٹی چاک راولپنڈی Ph: 051-5555275

لکھاری بہنیں اپنا ناول شائع

کروانے کے لیے رابطہ کریں

0333-5202706

ہوئے۔ معلوم ہو گیا ہے کہ دہشت گرد یہ لوگ نہیں بلکہ ہم ہیں۔ کشمیری خواتین کے ساتھ زیادتی کرنے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر یہی سب کچھ ہماری بہن، بیوی یا بیٹی کے ساتھ ہو تو تب ہمیں کیا لگے گا۔ آہ یاسین! آج تم نے میری آنکھیں کھل دی ہیں اور مجھے بھی میرا اصلی چہرہ دکھا دیا ہے۔ تو حق پر ہو۔ کشمیر تمہارا ہے۔ اسے تم نے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہ بہت جلد آزاد ہوگا۔“

بچہ وہ مجھے مخاطب ہوا۔

”مولوی صاحب! آج سے میں نے فوج کی نوکری چھوڑ رہا ہوں۔ میں اور ارچنا دونوں مسلمان بننا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اسلام میں داخل کریں اب ہم لوگ کرشمیں جائیں گے۔ اب ہمارا جینا مرنا کشمیریوں کے ساتھ ہے۔“

مولوی امین نے ان دونوں بہن بھائیوں کو گلے پڑھایا اور ان کے نام بھی مسلمانوں والے رکھ دیے۔ اس کے بعد کشمیر راکش نے فوجی انداز میں تکرپاسین کی قبر کو سیلوٹ کیا اور تھوڑی دیر اسی حالت میں کھڑا رہا۔ جیسے وقت ختم گیا ہو۔ ہر طرف گہرا سوکھ چھا گیا۔ اس نے پھر اپنے سر سے فوجی ڈبلی اتاری اور یاسین کی قبر کے قدموں میں رکھ دی۔ پھر اس نے مولوی صاحب کا دیا ہوا کشمیری لباس پہنا۔ اس کے بعد اس نے فوجی وردی اور ڈبلی ایک طرف رکھ کر آگ لگا دی۔

راکش۔ ارچنا اور مولوی امین۔ وردی کو جلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ اتنے میں کرام اور چٹا پانیوں کے ہمراہ جیپ میں سوار وہاں پہنچا۔ انہیں نے بغیر کوئی بات کہے۔ ہندوؤں کے منہ کھول دیے کوہلوں کی بوچھاڑ نے راکش، ارچنا اور مولوی امین کی زندگیاں چھین لیں۔ اور کیواڑہ کے قبرستان میں نینم شہیدوں کی قبروں کا اضافہ ہو گیا۔ دھند چھنے لگی۔ سورج نکل آیا تھا اور اس کی کرنیں اعلان کر رہی تھیں کہ غلامی کی دھند بہت جلد چھٹنے والی ہے۔

☆☆☆

روشنیاں نظر آرہی ہیں۔ وہاں مسجد کی پشت پر میرے دوست جمیل کا گھر ہے۔ اسے یہ روشنی رومال دے دینا اور کہنا کہ مجھے یاسین نے بھیجا ہے۔“ اس نے جیب سے ایک کڑھائی والا رومال نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ یہ رومال دیکھ کر جان جائے گا اور تمہیں تمہارے بھائی کے پاس پہنچا دے گا۔“ اس نے خچف آواز میں کہا۔

”لیکن یاسین بھائی۔ آپ تو زخمی ہیں۔ میں آپ کو چھوڑ کر۔۔۔“

”تم میری فکر مت کرو۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ جاؤ۔ دیر مت کرو۔ میرے پاس اب مزید وقت نہیں ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

”میں اسے چھوڑ کر نہیں جانا جاہت تھی۔ مگر اس وقت فائرنگ مزید بڑھ گئی۔ یاسین کے اصرار پر مجھے اٹھنا پڑا مگر میرے پاؤں تو جیسے وہاں ہی چپک گئے تھے۔“

”جاؤ ارچنا جاؤ۔ ورنہ تم بھی یہیں ماری جاؤ گی۔ دیر مت کرو۔ جاؤ۔“

☆☆☆

میں اسے خون میں لٹ پت چھوڑ کر گاؤں جا پہنچی۔ یاسین کے دوست جمیل نے جب اس رومال کو دیکھا اور میری چٹائی تو وہ سب سمجھ گیا۔ اس نے بھی میری حفاظت کی اور مجھے راکش بھائی کے پاس پہنچا دیا۔

☆☆☆

ارچنا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”مولوی صاحب! یاسین ایک عظیم مجاہد تھا۔ میں اس کی ماں کے کہے ہوئے الفاظ سمجھ نہ سکتی تھی۔ اس کی ماں کے کہے ہوئے لوگ جو اپنا عہد نبھانے کے لیے اپنی جان پر ہیل جاتے ہیں۔ یہ دہشت گرد نہیں ہیں بلکہ ان کی سوکند۔ یہ عظیم انسان ہیں۔“ ارچنا کی ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کشمیر راکش کی آنکھیں بھی برسنے لگی تھیں۔ وہ بھی سسکیاں لیتے

شاید ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ یاسین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم بھاگتے رہے۔ میں بدحواس ہو کر پتھر لیے راستے پر گر پڑی مگر پھر اچھٹھ کھڑی ہوئی۔

یاسین کہنے لگا۔ ”اس طرح تو ہم مارے جائیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے کندھے پر لٹا دیا اور بھاگنے لگا۔ بھارتی فوجیوں کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جب فائرنگ بڑھی تو ہم ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو گئے۔

”اب تو ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔“ یاسین نے یہ کہہ کر راکش لوڈ کرنے لگا اور پھر بولا۔ ”ارچنا! تم فکر مت کرو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“

پھر وہ ٹیلے کی اوٹ سے جوانی فائرنگ کرنے لگا۔ دس منٹ گزر گئے تھے چانک ایک گولی اس کا دایاں کندھا چیرتے ہوئے نکل گئی۔ لیکن وہ بہادری سے لڑتا رہا۔ پھر اس نے فائرنگ کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنے کی ترکیب اپنائی۔ وہ جوانی فائرنگ کرتا ہوا آخر ٹیلے تک جا پہنچا جس بھی اس کے ہمراہ تھی۔ میں نے دیکھا۔ ڈھلوان کی طرف نیچے کسی آبادی کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یاسین کا جسم خون سے تر ہو گیا تھا۔ اس کی ساری میض خون سے جھیک گئی تھی۔ اوپر سے سردی۔

”بھائی! یہ خون۔“ میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ وہ اپنی تکلف چھپاتے ہوئے بولا۔ ”ہم اب آبادی کی طرف جا رہے ہیں۔“ اس نے روشنی والی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے اسے اپنی مطلوبہ شے مل گئی ہو۔ بھارتی فوجیوں کی فائرنگ بدستور جاری تھی کہ چانک ایک اور گولی اس کے بازو میں پیوست ہو گئی۔ اس کے حلق سے آہ نکل گئی لیکن اس نے اپنی چیخ دالی۔

”ارچنا بہن!“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”میرے پاس گولیاں بہت کم رہ گئی ہیں۔ میں ان کو روک رکھا ہوں۔ تم اس گاؤں چلی جاؤ۔ جہاں

چندر سے عبدالرحمن تک

نفسہ سعید

اُس نوجوان کا قصہ عجیب ہے قدرت گراہی سے حق کی جانب لے آئی تھی

”کوئی بھی انسان خود بُرا نہیں ہوتا۔ بُرے تو اس کے وہ اعمال ہوتے ہیں جو اسے بُرا بنادیتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ بڑائی سے نفرت کرو۔ بُرے انسان سے نہیں اور یہ ہی ہمارے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں انسانوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ نفرت نہیں۔“

عبدالرحمن بڑے جذب کے عالم میں درس دے رہے تھے۔ بولتے بولتے ان کی آواز میں رخت آگئی اور یاد اللہ میں ان کی آنکھ سے بہنے والے آنسو ان کی سفید داڑھی کو جھگوگئے۔ درس سننے والے تمام افراد نہایت ہی ادب اور عقیدت و احترام سے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے عبدالرحمن کے سامنے سولہ سولے چہرے پردھک اور کرب کے گہرے سائے نظر آتے۔ لیکن اندر بچی غافلہ کو اپنے بھائی کے لہجے میں بولتا دکھ اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”تیرا کا لکھ نہ رہے عذات، تو بل کی رقم بھی چس بھی پی گیا۔ اب جو بچکی کٹ گئی تو میں کمر علی کہاں دھکے کھائی پھر دوں گی۔“ سکھانے دھانی دیتے ہوئے کہا۔

”کس کو سنار سی ہے اماں۔ وہ تو بے سدھ پڑا

”میں نے جی چھٹی سی رسوئی کی جانب چل دی تاکہ باقی افراد کے پیٹ کو ایندھن فراہم کر سکوں۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی ماں نے حج تک ان کے خرچ پر بیٹھ کر اپنا غم غلا کرنا ہے اور مشکل ہی تھا جو یہاں کے حلق سے ایک نوالہ نیچے اترتا۔“

☆☆☆

”ماں مجھے پچاس روپے دے دے صرف پچاس

”شناختی سے لے دے۔ شام کو اس کی سلائی کے پیسے آئے ہیں۔ میں اسے واپس کر دوں گا۔“

چندر نے بہن کی جانب دیکھتے ہوئے حتی الامکان اپنی آواز کو دھیمّا کرتے ہوئے کہا۔ چندر کی بات سنتے ہی شناختی کا مشین چلاتا ہاتھ ذرا سی دیر کوست پڑا اور اس نے مڑ کر ایک تکیلی نظر چندر پر ڈالی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی کیونکہ وہ اس وقت کسی قسم کا کوئی لڑائی جھگڑا نہ چاہتی تھی۔



”ان پیسوں کا میں گھر کے لیے راشن لے آئی جو تیرے نشے سے زیادہ ضروری تھا۔“ سکھانے نے رکھائی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھ مائی تو اچھا نہیں کر رہی میرے ساتھ۔ میں تجھے چھوڑ دوں گا نہیں۔“ سکھانے کے جواب سے یک دم ہی چندر غصہ میں آ گیا۔

”کیا اچھا نہیں کر رہی، بول کیا اچھا نہیں کر رہی میں

”ہے۔“ چندر جانے کب سے سکھان کی منت سماجت کر رہا تھا اس کا مطالبہ دوسرے شروع ہوا تھا اور آہستہ آہستہ پچاس روپے پر آ گیا تھا۔ اور اب باقاعدہ اپنی ماں کے پاؤں پڑے بیٹھا تھا۔

”میرے پاس ایک دس روپے نہیں ہیں میں تجھے پانچ روپے کہاں سے لا دوں؟“ سکھان نے بے بسی سے اسے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

تیرے ساتھ۔ بڑا آیا بڑا آیا میرے ساتھ بڑا کرنے والا۔“ سکھانے غصے سے اسے پرے کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پیٹ کا دہن میری جان سے زیادہ ضروری ہے۔ کسی ماں ہوتو! بیٹا مر رہا ہے اور تمہیں احساس نہیں۔“ اب وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور غصہ کی زیادتی سے اس کا جسم ترتر کانپ رہا تھا اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کچھ ہو اور وہ اپنی ماں کو دے مارے۔ شانتی اس کا غصہ دیکھ کر گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مبادا کہیں وہ غصہ میں کوئی حرکت ہی نہ کر دے۔

”یہ تو ہی ہے جس نے ماں کو سکسا سکھا کر میرے خلاف کیا ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ اب چندر اس کی جانب غصہ سے دیکھ کر پھنکا رہا۔

”مجھ پر تیری اس بکواس کا کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ جانتی غیرت ہے تو کما کر دکھا پھر میں تجھے مانوں، سکے سکے کو کچھ پھیلانے والا اتنی باتیں کرتا اچھا نہیں لگتا۔“ شانتی نے اسے دو بدو جواب دیتے ہوئے کہا۔ چندر کچھ دیر خاموش کھڑا رہ کر شانتی کو خونخوار نگاہوں سے گھورتا رہا اور پھر پھینک دیا تباہی بولا۔

”تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔“ ساتھ ہی ماں کو دکھانا ہوا وہ نہایت ہی جارحانہ انداز سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پھر گلی آنے والی صبح اس گھر کے لیے ایک نئی آفت لے کر آئی۔ صبح اٹھتے ہی شانتی نے دھانی چا دی کیونکہ اس کی سلائی مشین اپنی جگہ پر تھی۔ جانے چند ظالم رات کس وقت آیا اور اس کی مشین اٹھا کر لے گیا۔ شانتی کا روزمرہ کام معمول تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر بنگلہ ان کی پوجا کرتی اور پھر اپنی مشین کو صاف کرنے کے بعد گھر کا کوئی اور کام نہ کرتی، آج بھی ایسا ہی ہوا جب وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر مشین کی جانب آئی تو خالی جگہ سے منہ چڑا رہی تھی۔ شانتی تو ماتر پت ہی اٹھی۔ مشین میں تو اس کی جان تھی۔ اس کے ہاتھ وہ ہانگ لے کاٹ رہی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ سوائے رونے پینے کے وہ ماں بیٹیاں کچھ

نہ کر سکتی تھیں۔ سارا دن ہی غم اور دکھ کی کیفیت میں نکل گیا۔ مشین کے غم میں ان دنوں نے کچھ نہ کھایا اور نہ ہی معذور روشن کو بھوک لگی۔ حالانکہ وہ تو بھوک کا بہت ہی کچا تھا یہاں تک کہ دونوں چھوٹوں نے بھی کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ غرض سارا ہی گھر ایک سوگ کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ایسے جیسے ان کا کوئی پیارا مر گیا ہو لیکن کب تک پیٹ تو آخر اندھن مانگتا ہے۔ یہاں تو مرنے والوں کا صبر آجاتا ہے۔ یہ تو پھر ایک بے جان مشین تھی۔ رات تک شانتی کو خود ہی احساس ہوا کہ باپ اور چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے دکھ میں بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ لہذا خاموشی سے انھی ڈبے میں موجود چاول ایلے اور اچار کے ساتھ سب کو کھانے کے لیے دیے۔ لیکن اس کا اپنا دل بالکل نہ چاہ رہا تھا۔ اسے تو صرف یہ احساس مارے ڈال رہا تھا کہ اب مشین کے لیے اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ اور جو کپڑوں کا ذخیرہ لگا ہے وہ کیسے بیلے گا۔

☆☆☆

دو پہر ہلے سکھان کام کر کے گھر واپس لوٹی تو ہاتھ میں پکڑے شاپرہز جو مختلف گھروں سے لائی تھی۔ کچھ کے حوالے کر دے۔

”شانتی کہا ہے۔“ سکھان نے یہاں وہاں نظر دوڑاتے ہوئے بھی سے سوال کیا۔

”صبح سے ہی اندر تخت پر لیٹی ہیں۔ نہ کچھ کھایا اور نہ ہی پیا۔“ غصی جواب دے کر جلدی جلدی تھیلیوں میں جھانکنے لگی تاکہ اپنی من پسند کھانے کی چیز پیلے ہی الگ کر سکے۔ سکھان بھی مامدی اندر جا کر شانتی کے پاس بیٹھ گئی۔ جس نے ماں کو دیکھتے ہی کروت بدل لی۔

”پکڑے واپس کر آئی ہے اماں۔“ شانتی نے دھیرے سے سوال کیا اس کے لہجے کا دکھ سکھان کا دل رنجی کر گیا۔

”ہاں باجی نورین نے تیرے لیے ایک کام بتایا ہے۔ اگر تو نے کرنا ہوتو۔ اب مشین تو بے نہیں جو سلائی کرے گی۔“ اتنا کہہ کر سکھان نے شانتی کے چہرے پر اک نظر ڈالی جہاں کوئی بھی تاثر نہ تھا۔ بالکل سپاٹ اور بے تاثر چہرہ تھا۔

”کیا کام بتایا ہے وہ بتاؤ۔“ چار پائی پر بیٹھے

دو ایٹھاں سے مخاطب ہوئی۔

”نورین بی بی کی جاننے والی کسی اسکول میں استانی ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بچہ ہے۔ بس وہ ہی سنبھالنا ہے۔“ شانتی بچے سے چار بجے تک۔ تنخواہ بھی مناسب ہے۔ اور بچہ بھی زیادہ نہیں۔ لوگ بھی اعتماد والے ہیں۔ نورین بی بی کی شخصیت بہت عرصے سے جانتی ہیں شاید وہ نورین بی بی کی کسی رشیدار ہیں۔ کہے تو حامی بھر لوں؟ اب یہ تیری مرضی پر ہے میری کوئی جبر بردستی نہیں۔“ سکھان نے امید بھری نظروں سے شانتی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شانتی منہ سے تو کچھ نہ بولی۔ بس صرف گردن انہما میں ہلادی اور سکھان کے لیے یہ بھی کافی تھا۔

☆☆☆

اور پھر زندگی اسی مقام پر آگئی۔ جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ تو نہیں سے ہی اپنی ماں جیسی تھی۔ آٹھ ماں کی عمر سے ماں کے ساتھ کام پر جاری تھی اور اپنے شوق کی بنا پر تیرہ سال کی عمر میں کام کے ساتھ ساتھ قریبی مرگڑی مرکز سے سلائی بھی کھینچتی تھی اور پھر ایک بچہ کی کوکھوں سے اسے فلاحی مرکز کی جانب سے مفت سلائی مشین بھی مل گئی۔ ماں اس کی تو ساری مراویں ہی خود ہی ہو گئیں اور پھر جو اس نے مشین سنبھالی تو بھی نہ ٹھیک ماں کے کام پر جاتے ہی تھی اور مشکو کو ناشتا کروا کر ٹہنی سرکاری اسکول بھیجتی۔ ابا کو ناشتا کروا کر پورا گھر صاف کرتی، جلدی جلدی پکڑے، برتن دھوتی اور پھر جو سلائی مشین سنبھالتی تو اس وقت چھوڑتی جب سب گھر آجاتے۔ جلدی جلدی روٹی ڈالتی اور رات کے سالن کا تھوڑے سا کھانا دے کر پھر مشین سنبھال لیتی۔ رات کا کام سکھان کی ذمہ داری تھا۔ مکان کا کرایہ بھی قلمبلی گیس کے بل نے الگ کر توڑ رکھی تھی اور پرے باغیچہ مال سے روٹن کی معذوری نے اخراجات میں اور اخلاذ کوڑا تھا۔ اس کی دو اداری کا خرچ اضافی تھا۔ جب تک روٹن تندرست تھا تب ٹھیک تھا لیکن اس کے معذور ہونے ہی نہ جانے کیسے چندر کو نشہ کی لت لگ گئی۔ اچھا بھلا سرکاری اسکول جاتا تھا باپ کے حادثے کے بعد ماں نے اسکول چھوڑا کر میکینک کی دکان پر بیٹھا

دیا۔ اور یہیں سے اسے چرس پینے کی لت لگ گئی۔ جس نے چندر کے ساتھ ساتھ سارے گھر والوں کی زندگی کو بھی جہنم بنادیا۔ جب اسے نشے کے لیے کہیں سے پیسہ نہ ملتا تو وہ گھر میں اک ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ گالی گلوچ کرتا یہاں تک کہ ماں اور بہن پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتا۔ چرس کے علاوہ وہ کچھ اور نشیات کا استعمال بھی کرنے لگا تھا۔ وہ خود تو نشہ کر کے دنیا جہاں سے بے خبر ہو جاتا اور گھر والوں کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیتا۔ اس نے خود اپنے حالات کو نشہ میں گھول کر پی لیا تھا۔ لیکن اس کی اس عادت نے ماں، باپ اور بہن بھائیوں کی زندگی کو مزید اجڑا کر دیا تھا۔ جس کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔ ایک شانتی بھی جس کا ارہان تھا کہ پیسے جمع کر کے ایک سلائی مرکز کھولے گی لیکن دوسرے دوسرے خوابوں کی طرح اس کا یہ خواب بھی ادھور رہا۔ یہاں کیونکہ خواب دیکھنا ہر انسان کا حق ہے۔ لیکن ان کی تعبیر ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔

☆☆☆

باجی دن تک چندر کا کوئی پتہ نہ چلا سکتے تھے کہ مشین کچھ کر جو پیسے لے ہوں گے اس کی چرس خرید کر کسی درگاہ کے باہر پڑا ہوگا۔ جہاں دی جانے والی خیرات کی دیکوں کے چاول کھا کر وہیں احاطے میں اپنے جیسے دیگر چرسیوں کے ساتھ وہ دنیا بھیا سے بے خبر ہوگا۔ روشن جو ایک رات چندر کے گھر نہ آنے پر پریشان ہوا تھا۔ اس بار بالکل خاموش تھا۔ ہاں بھی کچھ سکھان کو جو یاد آجاتا تو اس کے منہ سے کوئی نہ ہی نکلا کرتے۔ سوائے بدعاؤں کے اس کی زبان پر کبھی بھی چندر کے لیے کوئی الفاظ نہ آئے اکثر بیٹھے بیٹھے وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی اور پھر کہتی۔

”تیرا ناس جائے چندر! تو نے ہمیں کسی جگہ نہ چھوڑا۔ اور رہی ہے چاری شانتی اس کے دل سے تو اپنی مشین کا غم ہی نہ جاتا تھا باجی وہ چندر کو کیا یاد رکھتی۔ اس کے روز و شب تو پھر گزرے برسوں جیسے ہو گئے تھے۔ وہ ہی صبح سویرے اٹھ کر کام پر جانا چار پیسوں کے لیے لوگوں کی باتیں سنتا جو بھی استانی جی خوش تھی تو وارے نیارے اور اگر جو موڈ خراب ہوتا تو بے چاری شانتی کی

گی۔ تیرا بیٹا بہو کو چھوڑ دے گا۔“

غرض اسی طرح کے بے شمار مسائل عورتوں کے
 پیاں ہوتے جتیں سن کر باباجی دعا میں دیتے نہ تھکتے اب
 اللہ کی کرنی جو کام ہوئے والے اب ہوتا وہ ضرور ہو جاتا اور اسی
 خدا کی کام میں نام بابا چندر آ جاتا، جس کی ماں اسی دن
 کو کوئی تھی جس دن اس نے یہ بیٹا جنم دیا تھا۔

آہستہ آہستہ میدان والا بابا آس پاس مشہور ہوتا گیا۔

ایک دن موسیٰؑ والے آئے میدان خالی کروانے
چندر کے عقیدت مندوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا لیکن
”بابا“ کو وہاں سے نہ جانے دیا۔ یہاں تک کہ بابا کے
کسی عقیدت مند نے اسے دھوپ سے بچانے کے لیے
ایک سائبان سامھی بنادیا۔ جو پیکلے تو کالے کپڑے کا
تھا۔ پھر جانے کس نے کالے کی جگہ سائبان کا پلڑا ہرا
کر دیا اور قریب ہی ایک جھنڈا بھی گاڑ دیا۔ چندر کی
بدحالی جاہل عقیدت مندوں نے خوش حالی میں تبدیل
کر دی۔ اب وہ ہر وقت ہرا چڑھا پہنے رہتا۔ گلے میں
موٹے موٹے سنکوں کی مالا جو وہ عبداللہ شاہ غازی سے
لایا تھا۔ سر پونڈی اور ہاتھ میں بیچ جس کے دانوں پر
سوائے حق اللہ کے وہ کچھ نہ مانتا تھا اور یہ حق اللہ
بھی اس نے مختلف درگاہوں پر رہ کر سیکھا تھا۔ آہستہ

آہستہ آہستہ ایسی جیسے چند دوسرے لوگ بھی اس کے گرد بیٹھ گئے۔ کوئی اس کے ہاتھ دبا تو کوئی پاؤں پیٹا۔ ایک کہ اب اسے جس کی خاطر چھوٹی سوتلی چوری بھی نہ کرنی پڑی۔ وہ بھی سنبھل جاتی۔ غرض یہ کہ سچ معنوں میں آسان سے ”بھن“ برسنے کا نظارہ چند نے بھی اپنی زندگی میں دیکھی ہی لیا تھا۔ آہستہ آہستہ چند کا چہرہ ایک چھوٹی سی درگاہ میں تبدیل ہو گیا جو تھکے کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتی گئی۔ چند کے پاس ہر وقت عقیدت مندوں کا جھوم جمع رہتا۔ کوئی تعویذ لینے آتا تو کوئی دم کروانے بھی کوئی جن بھی اتروانے آ جاتا۔ بھرے کے باہر ایک صندوق پر رکھ دی گئی جہاں لوگ مزدور باز کے لیے اپنے ڈالاکر تے۔ ہر ماہ کی آخری جمعرات یہاں خوب میلا جلتا۔ ساری رات تو ایسا ہوتیں اور خسرے نہ تاپتے۔ وہ

نہیں بڑا کر اکتھ بیٹھا۔
 "اے کھانا کلو۔" نہ جانے وہ کون تھی جو چندر کی
 ہنسی بولیں بیٹے سے دھوکا لگائی۔ چندر نے چند مچی چندھی
 کھینچ کر اس کی جانب تھکا۔ ایک عورت تھی ہاتھ
 پر کھانے کے لیے بولے کھڑی تھی۔ یکا یک چندر کو بھوک کا
 احساس ہوا اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر پلٹے تھام
 بیٹھے چاہل شاید کسی نذر و نیاز کے تھے، وہ خاموشی
 سے کھا گیا۔ اور اب یہ اس کا معمول بن گیا۔ صبح اٹھتا
 ہوا باہر پھر کھینچ کر اس کی مین ہول کا دھکن جراتا، کبھی
 کھانے کے بلب آتا رہتا، کبھی کسی کے گھر کے باہر
 سے جال کا دھکن نکال لیتا، اور پیچ کر نشہ پورا کرتا لیکن
 شام ہوتے ہی اپنی مخصوص جگہ آ جاتا یہاں کوئی نہ کوئی
 سے کھانا دے جاتا اب وہ درگاہ جانے سے ڈرتا تھا
 کہیں جو اگر پولیس پکڑ کر لے گی تو پیچھے آنے والا بھی
 ہلے نہ تھا یہ سوچ اسے درگاہ کی جانب جانے سے روکتی
 تھی اور اب تو ایسی جگہ اسے اپنے مقتدر کا رزق بیٹھے
 بٹائے نے ملے لگا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی کہیں اور دھکے
 کھانے کی طرح نہ جانے کتنے دن بیت گئے۔
 ایک دن جب وہ عورت کھانا لاتی تو کچھ پریشان
 تھی کھانا کھتی تھی وہ چندر کے قریب ہی زمین پر بیٹھ
 "نئی" بابائی میرے لیے دعا کریں اللہ میری پریشانی
 دور کرے۔" وہ رو رہی تھی۔

”حق اللہ..... جا اللہ نے تیری سن لی۔“ چند رنے
نہر پورا اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے درگاہ سے سیکھا
ایک لڑکھ بلند کیا اور خدا کی کرنی صبح جوتے ہی اس عورت کا
نہر پھیل سے رہا ہو گیا۔

ابو حنیفہ باہجی کے نام کا ڈاکوڑے کے محلے میں
اٹھارہ سو تری زبانی چار سو باہجی کے کارناموں کی
گہجائیں بکھیل گئیں۔ شام ہوئے ہی چندر کے واپس
آنے پر آس پاس سے کچے ایمان والی اندھی عقیدت
منور ہوئیں اس کے درجہ ہو جائیں اور اپنے لیے دعاؤں
کا تہیہ۔ دو سو وقت جس کے نشے میں سرشار ہوتا
خود کو کوئی (غور باللہ) پہنچتی ہوئی ہستی جھٹکتا۔ خوب حق
اللہ کے لئے لگتا اور دعا میں دے جاتا۔

”جا اللہ تجھے چاند سا بٹا دے۔ اللہ تیری بیٹی کا

”اس بے غیرت سے کہہ ابھی نکل جائے میرے
گھر سے اور دوبارہ کبھی یہاں واپس نہ آئے مر گیا یہ
ہمارے لیے۔“

”رات رہ لینے دے ابا میں اتنی رات کو کہاں جاؤں گا۔ بس ایک رات رحم کر دے۔“ چندر نے گھگھکھاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”وہیں جا..... جہاں اتنے دنوں سے پڑا تھا۔
 میرے گھر سے چلا جا۔ ہمیں تیری ضرورت نہیں۔“
 وشن نے اسے دھکات دیتے ہوئے کہا۔

”درگاہ تو پولیس کا چھاپا پر گیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر نکلا ہوں۔ رات رہ لینے دے ابا۔ میں چڑھتی ہوں نکل جاؤں گا۔ اماں تو جی سمجھا ابا کو۔ ابھی رہ نکلا تو پولیس پکڑنے کی۔ سب کو اٹھا کر لے گئی ہے۔“ باپ سے بات کرتے کرتے اس نے اپنا رخ الٹی جانب موڑا لیکن کدو جانتا تھا کہ ماں کو بلیک میل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن جانے کیوں آج تو کھسکاں کا بھی پتھر ہو چکا تھا۔

”تو اب راپٹھک کہتا ہے۔ تو جا یہاں سے۔ اب
رے گھر میں کچھ نہیں ہے سوائے ان بچوں کے اور
رے جیسا کہ ملف شیطان صفت شخص کسی کا گناہیں
تا۔ جانے تو کیا سوچ کر آج گھر آیا ہے۔ چلا جا
رے۔ میں بھجوں گی تو مر گیا کیونکہ اگر تو زندہ رہا تو ہم
ب کا مور دے گا تو۔ تو۔ میرے بچے اپنے نشے کے
بچے دے گا۔ چلا جا ورنہ میں خود تجھے پولیس کے
لے کر دوں گی۔“ روتے روتے سکھاں وہیں فرش
بیٹھی کسی چندر نے ایک نظر ماں اور باپ کی طرف
ہا اور پھر ایک امید بھری نگاہ بہمن پر ڈالی لیکن ہر
ف واضح انکار دیکھ کر نشے کی حالت میں لڑھکھٹا ہوا
کی جانب چل دیا۔

☆☆☆
وہ کتنی دیر سے پیدل چل رہا تھا اسی طرح چلتے چلتے
ہرستان سے ملحق خالی میدان میں پہنچ گیا۔ یہ غالباً
کل کا میدان تھا۔ ہمارے پاس کراس نے قبرستان کی دیوار
تک لگا لی اور ناگس لمبی کر کے سویا۔ جانے کتنا
گزارا تھا جب کسی نے اُسے آواز دے کر جگایا۔

شامت۔ پانچ بجے شام جب وہ کھان کے ساتھ گھر آتی تو کسی سے بات کرنے کو بھیجی من نہ کرتا۔ سرشام ہی خاموشی سے مندرپر لپٹ کر پڑ جاتی اور کھان اسے دیکھ کر دیکھ کر کوٹھتی رہتی اور یہی وقت ہوتا جب وہ چندر کو جھپولیا بھر بھر بدعا عین دیا کرتی اور پھر خود ہی رونے لگتی۔ وہ جانتی تھی شاہی کوسلائی مشین سے عشق تھا۔ اور اب جوشین ہی نہ رہی تو جانور دنیا میں اس کے جینے کا کوئی مقصد ہی نہ رہا۔

☆ ☆ ☆

رات کا نہ کوئے سا بھر تھا۔ جب باہر سے آنے والے شور کی آواز سے شامی کی آنکھ کھل گئی وہ یک دم گہرا کرخت سے اٹھی۔ پہلا خیال اس کے دل میں روشن کیا آکسیں اب کچھ نہ ہو گیا۔ بچہ فرش پر مضبوط ٹھکی ٹھکیں کی خبر غریب سو رہے تھے۔ شامی احتیاط سے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے کمرے کے دروازے تک جا پہنچی۔ ٹاٹ کا پردہ اٹھاتے ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے رات کے اس سے اسے خاصا مدہ کیا۔ سامنے ہی چند کھڑا تھا۔ جسے اب اپنی بے سامگی سے خوب یاد رہتا تھا اور وہ جب چاپ پٹ رہا تھا۔ حیرت شامی کو بند کر کے بیٹے پر نہی بلکہ روشنی کے پسینے پر تھی۔ چند تو سہمی تھانے کی حالت میں بھیجی لی بن جاتا اور جوش ٹٹے لگتا تو اللہ ان کی روغن تو پیچھے پانچ سالوں سے دور کی کے بعد بھی اوچی آواز میں نہ بولا تھا۔ جب چائیکہ کی قدر غصہ کا اظہار..... غصہ کی شدت سے وہ ہانپ رہا اور پاس ہی کھڑی سیکان جھولیاں بھر بھر کر بیٹے کو دعاؤں دے رہی تھی کیونکہ روشنی نے خاموشی سے غصے ہو کر اس ہنگامہ کو دیکھا آخر کار اس سے داشت نہ ہوا خاموشی سے آگے بڑھ کر اس نے روشنی کا سامنا کیا اور بالاتفاق تمام لہا۔

”جانے دے! اب! تو کیوں اپنا آپ خراب کرتا ہے۔ چھوڑ اسے اپنے کیے کی خود بخٹکے گا۔“ روشن ہانپتا ہانپتا شائق کے سہارے پاس پڑی چار پائی پر گر گیا۔ شائق نے ایک حقارت بھری نگاہ اپنے بھائی پر ڈالی اور قریب ہی موجود منگے سے کنوڑا بھر کر باپ کو پالی دیا جو وہ ایک سی ساس میں لی گیا۔

لڑکیاں جن پر بقول ان کے گھر والوں کے جنات آتے تھے وہ بھی اس جمعرات احاطے میں لائی جائیں۔ جہاں وہ خوب دھماکا ڈالیں۔ غرض ایک عجیب سا منظر ہر طرف دکھائی دیتا۔ چندر اپنی مطلب کے لیے نہ جانے کتنی ایسی ہی لڑکیوں کو استعمال کر چکا تھا۔ جس کا علم کسی کو نہ تھا۔ کوئی لڑکی چندر کے خوف سے زبان نہ کھولتی اور اگر جو کھول بھی لیتی تو ان کی کس سے منتی تھی۔ اور نہ جانے کتنے برس اسی طرح گزر گئے۔

ان کے برسوں میں چندر کو کبھی اپنے گھر والے یاد نہ آئے اور نہ ہی کسی اس نے پلٹ کر پیچھے کی جانب دیکھا وہ تو گمراہیوں کے راستہ پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سچے گناہ کی لذت جو پڑ جائے تو پیچھا چھوڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے۔

☆☆☆

شانتی تقریباً تیس برس کی ہو چکی تھی۔ بھٹی کی شادی کو کبھی دوسرا برس تھا اور وہ ایک بچے کی ماں بھی بن گئی تھی۔ روشن کو فوت ہوئے بھی سال بھر سے اوپر ہی ہو گیا تھا۔ منکھو کھانا اپنی خالہ کے پاس رہتا تھا۔ مینے کے مینے آتا تا ما بہن سے مل جاتا اور اپنی کمائی بھی دے جاتا لیکن سکھاں اپنا گھر چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ نا جانے اُسے کس کا انتظار تھا اور اس کا ساتھ دینے کو آج بھی شانتی موجود تھی جس کا نصیب جانے کیوں سویا ہوا تھا۔ ایسے مایوسی کے عالم میں جب سکھاں کو کسی نے مدد ان والے بابا کا بتایا تو وہ فوراً ہی شانتی کو لے کر وہاں جا پہنچی۔

جس دن سکھاں وہاں گئی جمعرات کا دن تھا اور مزار پر خوب ہی ریش تھا۔ مزار کے احاطے میں ایک مصنوی قبر بنادی گئی تھی جہاں ویسے تو ہر دت زائرین کا رُش ہوتا لیکن جمعرات کا دن یہ رُش عام دنوں سے زیادہ ہوجاتا۔ آج بھی وہاں خوب رُش تھا۔ مزار کے ایک طرف ہار پھول والوں کی دکانیں تھیں اور کچھ بدست لوگ احاطے میں بیٹھے اپنے اپنے پسندیدہ نشوں میں ڈوبے ہوئے ہر دو سینڈ کے بعد حق ہو کافرہ لگاتے جس سے ماحول میں اور بہت طاری ہوجاتی۔ درگاہ میں آنے والے عقیدت مند ان کے آگے رکھے سنگھول میں کچھ مہے چب استقامت ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔ سکھاں بھی

جھڑے کے باہر دو تین مجاور موجود تھے جن کے ڈنڈوں پر کھنکھروگے ہوئے تھے۔ وہ دوسرے سے اپنا ڈنڈا زمین پر مارتے اور رات کے سے میں ایک عجیب سی دل ہلا دینے والی آواز سنائی دیتی۔ سکھاں کی ساتھی عورت نے اپنے مطلوبہ مجاور سے آہستہ آہستہ پتہ بات کی اس کی بات کے جواب میں مجاور سر ہلاتا مگر پھر اس نے ایک نظر سکھاں پر ڈالی اور دوسری نظر درود و نیکی شانتی پر اور ایک دم اٹھ کر جھڑے میں داخل ہو گیا اور چند ہی سینڈ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ وہ مجاور سیدھا سکھاں کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں منزل وائر کی ایک چھوٹی بوتل تھی، جس

میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی بوتل سکھاں کے ہاتھ میں دے دی۔

”چل جلدی سے پی لے اور آخری ایک گھونٹ لہنی پٹی پڑا دل دے۔“

لیکن سائیں میں تو بابا جی کے پاس اپنی بیٹی کے لیے آئی ہوں پھر پانی کی بوتل میرے لیے کیوں۔“

سکھاں نے حیران ہوتے ہوئے مجاور سے دریافت کیا۔

”اومانی بابا جی کو سب پتا ہے لیکن اب عشاء ہو گئی ہے اب وہ کسی سے نہیں ملتے۔ تو یہ پانی پی اور جیسا کہا ہے دیکھ۔ اگر تیری کاتیں کاتیں دن کا چلہ ہوگا تجھے درگاہ پر ہی رہنا ہوگا۔ اگر منظور ہے تو بیٹھ دے گا اپنا کام کر۔ ہمارا نیم نہ ضائع کر۔“

”ناراض نہ ہوں سائیں سرکار! میں تین دن سبیل بھنجوں گی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ۔“

مجاور بغیر کوئی جواب دے کر بلاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ سکھاں آہستہ آہستہ اپنی جگہ واپس آگئی۔ شانتی گھٹوں میں سر ڈے بیٹھی تھی۔ وہ بھی اس کے قریب ہی خاموشی سے بیٹھی تھی۔ نہایت عقیدت و احترام سے پانی کی بوتل کا دھکن کھولا اور آہستہ آہستہ سارا پانی پی لیا۔ صرف آخری ایک گھونٹ بچا ہوا یہ گھونٹ اس نے شانتی کے سر پر ڈال دیا اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ وہیں جگمگ کر لیت گئی۔

”حق ہو“ کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور چہرہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

☆☆☆

علاقے میں ناخانداندار آ رہا تھا جو کئی دنوں سے چندر کو لنگ کر رہا تھا۔ وہ چندر کے تمام غیر قانونی دھندوں سے واقف ہو چکا تھا۔ جس کی بنا پر چندر کو بہت سی مشکلات پیش آرہی تھیں۔ اُس کا دباؤ چندر پر بڑھتا جا رہا تھا۔ پیسے کے ساتھ ساتھ اس کی اور بھی ڈیمانڈ بہت تھیں۔ جس سے وہ قنوقنا پورا کرنے کی کوشش کرتا تاکہ اس کا خاندان نہ بڑے۔ ایک اینڈ شروع ہوتے ہی الہ انکپلر کے پاس ایک لڑکی بھیجنا ضروری ہوتا جس کے لیے چندر کے کارندے جمعرات والے دن اچھی طرح کام کرتے اور کوشش کرتے کہ مال جتنی جلدی ہو سکے

ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے تاکہ وقت پر کام نہ ہونے کی صورت میں وہ انکپلر کی مکمل مداخلت سے بچ سکیں۔

چندر کی خانقاہ کے اندر ایک خفیہ راستہ تھا۔ وقت ضرورت وہ وہاں سے ایسے نکلتا کہ کسی کو شک نہ ہوئے پاتا اور جب بھی ایسا ہوتا سر میدوں پر عام تاثر نہ دیا جاتا کہ بابا جی غائب ہو گئے ہیں اور اس کے زیر اثر کسی سر میدی میں کسی گناہ خاندہ ہوجاتا جس کا فائدہ خانقاہ میں موجود ہر فرد کو ملتا۔ ابھی تک وہ اندر بیٹھا جس کے ٹھونے لگا رہا تھا جب اس کا خاص الخاص مجاور اندر داخل ہوا اور چندر کے گھٹنوں کے پاس آن بیٹھا۔

”کام ہو گا؟“ چندر نے بکلی سی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے بیٹھے مجاور سے سوال کیا۔

”جی بابا جی مال پہنچ گیا ہے؟“ مجاور اس کا سوال سمجھ چکا تھا اس لیے آہستہ سے بولا۔

”حق اللہ!!!“ جواباً چندر نے ایک زوردار نعرہ لگایا جس کے جواب میں باہر بیٹھے کھنکھروگے کی آواز تیز ہو گئی۔

☆☆☆

جانے کتنا وقت لگا سکھاں کو بوتل کی دنیا میں واپس آتے۔ کون سا دن اور کیا نام تھا، ہوش میں آتے ہی اسے سمجھ نہ آیا۔ وہ تو یہ بھی بھول گئی کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ اپنا چکر اس سر تھا کہ وہ ہنسنے لگی۔ یار سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی ٹانگیں میں کس اور گہری سانس کے ذریعے ہوا کی آکسیجن کو اپنے اندر اتارا، ساتھ ہی کھنکھرو اور ڈھول کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ جیسے یک دم ہوش میں آگئی۔

”شانتی..... شانتی۔“ شانتی کی تلاش میں اس نے یہاں وہاں نظر دوڑائی۔ وہ نہیں نہ تھی۔ سکھاں یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”شانتی۔ میری بیٹی کہاں ہے تو؟“ شور بہت تیز تھا، کانوں پر سی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ایسے کوئی سکھاں کی آواز کیا سنتا۔ وہ سب کو دھکے دیتی آگے پہنچ گئی جہاں ایک سیلہ سا لگا تھا۔ تیز روشنی میں دھال ڈالتے لوگ اور وقتے وقتے سے ابھرنے والے نعرے، کوئی تیز بومیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

چرس، یہ یقیناً چرس کی بوتھی جو اکثر چندر کے پاس سے آئی تھی۔ یہاں وہاں شائقین کبیں نہ تھے۔ کوئلہ اور جگہ، ہاتھ و دم غرض اس نے ہر جگہ چھان ماری تھی۔ اب وہ گھبرا اٹھی اور ناپتے ہوئے ایک مجاور کو جا بگڑا۔

”میری بیٹی آئی تھی یہاں میرے ساتھ وہ کہاں گئی۔“ نشے میں دھست مجاور اس کی بات سمجھ نہ سکا اور اسی طرح قنفے و قنفے سے ناپچالنے سے مارا گیا۔

”کیا بات ہے اماں۔“ پیچھے ہو کر جانے لگی۔ کسی نے اسے دھکا دے کر پیچھے کیا۔ کسکھاں کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ دس شور شرابا اُبھرے، تنگم آوازوں نے اس کا سر پھر سے بھاری کر دیا۔

”بیتا کیا وقت ہوا ہے؟“ پاس کھڑے لڑکے کو اس نے کندھے سے ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

”تین بج گئے ہیں اماں۔“ اس کا مطلب وہ آٹھ گھنٹہ سوئی رہی۔ اتنی دیر میں شائق کہاں گئی۔

”کیا ہوا اماں اس کو ڈھونڈ رہی ہو۔“ اسے یہاں وہاں نظر دوڑاتے دیکھ کر لڑکے نے دوبارہ سوال کیا۔

”میری بیٹی شام میرے ساتھ آئی تھی۔ مجھے جانے کیا ہوا، ایسی نیند آئی کہ کبھی گھنٹہ سوئی رہی۔ اب جا کی تو شائق جانے کہاں گئی۔ کتنی دیر سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ مل

کے لی نہیں دے رہی۔“ بات کر کے ہوئے اس کی نگاہ اسی چادر والی عورت پر پڑی جس کے کہنے پر اس نے

مجاور سے لے کر پانی پیا تھا۔ وہ بھاگ کر باپنی کا پتہ اس کے پاس جا پہنچی۔

”میری بیٹی کئی نارات میرے ساتھ۔ تم نے دیکھی تھی نا، وہ نہیں مل رہی، جانے کہاں گئی۔“

”کون لی بیٹی؟ اور میں نے کہاں دیکھی تھی؟ میں تو چاروں بعد ابھی ابھی یہاں آئی ہوں۔“ قطعی اجنبی لہجہ

میں وہ عورت حیرت سے بولی۔

”بھتے بعد۔“ لیکن کل جمعرات کی مندر تم وہاں میرے ساتھ بیٹھی تھیں۔“ کسکھاں حیران ہوتے ہوئی

بولی۔

”جمعرات کل نہیں۔ چاروں پہلے تھی۔ آج تو بابا جی کا عرس ہے۔ ماں۔“ جمعرات کو گزرتے تو کئی دن ہو گئی، تو نے کوئی سونا ٹوٹا تو نہیں لگا ہوا۔“

عورت اس کا منہ سو گھٹے ہوئی ٹھٹھہ مار کر ہنس دی۔

”جمعرات چاروں پہلے تھی۔“ کسکھاں اس عورت کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے دھیر سے بڑبڑائی۔

”میں چاروں بے سدھ رہی اور میری شائق کبیں غائب ہو گئی۔“ اس کے دل کو جیسے کسی نے بھی میں لے کر

مسل دیا۔

”شائق!!“ وہ حلق کے بل چلائی۔ گھگھر وٹوں کی آواز اس کی چیخ سے تلبے دی گئی۔ ”شائق میری بیٹی

شائق!!“

اس دفعہ اس کی چیخ پہلے سے زیادہ ہولناک تھی۔ یکدم سارا شور ختم گیا۔ اس پہلے بھڑے کے اندر بیٹھے چندر

کے کان میں آنے والی چیخ نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تیزی سے باہر کی طرف لگا۔

دروازے پر پڑا پردہ اٹھا کر باہر دیکھا۔ جہاں ایک طرف دس بج تھا۔ باقی سارا شور اب ختم چکا تھا۔

ایک مجاور اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر دوڑتا ہوا آیا۔

”اس لڑکی کی ماں نے باہر بھاگ کر مجھ کو دیا ہے۔“ وہ چندر کے کان کے قریب بولا۔ چندر نے کوئی

جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا چلتا جمعے کے قریب آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی سارا ارش چھٹ گیا۔ لوگ

دور دور ہو گئے۔

”بابا جی کی عبادت میں غفل پڑ گیا عبادت چھوڑ کر باہر نکل آئے۔“ مختلف آوازیں اس کے کانوں سے

نگرا میں جن پر تو جدے بناوے نیچے فرش پر بیٹھی تھیں کرتی بوز عورت کے پاس آن بیٹھا۔

”اماں۔“ اس کے ہونٹوں سے سرسائی آواز نکلی۔

”میری شائق۔“ اماں روتے ہوئے ایک ہی نام

کرار رہی تھی۔ اس پر ہر چیز واضح ہو گئی وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اسے میرے بھڑے میں لے آؤ۔“ مجاور کو حکم دیتا

تھکے تھکے قدموں سے وہ واپس آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں

اس کے بھڑے میں اس کی ماں اس کے بالکل سامنے بیٹھی

تھی، بے جانے بنا کر اسی کے سامنے بیٹھا بڑے بڑے بالوں

والا یہ شخص اس کا اپنا بیٹا ہے۔ وہ بڑی طرح روری بھی اور

چندر سر جھکا کے ایسے بیٹھا تھا جیسے شائق مر گئی ہو۔

☆☆☆

اڑی ہوئی شائق نے ہاتھوں سے سر اٹھا کر اپنے

ماتے پوجھوس کودیکھا۔ اتنے دنوں سے وہ جو عذاب

پہن رہی تھی اس میں اسے سارے چہرے ایک جیسے ہی

لگے تھے۔ کسی چہرے میں کوئی فرق نہ تھا۔ سب

کے بڑے بڑے دانتوں والے خون پیٹے بیٹھے

تھے۔ اس وقت وہ چہرہ بھی ایک خون خوار بیٹھے کے تھا

یہ ایک تبدیلی ہو گیا۔ اس نے شائق کے سر کو ایک چادر

باندھ دیا۔ اس کے سر پر رکھا اسی انجان شخص کا ہاتھ

باندھ رہا تھا۔ وہ شاید رو بھی رہا تھا۔ اور پھر کچھ دیر بعد

رات کے اندر میرے میں وہ شخص شائق اور کسکھاں کو

لے لے کر رات سے باہر ایسے لگا کر دوبارہ کسی نے اس

خانہ میں موجود بابا جی کو نہ دیکھا۔

☆☆☆

قدم قدم گھٹیا چندر اپنی ماں اور بہن کے ساتھ

بالے کے آس پاس پرتن تھا کھڑا تھا۔ اپنا خاص ایک باروہ

بڑے سے پیچھے چھوڑ کر آ گیا تھا، جب اس کی ملاقات

مولوی زکریا سے ہو گئی اور وہ اسے ساتھ لے کر اپنے گھر

آ گئے۔ جس کا راستہ مسجد سے ہو کر گزرتا تھا۔ چندر

دل گیا۔

”میں غیر مسلم ہوں مولوی صاحب۔“ اپنے چہرے

پر چھوڑ دیتی سے دوسروں کو دھوکا دینے والا چندر

جوت ہول کا دل ہونے کی ہمت خود ہی نہ پاتا تھا۔

”میں جانتا ہوں لیکن یہ خدا کا گھر ہے۔ ہو سکتا ہے

یہاں داخل ہو کر تمہارا دل بھی اپنے گناہوں سے تائب

ہو جائے۔“ مولوی صاحب دروازے سے اندر داخل

ہوئے۔

”ہم تمام لوگ ہیں مولوی صاحب۔ ایسے پاک

گھر میں داخل ہونے کے اہل نہیں۔“ شائق روتے

ہوئے بول رہی تھی۔

”میں تمہیں اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں بیٹا، مسجد

نہیں، صرف اتنے عمارت کے میرے گھر کا راستہ اللہ کے

گھر سے ہو کر لگتا ہے۔“ وہ شائق کے سر پر ہاتھ رکھتے

ہوئے پیار سے بولے اور پھر ان کی تقلید میں وہ سب مسجد

کے بار والی کتا جی سے نکلے مولوی صاحب کے گھر

آ گئے، جہاں پہنچتے ہی چندر نے دو دو کر انھیں اپنے

بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جسے سننے کے بعد مولوی

صاحب نے اسے کچھ نہ کہا، نہ کوئی لغت ملامت کی اور نہ

ہی کوئی سخت الفاظ بولے۔ کہا تو صرف اتنا کہا۔

”میری صرف اتنی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اب

ہدایت کا راستہ نصیب فرمائے۔“

یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے تھے کہ جو چندر کے

لیے راہ نجات ثابت ہوئے اور واقعی میں ہی وہ صداقت

پا گیا۔

مولوی صاحب کے حسن سلوک نے اس کے دل کو

یکسر تبدیل کر دیا۔ مولوی صاحب کی درخواست پر بابا

جی کی درگاہ بھی بند کر دی گئی۔ جہاں سے غائب ہونے

والے بابا جی آج بھی لوگوں کے لیے باعث عقیدت

تھے۔ آہستہ آہستہ گزرتے وقت نے اس کے دل پر بھی

ساری میل دھو دی، اور اس کا دل بالکل آئینے کی طرح

صاف شفاف ہو گیا۔

☆☆☆

کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی چندر کا عبد الرحمن اور

شائق کا فاطمہ تجو یز جبکہ ماں کسکھاں بنا اسلام قبول

کیے تھے۔ دینا سے رخصت ہو گئی۔

عبد الرحمن نے قاری صاحب سے نہ صرف قرآن

شریف پڑھا بلکہ دینی علوم کا مطالعہ بھی کیا اور پھر مولوی

صاحب کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی اصل محلہ اپنی

مشکلات کے کران کے پاس آنے لگے، وہ سوسہنا ب

کی مدد سے حل کرنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سوسہنا ب

جسے چاہے بخش دے اور اس کا دل ایمان سے

بھردے۔ جسے چاہے اپنی پکڑ میں لے لے اور ہر

عبادت کے باوجود ان کے دلوں کو ایمان سے خالی کرتا

جائے۔ یہ میرے رب کی مشیت ایزدی ہے جسے بے

شک وہی جانتا ہے۔ ہم تو صرف سوچ سکتے ہیں جانے

کب کسی کو وہ بخش کر اپنے پیارے بندوں میں شامل

کر لے۔ یہ اس کا اختیار ہے اور ایسے وہ کسی کا فرد

لوگوں کو بدلتا ہے اور ان کے دل ایمان سے بھر جاتے

ہیں۔ بے شک میرا سوسہنا ب ہر چیز پر قادر ہے۔“

☆☆☆

دو گولڑی کی عورت!

عقیدہ حق

خامس نمبر کے لیے، ایک بہت خاص داستان حال بہت خاص صنف کی جانب سے

مجھے ایسا لگا جیسے ساتوں آسمان دھڑ دھڑ مجھ پر آگرے ہوں..... اور اُن کے نیچے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا ہو۔ میں نے سانسے لگے قدام آئینے میں اپنا عکس دیکھا، میری آنکھوں میں وحشت تھی اور شرمندگی بھی۔

میں نے چہرے پر پھیلتا تھوک محسوس کیا اور پھر جب سے رو مال نکال کر کپکپاتے ہاتھوں سے اُس ان دیکھے تھوک کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔ جو میرے چہرے پر نہیں تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ میرے عکس نے مجھے ٹھوک مارا۔ میرا تعمیر مجھ پر بنا۔ تو میں نے اپنے آپ سے آنکھیں چرا تے ہوئے۔ اپنے وجود کے اندر شور مچاتے طوفان کو دباتے ہوئے۔ اپنے آپ کو جھپٹاتے ہوئے۔ آہنجی سے۔ آہنجی آہنجی سے کہہ دیا اور مجھ تک نہ پہنچ پائے اور کہا؟

☆☆☆

”بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں نے سارا دن کے لیے رکھی ہے۔“ تابندہ نے سر جھکائے پوچھا لگائی ہوئی ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے آہنجی سے کہا۔ ”یا اللہ آج پھر بنی ماسی“

”ویسے ایک بات ہے آپ خواتین کا مسئلہ

ملازمین“ بھی حل نہیں ہو سکتا۔ چتا شہر یار ہماری بیگم کی ہر دوسرے دن جھلکی خواتین کے ساتھ نئی فونک کانفرنس ہو رہی ہوتی ہے اور ایجنڈا ہوتا ہے۔ ”کیا ماسی آگئی؟“

خواتین خوش فہمی میں بھی شاید ایک دوسرے کو کال نہیں کرتیں لیکن مسئلہ ملازمین پر دیکھنے کی خواتین کا اتحاد اور یکاگت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

میں نے آملٹ کو فونک میں پھنساتے ہوئے اپنے کزن شہر یار سے کہا جو کہ اسلام آباد سے چند دن کے لیے میرے گھر آ ہوا تھا اور قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ یہاں پر ماسیاں جگہ بھی تو بہت کرتی ہیں، اب تم خود سوچو شہر یار۔ میرے گھر آ کر ایک ماسی جو خود نیلم کالونی میں رہتی ہے اور ماسیاں اس کا کپڑا کاٹھیلا لگاتا ہے کہہ رہی ہے کہ اوفوہ باجی یہ جو آپ نے لاؤج میراں ماسی نیشن میں سیٹ کیا ہے۔ اس سے پچھرا رہے ہیں۔ اور مجھے پچھروں کی عادت نہیں ہے۔ اب بتاؤ میرے گھر میں تم کو کوئی پچھرا نظر آیا۔ تم ہی بتاؤ۔ میں اس کو رکھوں گی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اور آہنجی محترمہ کہتی ہیں باجی روٹی میں پکاؤں

کہا۔ ہاں کہنے لگی اور برتن۔ میں نے کہا۔ میں نے بھی صاف کروگی اور ڈسٹنگ کروں گی۔ تو کہنے لگی ٹھیک ہے لیکن آپ صبح گاڑی لے کر بلا میں گی اور ڈرائیور سے گھر واپس لے آئی۔ میں نے کہا۔ بیگم صاحبہ آپ کا نکاح نہ کروں گا۔ میں نے کہا۔ اس کو باہر کا اس وقت میں نے چوکیدار سے کہا۔ اس کو باہر کا اس کو باہر کا۔ اور آپ سن رہے ہیں نا۔“ تابندہ نے کہا۔

لیکن میں اس کی سن ہی کب رہا تھا۔ میری لگن تو اس پکلی کی کردانی لڑکی پر جیسے ٹھہری گئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ جو سیاہ کاشن کے بلاؤز سے جھلکتی ہوئی لڑکی کر رہی تھی۔ سولی کی بالوں کی چوٹی، جو ان کے پیچھے سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔

چوٹی سے نکلتے، گردن سے سانپ کی طرح اپنے بال اور گردن سے نیچے کر تک آتی مٹوئیں کی گندمی پسیلیوں کی لڑی، جو کہیں کہیں سے بھٹکتے بلاؤز کو کھر کھیر بنا رہی تھیں۔

اس کا چہرہ کیسا تھا۔ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی کمر کیسی تھی میں کمر زدہ تھا، میں فطرتاً عاشق مزاج مرد تھا، خدا نے مجھے دولت کے ساتھ ساتھ ایک پرکشش شخصیت بھی دی تھی اور اس پرستم لاد لاد میں عورتوں کو بخوبی سمجھتا تھا۔ میں گفتگو کے انداز سے عورت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا۔

کچھ لوگ دنیا میں بہت شاندار نصیب لے کر آتے ہیں۔ تابندہ کو دیکھ کر میں اکثر سوچتا تھا۔ تابندہ بے حد خوب صورت اور مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سادہ تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور اعتبار بھی بے چاری روایتی بیوی۔



☆ ☆ ☆
”آپ نے گھر پر کبہ دیا کہ آج آپ لیٹ
آئیں گی۔“ میں نے اپنی خوب صورت ٹانپسٹ سے
کہا۔ اس کی بہن کی شادی کے لیے قرضہ منظور کرتے
ہوئے پوچھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اثبات
میں سر ہلاتی مجھے اور بھی خوب صورت لگی۔

کی انتہا نہیں رہی۔ میرے خیالات میں شکار تک رسائی آسان تھی۔

کی
رہ
جہا
کرا

نہا۔ اوہ میرے منہ سے نکلا۔
”جھا“ میں سنبھلا اور لا پروا
”جھا“ بہت ہی اچھی ہے۔ بے شک۔

مائی کے لیے؟ کون سی مائی کے لیے؟ تابندہ حیرت سے گویا ہوئی کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں ملازمین کو زیادہ لفٹ نہیں کرواتا تھا۔ کجا کران کے لیے کچھ خرید کر لانا۔

ارے وہی..... جس کا بڈھا سا مایاں ہے۔ اس کے لیے کیا نام ہے اس کا؟ میں جان بوجھ کر انجان بنا ورنہ اس کا نام تو مجھے اپنے نام سے زیادہ اچھا لگتا تھا اور یاد رہتا تھا۔ جو اس کو ایک بار دیکھ لے۔ پھر وہ ساری زندگی اس کو اور اس سے وابستہ کسی بھی چیز کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

”اچھا..... اچھا آپ سویرا کے لیے لائے ہیں۔ چلیں اچھا کیا۔ بے چاری وہی دو ساڑیاں لینے پھرتی تھی۔ میں دوں گی تو خوش ہو جائے گی۔ بلکہ میں اس کو ابھی دے دیتی ہوں۔“ تابندہ نے اس کو آواز دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ بیوی اگر خوب صورت ہو، بالدار بھی ہو تو عموماً مرد کو اس سے محبت ہو ہی جاتی ہے لیکن خوب صورت اور بالدار ہونے کے ساتھ ساتھ اگر بیوقوف بھی ہو تو پھر مرد کو اس سے عشق ہو جاتا ہے اور مجھے بھی تابندہ سے عشق ہو گیا ہے۔

”بہت مہربانی صاحب۔“ سویرا نے ہاتھ میں چکڑی ساڑی کو دیکھتے ہوئے خوشی سے سکیپاتی آواز میں کہا۔ ساری زندگی اترن پہننے والی۔ اس عورت کو کہاں ایسی ساڑی بھی نصیب ہوئی ہوگی؟ لیکن اس ساڑی کی قیمت۔ کیا ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا۔ میں تو صرف اس کی طلب محسوس کرنا چاہتا تھا۔ خواہشوں کی ڈیسی ہوئی۔ حسرتوں کی مار کھائی ہوئی عورت..... بڈھے کے ساتھ رہتی ہے۔ لاغر..... لاغر..... ہر وقت کھانا کھاتا بڈھا۔ مجھ جیسے وجیبہ، بالدار، خوشبوؤں میں بے مرد نے تو کبھی اس کی طرف دیکھا تک نہیں ہوگا۔ میں اپنی اڑانوں میں تھا؟

کیا وہ بھی یہی جانتی ہے؟ کوئی میرے اندر سے سوال کر رہا تھا۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ اس کی مسکراہٹ بتاتی ہے۔ اس کی چال سمجھاتی ہے۔ وہ بھی وہی جانتی ہے جو میں جانتا ہوں۔

میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنے ضمیر کو تسلی دی۔ لیکن کب؟ میرے اندر سے کسی نے پھر سوال کیا۔ اس کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے گا..... اس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ میں تو جس عورت کو ایک دفعہ نظر بھر کر دیکھ لوں وہ خود بخود میری طرف ہی کھینچی چلی آتی ہے۔ گو کہ تابندہ اچھی تھی۔ لیکن روز، روز گھر کے کھانے سے میرا دل اکٹھا گیا تھا۔ ابھی بھی اکثر مجھے باہر کے کھانے کی طلب ہوتی۔ اور میں اپنی طلب اپنی جھوک مٹاتا رہتا۔ آپ لوگ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیسا خراب مرد ہوں۔ بے وفا، ہرجائی، ایک شریف عورت کو دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ۔ بہت ساری عورتوں سے کھیل رہا ہوں۔

جو بہت اچھی تھی اس کو میں نے گھر میں قید کر لیا۔ نکاح کے دو بولوں کی پھنکیاں اس کے پیروں میں ڈال دیں اور ابھی اپنی محبت سے بھی اس کو نواز دیتا ہوں۔ لیکن یہ عورتیں، یہ عورتیں بھی تو میرے ساتھ برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ تو صرف میں ہی خطا کار کیوں؟ اور میں۔ یعنی حیدر جمال۔ میں تو ایک حسن پرست آدمی ہوں اور ایسی حسین عورت میری گھر کی جھاڑو لگا رہی ہے۔ نہیں، نہیں میں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اکثر سویرا کو کسی نہ کسی کام کے لیے پکارتا رہتا اور وہ بھاگ بھاگ کر میرے کام کرتی۔ میں تابندہ کے ذریعے اکثر اس کی مدد کرتا رہتا اور وہ میری احسان مند رہتی۔

”سویرا آپ کی بہت عزت کرتی ہے۔“ تابندہ نے ایک دن مجھ سے کہا۔ میری عزت کرنے لگی ہے۔ ارے عزت دت کیا۔ یقیناً مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ بوڑھے لاغر مائی کی بیوی۔ دو کوڑی کی معمولی عورت۔ میرے اندر کے کینے اور مسکمر مرد نے ایک عورت کو کیسے کے تراز میں تو لا۔ میں تابندہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کو کیا پتا میں کیا سوچ رہا تھا۔ میں موقع کے انتظار میں رہنے لگا..... اور۔

☆☆☆

”بھئی اس عورت کو منع کریں۔ یہ مجھے بھائی مت کہا کرے۔“ میں نے جھنجھلا کر تابندہ سے کہا۔

میری بھائی کی زٹ سے تنگ آ گیا تھا۔

”کیا ہوا؟ تابندہ حیران ہوئی۔ اب میری یہی تو اوقات رہ گئے۔ بھئی مجھے بھائی۔ دولہا بھائی کہتا پھرے۔“ بھئی نے غرور کا جواز نہیں دے سکتا۔ جس طرح وہ میں نے مجھے صاحب کہتے ہیں۔ یہ بھی صاحب کہتے ہیں۔ میں تابندہ کو جھڑک دیا۔

”ایسا تو نہ کہیں۔ ایسے بڑے بڑے بول نہیں لے۔ میں ناراض ہوتا ہے۔ خیر میں اس کو منع کر دوں گا۔“ وہ تو آپ اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں تو وہ آپ کو بھائی کہنے لگی۔“ تابندہ نے منہ بناتے ہوئے فکے لہجے میں دراصل تابندہ بہت ہی سادہ عورت تھی اور نہ کبیرت دور۔

”یہ بھوک مٹانی ہے اور یہ عورت میرے لیے نہیں بن چکی ہے۔ اتنا نام تو مجھے بھی نہیں لگا۔“ تابندہ نے منہ بناتے ہوئے فکے لہجے میں دراصل تابندہ بہت ہی سادہ عورت تھی اور نہ کبیرت دور۔

تھا۔ میری تو سوچیں کھول رہی تھیں۔

☆☆☆

”تم تھک نہیں جاتیں۔“ میں نے بچن میں برتن دھوئی۔ سویرا شہد نکاتے لہجے میں پوچھا۔ ”نہیں صاحب جھٹھکا کیسا۔ ہم تو اسی طرح رہتے ہیں۔ ہاں اگر ہم کام نہیں کریں گے تو تھک جائیں گے۔“ کہتے ہوئی وہ مسکرا دی۔ اس کے گالوں میں پڑنے والے ڈھیل نے اس کو اور حسین بنا دیا۔ اس کی مسکراہٹ عام سی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے اندر کا انسان کہہ رہا تھا۔ یہ عام عورت نہیں ہے۔ بہن ہے۔

☆☆☆

”کیا میرا دل چاہ کہہ رہا تھا۔ پتا نہیں۔“ یہی تو ہوتے ہیں۔ اگر آپ جیسے ہوس پرست خریدار نہ ہوں تو عورت کیوں بازار میں جائیے لیکن یاد رکھیے۔ بازار میں کھڑی مجبور اور بھی بے بس عورت اور گھر میں بیٹھی بیٹی عورت میں اکثر بہت فرق ہوتا ہے۔ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ یہ فرق مٹا سکتے ہیں؟ ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے والے دوسری عورت کو ہوس زدہ نظروں سے دیکھنے والے

بہن بھائی میں شائع ہونے والا لازوال ناول ’ناشور‘ کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ
ان کے ذاتی تجربات اور اصل حقائق و اثرات
سعادت و محنت کا حساب، حیرت و تجسس پختی ناول

تحریر: شازی سعید منٹل

۳۵۰ صفحات

Postage Rs: 50

برصغیر میں علم تیسرے بانی حضرت کاش الہرنی کی
عالمیت و کاملیت، روحانیت، محبت، تقویٰ اور دوسری دنیا
کے تجربات و مشاہدات پر مبنی اس کتاب سے نئے راز کھولنا ایک
عمر انگیز ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش الہرنی ”بنام“
”ناشور“ ہیں

انہی رابطہ کے ذریعے آپ کو کتاب کی پڑائی اور ڈیک کروائیں۔
Aurak Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800



بہن بھائی

ہم شکل

ایک نئے رات

چمکا کر تان میں تکیا ہاں، برصغیر کے نامور قلم کار ایم اے راحت کے قلم کا جادو

آخری قسط

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرمایا۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ ان کے قصوں اور نوکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن انھوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے ساتھ ”ہم شکل“ بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر بڑکی سے تو ایک جج اسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ”عالی“ کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ جج میں موجود ایک بزرگ اسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور ”ہم شکل“ اس کی صورت حال سے ششکے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ”عالی“ جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط

”اوہیں! اپنی جان کا ذرا تپش کرنے جا رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ چھوٹی ہونے کے بجائے میرا سر جانا بستر ہے، یہ غم بھی نہیں ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہیں، تو آج کئی مجھے زندگی کی ساری خوشیاں مل گئیں، لوگو خیکال کے لوگو۔۔۔ جنہاری ملکہ تمہارے درمیان آگئی، سارا یہ سچ بولتی ہے اور تم یہی کہنا کہ سارا یہ سچ تھی، میرا سارا جادو اسی دقت کے لیے تھا، آہمیری بچی، میں اعلان کر ادوں میں بتا دوں کہ مقدس ملکہ ہمارے درمیان آگئی ہے، خیکال کے سونے والو، آج کی رات سونے کی نہیں گانے کی رات ہے۔ جشن منانے کی رات ہے۔“

بوڑھی ساری نہ یوں اور اچھل رہی تھی، اس کے کمر و بدن میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آئی تھی کہ وہ شور کا کا
تھ پکڑے ہوئے ایک جانب بھاگی۔ جوشان اور شاہ زیب یہ اندازہ نہیں لگائے تھے کہ وہ کہاں لیے جا رہی
ہے ویسے یہ باہر جانے کو راستہ نہیں تھا بلکہ کچھ لمبی پکڑییز جہاں اس شخص سے عبور کرنے کے بعد وہ کسی مخصوص جگہ پہنچ
گئی، یہاں سے یہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، جوشان نے شاہ زیب کا بازو دبا تے ہوئے کہا۔
”تمہاری دوست تو کمال ہی کر دیا، وہ اس سے افریقی زبان میں بات کر رہی تھی، میں اس کے الفاظ تو
نہیں سن سکا، لیکن بوڑھی کا انداز یہی بتاتا تھا جسے اس نے شور کی آدک اعلان سنا ہوئے“

شاہ زیب نے خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی، البتہ اب یہ لوگ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے یہ لوگ اس تمام صورت حال کا نظارہ کر سکیں۔ بہتر حال یہ لوگ بھی سیزہاں جڑھنے لگے، سیزہاں بلندی تک گئی تھیں، لیکن ایک راستہ درمیان سے کٹتا تھا اور وہ ایک چٹان پر جا کر ختم ہوتا تھا، ابھی یہ لوگ چٹان تک نہیں پہنچے تھے کہ بوڑھی ساریہ کی آواز ابھری، جبکہ جوشان شاہ زیب کا مترجم بنا ہوا تھا، بوڑھی کہہ رہی تھی۔

”خشبکال کے سونے والو، سو رہے ہو، سونا بہتر نہیں ہے جاگو کہ جاگنے والی رات آگئی، آداس خاناغی کی طرف اور ساریہ کے بچے کی تصدیق کرو اور سنو تمہاری دیوی تمہارے درمیان آگئی ہے، دیکھو میں تمہارے سامنے اپنا بچہ پیش کر رہی ہوں۔“

اس کی کمزور آواز اس قدر نہیں تھی کہ بستی تک پہنچ جاتی، چنانچہ اس نے کچھ اور کاروائی کی اور چند ہی لمحات کے بعد ایک بھیا تک آواز فضا میں گونجنے لگی، یہ نرنکے کی آواز تھی، غالباً کسی بہت بڑے نرنکے کو پہنچا کر جا رہا تھا اور اس آواز کے اثرات بستی والوں پر فوراً ہی ظاہر ہو گئے، بستی کے زیادہ تر لوگ سوچے سمجھے روشنی بجھ گئی تھیں، لیکن نرنکے کی مسلسل گونجنے والی آواز سے لوگ جاگنے لگے تھے اور ہر گھر میں روشنی ہوتی جا رہی تھی، لوگ اس نرنکے کی آواز کو کسی آفت کا پیش خیمہ سمجھتے تھے، بھڑا ہست آہستہ لوگوں کو جھنجھوڑوں نرنکے ہوئے دیکھا گیا، وہ ہنڈی کی طرح اپنے اپنے جھنجھوڑوں سے باہر نکل کر ایک دوسرے سے چہ یکوئیائیں کر رہے تھے، ہر طور پر لوگ کئی سی کیفیت میں جا پڑے، جوشان بھی لپک لپک خاموشی سنجیس غریب منظر دکھ رہا تھا، جہاں تک لگاؤ کا کام کر رہی تھیں وہاں تک انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے، کچھ مسخیں بھڑی سے خافتانہ کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئیں اور جوشان نے شاہ زیب سے کہا۔

”بہتر ہے کہ تھوڑی سی آڑ میں ہوجاؤ، اس وقت سب کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی ہیں، ہم سے تھوڑی لمبی پرسونا راجوڑی کے ساتھ موجود ہے۔“

شاہ زیب نے جوشان کی ہدایت پر عمل کیا آنے والے گھوڑوں پر سوار تھے، ان کی تیز رفتاری سے یہی اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ بستی کے دوسرے سرے سے آ رہے تھے اور ان کے لیے راستہ چھوڑا جا رہا تھا، جوشان نے آہستہ سے کہا۔

”ہو سکتا ہے ان آنے والوں میں میسی سونا بھی شامل ہو۔“

پسفر کر رہا تھا، جھوٹی ہی دیر کے بعد وہ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس راستے پر آگئے۔
خفاہ کی بیڑھیاں آتی تھیں اور پھر خشاوں کی روشنی میں اس قدامت و عورت کو دیکھا گیا جو گھوڑے سے
جانب بڑھ رہی تھی، لہجہ چھ افراد بھی اس کے عقب میں چلے آ رہے تھے، یہ عورت میسوی سونا
کی تاریکی میں اس کے خدو خال کو نظر میں آ رہے تھے لیکن اس کی چال
تیز اور تیز سی خفاہ کی بیڑھیاں عبور کرتی ہوئی اوپر آ رہی تھی۔

[illegible][illegible]

جانوں جیسی محی اور انداز سے اپنی ہاتھ چٹا کر لودھ سے لیں۔
 میسوں مانا تیز می سے آگے بڑھی شوراک سار پہ کے ساتھ می اور اس کے پہرے پر جذبات کے ساتھ
 لرز رہے تھے۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا بہت طویل ترین عرصے کے بعد تھانے کتنے
 عرصے کے بعد اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا، لیکن اس کے جذبات اس کی محبت میں کوئی واقع نہیں ہوئی
 تھی یہی سو مانا تھ پہلی پہلی آنکھوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا وہی چہرہ، وہی سب کچھ اور اس کے بعد اس کے
 دونوں ہاتھ جھیل کے بعد دوسرے پہلے وہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو گئی تھیں۔ ان کے منہ سے
 طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کے بعد وہ منظر بھی دیکھا گیا جس کا مطلب شاہ زیب بخوبی
 سمجھا گیا۔ مسر مستحسان جہت زدہ تھے۔

[illegible]

میں نہیں آسانی سے ہاوں۔“ یہ الفاظ اس نے اتریں۔
تھے کہ الفاظ ان کے لیے ہیں۔ دیکھنے کے لیے کچھ چرب شوراک خاموش ہوئی تو میں سوٹا نے
میں سوٹا ایک لمبے کے لیے کر کے دیکھنے کے لیے کچھ اپنے ساتھ چلے گا اشارہ کیا۔ یہ ہتھ کرکے سارے کے یہاں
اپنے سامنے میں لایا اور اس کے بعد سارے کچھ اپنے ساتھ چلے گا اشارہ کیا۔ یہ ہتھ کرکے سارے کے یہاں
میں سوٹا ایک لمبے کے لیے کر کے دیکھنے کے لیے کچھ اپنے ساتھ چلے گا اشارہ کیا۔ یہ ہتھ کرکے سارے کے یہاں

موجودگی ان دونوں کے لیے ہوئے وہ لوگ اپنے گھروں کے آواز فضا میں جاگ رہے تھے۔
خانقاہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ لوگ غالباً یہ معلوم کرنے کے لیے جا رہے تھے کہ یہ جہنم کی آواز فضا میں جاگ رہے تھے۔
جاگ رہے تھے اور وہ لوگ غالباً یہ معلوم کرنے کے لیے جا رہے تھے کہ یہ جہنم کی آواز فضا میں جاگ رہے تھے۔

شاہ زیب نے مسر جوشان کی طرف دیکھا جو بہت خوش نظر آ رہے تھے، انہوں نے شاہ زیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”شاہ زیب میرے دوست ہم نے بلاشبہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور تمہاری ساتھی لڑکی اداکاری میں اپنا جواب نہیں رکتی جو کچھ دیکھا گیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یقینی طور پر اس عورت کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائے گی کہ وہی اس کی بیٹی شورا ہے اور اگر اسے کامیابی حاصل ہوگی تو پھر تم دیکھ لینا کہ ہماری تقدیریں بدل جائیں گی۔“

شاہ زیب دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا، اس کے باوجود وہ ابھی مسر جوشان کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ درحقیقت وہی لڑکی شورا ہے، اصولی طور پر ابھی یہ مناسب نہیں تھا، جب تک کہ کوئی ایسی کاروائی نہ ہو جائے جس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ میرا یہ انکشاف کسی طور پر نقصان دہ نہیں ہو سکتا، چند لمحات کے بعد مسر جوشان نے کہا۔

”اور وہ ہمیں ہدایت کرگئی ہے کہ ہم اسی خانقاہ میں رہیں اب دیکھو ہم پر کیا ہوتی ہے“
یہ لوگ اس بلند جگہ پہنچ گئے جہاں سے تھوڑی دیر قبل زنگیلا پھونکا گیا تھا۔ یہاں سے بستی کا منظر مزید صاف نظر آ رہا تھا، گھوڑوں کی قطار چلتی جا رہی تھی اور شعلوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔
وہیں پوری بستی روشن ہوئی جا رہی تھی، بتائیں دیکھنے والوں نے کیا دیکھا۔ یہ لوگ کافی دیر تک وہاں کھڑے رہے، بستی میں مسلسل چہل پہل نظر آ رہی تھی، پھر مسر جوشان نے کہا۔

”آؤ یہاں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتے ہیں۔“

شاہ زیب نے مسر جوشان سے اتفاق کر لیا اور یہ لوگ نیچے اتر آئے پھر انہوں نے خانقاہ کا کوڑہ کو نہ چھان مارا لیکن کوئی ایسی چیز نہ ملی جسے غذا کے طور پر استعمال کیا جاسکتا، شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”وہ راہبہ بھی ظاہر ہے دنیا کے بیش و عشرت سے اسے کوئی لگاؤ نہ ہوگا۔“

”لعنت ہے اس پر بغیر کھانے پینے جیتا بھی کوئی جیتا ہے، مجھے دیکھو، میں نے کس محنت سے وہ اشیاء جمع کی تھیں، جبکہ میں بھی ایک راہب ہی کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا۔“ جوشان کی بات پر شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”اگر سونا راہبیں نظر انداز کرے تو پھر یقیناً بہت جلد ہمارے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔“

”خدا کرے اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔“

دونوں کچھ تھکن سی محسوس کر رہے تھے چنانچہ ایک مناسب جگہ دیکھ کر لیٹ گئے لیکن نیند کا آنکھوں میں شائبہ بھی نہیں تھا ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسی طرح گزار گیا، پھر مسر جوشان اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھے۔

”کہاں جا رہے ہیں مسر جوشان؟“

”ذرا دیکھیں باہر کیا حالات ہیں۔“

دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے باہر کا منظر دیکھا جاسکتا تھا، بستی میں وہی چہل پہل تھی، بستی والوں کو ابھی شاید صورت حال سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا، انداز سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ اصل صورت حال ابھی تک سمجھ نہیں پائے ہیں۔ ظاہر ہے اتنی جلدی شورا کی آمد کا اعلان ہو بھی نہیں سکتا تھا، اب یہ ان کے اپنے معاملات تھے، مسر جوشان تو ابھی اسی امید و بیم کی کیفیت کا شکار تھے کہ سونا راہپاں تیس سی سونا ٹاکو یا تین دلائے میں کامیاب ہو بھی سکتی یا نہیں کہ وہ شورا ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر مسر جوشان کی تمام محنت کا ارت جائے گی، لیکن اس کے برعکس شاہ زیب اس سلسلے میں سو فیصد یقین رکھتا تھا کہ شورا کو اپنی حیثیت منوانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی، بلکہ اس نے یہ حیثیت چند لمحات ہی میں منوائی تھی۔ شاہ زیب نے مسر جوشان سے کہا۔



Poora Pakistan Raha Hai Bol Hashmi Ispaghool

روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھے

- ✓ معدے کو صاف
- ✓ بلڈ شوگر کا لیول برقرار
- ✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
- ✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Hashmi Ispaghool Husk

Natural fibre for bowel regulation and reduction of blood cholesterol

www.hashmisurma.com Hashmi Since 1794

”مسٹر جوشان، اگر آپ ساری رات جاگتا چاہتے ہیں تو جاگتے رہیں، میں سوئے جا رہا ہوں۔“

”جاگتا ہے سوئی ہے، لیکن نیند کیسے آئے گی، تاہم اگر تم سونا چاہو تو سو جاؤ اگر کوئی خاص بات ہوئی تو میں تمہیں جگا دوں گا۔“

شاہ زیب نے اس بات کی حامی بھری اور پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر لیٹ گیا، اس نے تمام فکر میں بھلا کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایک بار پھر ذہن سے خیالات کے قافلے گزرنے لگے، بہت سی سوچیں بہت سے احساسات اور اس کے بعد سکون اور یہ سکون نیند آنے ہی سے پیدا ہوا تھا۔

نیند بھی کیا پر لطف چیز ہے تمام بچھڑوں تمام دوسوں سے بے نیاز کر دیتی ہے، کوئی غم کوئی پریشانی نہیں رہتی، نچانے لوگ موت سے خوفزدہ کیوں ہوتے ہیں، اس ابدی نیند کے بعد تو یہ خطرہ بھی نہیں رہتا کہ کس طرح ہوگی اور اُنکھ کھل جائے گی۔

مسٹر جوشان نے نچانے رات اس طرح گزاری جبکہ شاہ زیب بڑے مزے سے دن چڑھے تک سوتا رہا تھا، جاگا تو سب سے پہلے مسٹر جوشان کی صورت نظر آئی وہ کچھ پریشان سے بیٹھے ہوئے تھے، شاہ زیب کو دیکھ کر چونکے اور ہراساں کیچے میں پڑے۔

”اب تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔“

”آپ پریشان کیوں ہیں مسٹر جوشان؟“

”اس خطرے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ہو سکتا ہے تمہاری دوست ناکام ہو جائے۔“

”آپ اس لیے پریشان ہیں؟“

”یہ پریشانی کی بات نہیں ہے کیا، بہر حال وہ ایک لڑکی ہے بے شک ذہین ہے لیکن اس کی ذہانت شکست بھی کھا سکتی ہے، ایک ماں اور بیٹی کا معاملہ ہے ہو سکتا ہے وہ حجرے کا ریشمی سونا ناکے سامنے پہنچ کر اپنی اداکاری برقرار نہ رکھ سکے۔ ایسی صورت میں خود ہمارے لیے بھی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔“ مسٹر جوشان نے پریشان لہجے میں کہا۔

”اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال مسٹر جوشان تو پھر آپ کو یہ خطرہ مول نہیں لیتا چاہیے تھا، اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر میری سامھی لڑکی کو مصیبت میں پھنسا دیا۔“

”اور نہیں غلط بھی کا شکار نہ ہوں، بہر حال وہ ایک کوشش تھی اور اس کوشش میں کامیابی ہی ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی دلا سکتی تھی۔“

”تو پھر اس کوشش کی کامیابی یا ناکامی کا انتظار کریں۔“ شاہ زیب نے جوشان کی پریشانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”تم اتنے پریشان نہیں معلوم ہوتے جتنا میں ہوں۔“

”آپ کو اس سلسلے میں الجھنا نہیں چاہیے مسٹر جوشان، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو کام آپ نے ایک غلط انداز میں کرنے کی کوشش کی وہ اپنی نوعیت میں صحیح حیثیت رکھتا ہے۔“

مسٹر جوشان نہ سمجھنے والے انداز میں شاہ زیب کی صورت دیکھنے لگے، پھر انہوں نے آہستہ سے کہا ”میں نہیں سمجھا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”دلچسپ بات یہ ہے مسٹر جوشان کہ آپ نے جس پریشانی کا اظہار کیا وہ بے معنی ہے، چونکہ جس لڑکی کو آپ نے شورا رک کی حیثیت سے سہمی سونا نام تک پہنچایا ہے اصل میں وہی شورا رک ہے۔“

مسٹر جوشان کچھ دیر تک شاہ زیب کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا ”تم کہنا کیا چاہتے ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا؟“

”اگر میں آپ سے کہوں کہ جو لڑکی سونا رک نام سے میرے پاس تھی، وہ اصلی شورا رک تھی اور میرا مشن بھی یہ تھا کہ اصل شورا رک کو اس کی ماں کے پاس پہنچا دوں تو کیا آپ میری بات پر یقین کریں گے؟“

”تم شاید اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو، ایسا لگتا ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا اس پر تم نے خود بھی غور کیا؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، اب اس کے بدلے میں آپ کو اگر میں ایک کہانی سناؤں تو آپ اس وقت بھی یہی سوچیں گے کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہوں۔“

”مجھے کہانیاں سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نچانے کیوں مجھ پر ایک بے چینی سے سوار ہو رہی ہے۔“

”آپ اس بے چینی کو رفع کریں مسٹر جوشان، حقیقت یہی ہے کہ وہ لڑکی شورا رک ہی ہے اور اس کا پس منظر کچھ یوں ہے۔“

شاہ زیب نے شروع سے لے کر آخر تک جوشان کو سونا رک کی کہانی سنانا شروع کر دی، وہ بے زاری کے عالم میں بنائے بیٹھے ہوئے تھے اور صاف لگ رہا تھا جیسے انہیں اس کہانی پر ذرہ برابر یقین نہ آیا ہو شاہ زیب نے انہیں پوری تفصیل سنا دی تو وہ آہستہ سے بولے۔

”ابھی کہانی کھڑی ہے تم نے ویسے تمہارا کیا خیال ہے کیا میں اس پر یقین کر سکتا ہوں۔؟“

”یہ آپ کی مرضی ہے مسٹر جوشان، یقین نہیں کر سکتے تو آپ پریشان ہوتے ہیں، میرے اور کوئی اثر نہیں پڑتا۔“ شاہ زیب نے کسی قدر ناراضگوار سے کہا مسٹر جوشان خاموش ہو گئے تھے اور شاہ زیب کو ان کی اس الجھن پر ہنسی آ رہی تھی۔

پھر اس نے سوچا کہ ذرا باہر کا نظارہ کیا جائے کہ باہر کی کیفیت کیا ہے، ویسے شاہ زیب کا خیال یہ تھا کہ شورا رک کے مل جانے کی خوشی میں قبیلے میں جشن برپا ہو جائے گا اور یقینی طور پر اس سلسلے میں خوب ہنگامے ہوں گے بلاشبہ ایسا نہیں ہو سکتا تھا اور اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی تھی۔

اس وقت بھی قبیلے کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کاروبار زندگی جاری تھے۔ سب سے بڑی پریشانی کھانے پینے کی تھی، اس خانقاہ میں کچھ کھانے پینے کو نہیں ملا تھا اور ابھی تک شورا رک نے بھی کوئی خبر نہیں لی تھی، ویسے اس کی اس کیفیت پر شاہ زیب کو کوفت ضرور ہوتی تھی۔

کم از کم اسے ان لوگوں کی خبر گیری تو کرنی چاہیے تھی، وہ جانتی تھی کہ شاہ زیب اور مسٹر جوشان یہاں موجود ہیں اور اسی کے رحم و کرم پر ہیں، پھر نچانے کیوں شاہ زیب کو بھی مسٹر جوشان کی پریشانی متحسوس ہونے لگی، کچھ عجیب سی بات نہیں تھی، مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے اور کچھ ہنگامہ فیزیکی نہیں ہو رہی، اس کی وجہ کیا ہے۔

شاہ زیب بہت دیر تک اپنی جگہ رک کر اس صورت حال کا جائزہ لیتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر واپس پلٹ پڑا، اب وہ مسٹر جوشان سے گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ کھانے پینے کے لیے کیا کاروائی کرنی چاہیے، ورنہ یہاں تو بوجھ ہی مرجائیں گے۔

شاہ زیب اس جگہ پہنچ گیا جہاں مسٹر جوشان کو چھوڑ کر گیا تھا، لیکن مسٹر جوشان وہاں موجود نہیں تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ بھی نہیں اندرونی حصے میں نہ گئے ہوں اور اسی خیال کے تحت اس نے مسٹر جوشان کو پکارا۔

”مسٹر جوشان، مسٹر جوشان کہاں ہیں آپ؟“، لیکن ان آوازوں کو کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔

”مسٹر جوشان، مسٹر جوشان، ابھی انہوں نے شکار ہو کر یہاں سے کہیں اور دفعتاً شاہ زیب کا دل دھک سے ہو گیا، کیا مسٹر جوشان ابھی انہوں کا شکار ہو کر یہاں سے کہیں اور چلے گئے اگر ایسا ہوا ہے تو بہت برا ہوا، شاہ زیب پوری خانقاہ کا جائزہ لیتا رہا، لیکن مسٹر جوشان کا کہیں پانا نہیں تھا۔

نہ ہونے لگا۔

وہ لوگ خاموشی سے واپس چلے گئے، تب شاہ زیب نے کھانے پینے کی اشیاء کی طرف دیکھا، لیکن یہ سب کچھ شاہ زیب کو اچھا نہیں لگ رہا تھا، اصولاً شاہ زیب کو فوراً ہی وہاں طلب کر لیا جانا چاہیے تھا جہاں شورا ک بوجھتی لیکن اس مسئلے میں اجتناب برتا گیا تھا اور وہ رو بہ نیک لکھا گیا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔

شوراک سے بات کھٹی ہو گئی، لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں تھی، ساری دنیا ہی اپنے مقصد کے لیے جی رہی تھی اس نے اپنی حیثیت حاصل کرنے کے بعد شاہ زیب کو اگر نظر انداز کر دیا تو یہ کوئی ایسی بات تو نہیں تھی جو بہت ہی جرت انگیز ہو، ٹھیک ہے ایسا ہی سہی، اس نے سوچا تھا۔

اس کے بعد چھ دن اس نے اسی خانقاہ میں گزار دی تھی، پھر ساتویں رات اس سارے مرحلے کے لیے فیصلہ کن بن گئی، شاہ زیب کو مٹی سونا کا سانس پیش کیا گیا تھا۔

”مسٹر شاہ زیب، بیرونی دنیا سے آنے والے مردوں کو یہاں آنے کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے اور بہت عرصے کے بعد میں اپنے ہی احکامات سے انحراف کر رہی ہوں، صرف اس بنیاد پر کہ تم نے میری بیٹی کو یہاں ہی پہنچانے کے لیے بڑی محنت کی ہے، لیکن رات کی تاریکیوں میں تمہارا یہاں سے نکل جانا ضرور ہے، ورنہ دان کی روشنی میں اگر قبیلے والے تم تک پہنچ گئے تو تمہارا بچپنا مشکل ہو جائے گا۔ اور اب ایک بات اور سنو اگر تم کسی خزانے کے حصول کی خواہش مند ہو تو اس علاقے میں ایسا کوئی خزانہ نہیں ہے، یہ صرف روایتی باتیں ہیں۔ پان تمہاری خدمات کے اعتراف میں یہ چھوٹا سا نذرانہ دے رہی ہوں جو تمہاری دنیا کے لیے بہت قیمتی ہوگا۔“

شوراک نے اپنے لباس سے ایک بری سی قبیلہ نکالی اور اس کا منہ کھول کر شاہ زیب کے سامنے الٹ دیا، آٹھ قبیلے بھرے تھے اور اس کے ساتھ ہی کچے سونے کے بہت سے ٹکڑے تھے جن کا مجموعی وزن کافی بن جاتا تھا، مٹی سونا نے پر دقار لیے ہیں کہا۔

”تو جو ان میرے تجربات بہت عرصے میں اس لیے تم اب زندگی بھر شوراک سے نہیں مل سکتے، میرے یہ دادی نہیں بتائیں گے کہ تمہارا آگے کا سفر کس انداز میں ہوگا۔“

دنیا کے رنگ و رنگ ہر جگہ نمایاں ہیں چاہے وہ صحرائے اعظم افریقہ کا کوئی حصہ ہو یا پھر نیویارک سٹی، انسانی سوچ بروجہ یکساں ہے، اپنے بارے میں سوچو چلو حالات کے دھارے کبھی پیچھا نہیں چھوڑے اور انسان خود اپنا نہیں رہتا۔ شاہ زیب کی بھی یہی کیفیت تھی، اس کی اپنی جتنی بھی تھی، بس وقت کے دھارے میں بہتا نہیں ہے۔ نکل آیا تھا کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، لیکن کبھی کسی زندگی کا رنڈ بدلنے کے لیے ایک ٹھکانے ہوتا ہے اور وہ رات ایک نئے فیصلے کی حامل تھی، اس نے مہذب افریقہ کے ایک بھوکے کمرے میں دادی اماں کو خواب میں دیکھا خاموش کھڑی تھیں چہرے پر اداوی رقصاں تھیں،

”کیا بات ہے دادی اماں؟“ اس نے پوچھا۔

”واپس آ جا شاہو بس بہت ہو گئی واپس آ جا۔“

اور وہ جاگ گیا، اچانک جیسے ذہن کے بہت سے پردے کھل گئے، ان کے پیچھے باقی جا ہوا تھا، گھر بھائی بھائی اور جان دینے والی دادی اماں، میں ان کے دور کیوں ہوں کیا شش ہے میری زندگی کا، یہ در بدری کیوں بے کیا کرتا ہے مجھے، کیوں کرنا ہے میرا گھر ہے ایک اطمینان بخش زندگی ہے اس گھر کی، پھر سوچو سوال۔۔۔ میں نے ذہنی رو چھٹک گئی، افسوس کچھ گھوم گیا، رنڈ بدل گیا، ذہن خالی کا کردار کی کالک تھا، اس کس کے لیے کیا کیا کرتا رہا تھا، اب اپنے لیے کچھ کرنا تھا اور کامیابی سے کرنا تھا، اب اس کا رنڈ اپنے وطن کی طرف تھا، بہت سی یادیں تھیں اور ان یادوں میں ایک خوبصورت چہرہ بھی تھا۔

البتہ اس تلاش میں شاہ زیب کو ایک ایسی جگہ دریافت ہو گئی جہاں کھانے پینے کی معمولی سی اشیاء اور پانی وغیرہ موجود تھا۔ ابھی کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ تصور بڑا جان لیوا تھا کہ مسٹر جوشان یہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔ کہیں یہ بیوقوف آدمی کوئی فیصلہ نہ کھڑی کر دے، آخر وہ کیا کر لے گا، کہاں جائے گا، بہت دیر تک وہ مسٹر جوشان کو تلاش میں سرگرداں رہا۔

خانقاہ سے باہر آ کر بھی چاروں طرف دیکھا، لیکن مسٹر جوشان یہاں سے فرار ہو گئے تھے، شاہ زیب مجبور ہو کر واپس آ گیا اور اس کے بعد جو کچھ روکھا پکھا وہاں موجود تھا اس سے پیٹ کی آگ بجھائی۔

پہلے مسٹر جوشان پریشان تھے اور شاہ زیب نے غصہ کیا تھا، لیکن اب شاہ زیب کی پریشانیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ دونوں ہی باتیں سوچنے کے قابل تھیں۔

یہ خاموشی کیا معنی رکھتی ہے اور اس کی وجہ کیا ہے، دوسری بات یہ کہ مسٹر جوشان کہاں گم ہو گئے، شام ہو گئی، لیکن دونوں ہی باتوں میں سے کچھ نہ ہوا، نہ ہی مسٹر جوشان واپس آئے اور نہ شوراک کا کوئی ہنگامہ ہوا۔ رات بھی اسی خاموشی سے گزر گئی اور دوسری صبح جب وہ ٹھنڈی زمین پر گہری نیند سو رہا تھا دفعتاً ہی ہنگامے شروع ہو گئے۔

چاروں طرف سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں آ رہی تھیں، کہیں دھول پینا جا رہا تھا اور کہیں نعرے لگائے جا رہے تھے، شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑتا ہوا اس سورج پر آ گیا جہاں سے باہر کا جائزہ لیا جاسکتا تھا اور پھر شاہ زیب نے گہری سانس لی۔

یہ شور وغل خوشیاں منانے ہی کا تھا، لیکن اس کے لیے انہوں نے بڑی تاخیر کی، شاہ زیب یہاں سے ان لوگوں کا جائزہ لیتا رہ، تمام لوگ اصرے اصرے بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور ان کے چہروں سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا، پتا نہیں یہ کتنی طویل خاموشی کی معنی رکھتی تھی، ہو سکتا ہے مٹی سونا ٹھیکوں کے امراء کو طلب کر کے صلاح و مشورے کر رہی ہو، ہو سکتا ہے ابتدا میں کچھ لوگوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہو کہ وہ لڑکی ہی اصل شوراک ہے اور واپس آ گئی ہے اور اس کے بعد جب مٹی سونا نے ان حالات پر قابو پا لیا تو خوشیوں کا اعلان بھی اوقیانیا ہی ہو سکتا ہے۔

شاہ زیب کو اب غصہ آنے لگا تھا، عجیب الحق آدمی تھا، اگر تھوڑا سا انتظار کر لیتا تو کیا حرج تھا، طویل عرصے سے تو وہ انتظار میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے آپ کو ان لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ کر رکھا تھا اس نے، لیکن اب چند گھنٹے صبر نہ کر سکا، بہر حال اس کا مسئلہ تھا اب جو کچھ بھی اس پر ہوتے وہ اس کی اپنی ذمہ داری ہوگی۔

وقت گزرتا رہا، ہنگامے عروج پر تھے پھر شاہ زیب نے لوگوں کو اپنے اپنے مکانات سجاتے ہوئے دیکھا، درختوں کی پیتاں چھالوں میں باندھ کر وہ لگی کوچوں میں لٹکا رہے تھے، یہ یقیناً خوشی کا اظہار تھا، وہ جشن منا رہے تھے، شاہ زیب ان کی یہ خوشیاں دیکھتا رہا اور اب اس بات پر اسے کوئی شبہ نہیں رہا کہ ان سب کو شورا کی آمد کی اطلاع مل گئی ہے لیکن شوراک کی خاموشی تکلیف دہ تھی۔

پھر اس وقت شام کے ساڑھے چار بجے تھے کہ خانقاہ کے سامنے والے حصے کی سیڑھیوں کے اوپر چند افراد آتے نظر آئے، وہ اپنے ہاتھوں میں بہت سی چیزیں اٹھائے ہوئے تھے۔

شاہ زیب نے گہری سانس لی، گویا اب شوراک کو یہ خیال آیا کہ اس کے ساتھی اسی خانقاہ میں ہیں، آنے والوں نے اندر آنے کے بعد وہ اشیاء ایک جگہ رکھ دیں اور پھر اپنی زبان میں شاہ زیب کو آوازیں دینے لگے، شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سامنے جانے یا نہ جانے۔

بہر حال تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے نکل آیا وہ کھانے پینے کی اشیاء کی طرف اشارہ کر کے شاہ زیب سے کچھ کہہ رہے تھے، شاہ زیب نے مسٹر جوشان کی ہدایت کے مطابق خود کو گنگا کنارے پر گئے اشارے

کجری۔۔ جس نے اس سے وعدہ کیا تھا اور جب پرندے دن بھر کے بعد اپنے گھونسلوں کا رخ کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں پیار کے خزانے ہوتے ہیں اور وہ اپنے مسکن کے لیے ہمتے ہیں وہاں ایک چہرہ ہے، دو آنکھیں ہیں جو ملن کی آس میں کھلی ہوئی ہیں۔

کجری اس کے ذہن میں آئی تو اس نے تھوڑا سا رخ بدل لیا کجری کا گاؤں جوں کا توں تھا ماسٹر صاحب نے اسے پہچان کر ہکا بکارہ گئے۔
”تم آگئے۔“

”ہاں یہاں میں ایک قیمتی خزانہ چھوڑ گیا تھا۔“
”کونسا خزانہ؟“
”کجری۔“

”وہ بڑی مسجد کے حجرے میں رہتی ہے اللہ والی بن گئی ہے، ہر مرض کی دوا ہے اس کے پاس اور وہ تمہارے بارے میں بتاتی رہتی ہے۔“

”میرے بارے میں۔“ شاہ زیب حیرت سے بولا۔

”ہاں اس نے بتایا تھا کہ جب کامہینہ ہوگا جب تم آؤ گے اور یہ رجب کامہینہ ہے اور میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

”بس بڑی مسجد کے حجرے میں چلے جاؤ۔“

”آج تو رجب ہے میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ اس نے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور قدرت کی عطاء کا ایک دروازہ کھلا، رب العزت نے اپنے محبوب کے لیے کائنات بنادی تو محبت کو جذب کا مقام کیوں نہ حاصل ہوتا شاہ زیب بڑے بڑے خطرناک حالات سے گزرا، لیکن اس نے اس پر چھائیں پر کبھی غور بھی نہ کیا ہوگا جو کجری کے سچے پیار کا محافظ سایہ تھا اور جس نے اس کے خلاف ہر دشمن کو ناکام کیا۔

”میں جانتی تھی کہ تم آ جاؤ گے۔“

”تیار ہو جاؤ، ہمیں گھر چلنا ہے۔“ شاہ زیب نے کہا۔

یہ دن اس گھر کی عید تھا جب شاہ زیب اور کجری وہاں داخل ہوئے تھے۔

دادی اماں نے اسے گلے لگا کر کہا ”دعا مانگی تھی میں نے تیرے لیے اور میرے دل نے مجھے تسلی دے کر بتایا تھا کہ میری دعا بارگاہ ایزدی میں قبول ہوگئی۔“

اللہ نے ایک کائنات اپنے محبوب کے لیے بنائی اور دوسری کائنات اپنے بندوں کے دل میں آباد کی جس میں وہ خود رہتا ہے، میں نے اس سے تیری سلامتی مانگی اور میرے دل میں بیٹھے خدا نے مجھے سکون دے کر بتایا کہ اس نے میری دعا قبول کر لی ہے۔

”مجھے کینہ نہیں ہے دادی اماں۔“

”ہو بھی نہیں سکتا تھا۔“

”مگر ایک مشکل ہے۔“

”کیا؟“

”مجھے میرے چچہ ہم شکل مل گئے، ساتواں نہیں ملا۔“

دادی اماں پوری کہانی سن کر خوب ہنسیں اور بولیں ”بیوقوف ساتواں ہم شکل تو خود ہے“

”ایں۔“ شاہ زیب حیران رہ گیا۔

(ختم شد)

جس میں مرد ہی نہیں خواتین کی مردوں کے اس سامنے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھی لکھی ہیں

پگ پھل

زہت جیں ضیاء

اُس مرد کا قصہ، عبرت، جو بیٹوں کو مستقبل کی پونجی سمجھتا تھا



خالدہ خاتون بھی بڑی سمجھدار اور خاصی تیز قسم کی عورت تھیں۔ انھوں نے بہتر طریقے سے گھر کا نظام سنبھال لیا۔

صائمہ نے انہیں پاس کیا اور خمینہ نے میز پر کرایا تو صائمہ کے لیے رشتہ آ گیا۔ خالدہ خاتون نے مناسب دیکھ کر کچھ کے بعد رشتہ طے کر دیا۔ خمینہ بھی اچھی صورت اور اچھی سیرت کی لڑکی تھی اس کے لیے بھی اس کی دوست نے اپنے بھائی کا رشتہ دے دیا۔ لڑکا سعودی عرب میں جا کر رہتا تھا۔ لڑکا اچھا تھا خاندان بھی بڑا نہ تھا اس لیے خالدہ خاتون نے اس کا رشتہ بھی طے کر دیا۔ اور اس کی شادی کر دی خمینہ سعودی عرب چلی گئی۔ عظیم نے اپنے دوست کے توسط سے کسی کمپنی میں جا کر کر لی کیوں کہ دونوں بیٹیوں کی شادی کے بعد پیچھے کچھ نہ بچا تھا۔

دن ماہ وصال میں بدلتے چلے گئے۔ اس عرصے میں صائمہ کے چار بچے ہو گئے۔ اس کے شوہر نے اپنا بزنس کر لیا۔

عظیم کی شادی صاعقہ بیگم سے ہوئی۔ صاعقہ بیگم کی ایک بیٹی ہوئی۔ عزیز کی شادی سمیرا سے ان سے خالص اپنی پسند سے اپنی پرانی سہیلی کی بیٹی سے کر دی اور امان

اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مارے خوشی کے سارے ہاسپٹل کو سر پر اٹھائیں۔ بات بھی بیکہ ایسی تھی ان کی پھلتی ہوئے اس بار بھی بیٹا پیدا کر کے بیٹ ٹرک مکمل کر دی تھی۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی بڑی بہو صاعقہ اور چھوٹی بہو ترین دونوں کے یہاں بیٹیاں ہی تھیں بڑی بہو کی دو اور چھوٹی بہو کی ایک بیٹی تھی۔ جبکہ پھلتی ہوئے اور کبھی بارجی بقول اماں کے شیر کے جیسا صحت مند بیٹا پیدا ہوا تھا۔ صاعقہ اور ترین کے ساتھ تو دونوں کے شوہر عظیم اور عزیز بھی خوش تھے جبکہ عزیز میاں کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

اماں جوانی میں بیوہ ہو چکی تھیں۔ شوہر کا انتقال ہوا تو بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ میاں سرکاری آفس میں معقول ملازمت کرتے تھے اس لیے انھیں اچھا خاصا پیسہ ملا تھا۔ سب سے بڑی بیٹی صائمہ جو اس وقت میز پر سے فارغ ہو کر کالج جانے والی تھیں۔ خدانے اسے بہت عقل اور سمجھ دی تھی اس نے اپنے ابا کے دوستوں کے ساتھ مل کر ملنے والے میسے کو فیکس ڈیزائن کر دوا دیا۔ گھر آتا تھا اس لیے کرائے کی فکر بھی نہیں تھی۔ صائمہ کے بعد خمینہ بھی پھر عظیم، عزیز اور سب سے چھوٹا عزیز جو اس وقت صرف چار سال کا تھا۔

ہوئی۔ جبکہ میرا کوہنہ اور تین کو بھی بیٹی ہی ہوئی۔
اماں جو پہلے ہی میرا کوہنہ سے جانتی تھیں۔ بیٹے
کی پیدائش کے بعد تو اور زیادہ جانتے لگیں۔ یہ بات
عظیم اور عذیر کو بھی محسوس ہوئی لیکن وہ چپ رہے۔
جبکہ صاعقہ اور تین کو اماں کی دو نظری بری طرح کھتی۔
ایک بار پھر صاعقہ امید سے ہوئی تو اماں نے نمازیں
طویل کر لیں۔ دعاؤں میں بیٹے کو مانگنا شروع کر دیا۔
لیکن اس بار بھی صاعقہ نے بیٹی پیدا کی اور اماں نے
ناک چڑھا لی۔ کیوں کہ دو ماہ بعد ہی میرا نے اماں کے
ہاتھوں میں دوسرا بچہ لکھتا اور صحت مند پوتا ڈال دیا تھا۔
اب تو اماں نے میرا کے ساتھ اور زیادہ نفیسی کرنا شروع
کر دیا۔ میرا کے لیے گھر کے کاموں میں خاص
رعایت ہوتی۔ مہمان آج آتے تو میرا اپنے بچوں میں
مصرف ہو کر کمرے سے باہر نہ نکلتیں۔ صاعقہ اور تین
سارے کام چننا تھیں۔ ساتھ ساتھ میرا انکے گھر سے بھی
اٹھائیں۔ اس کے بچوں کو بھی سننا نہیں۔ ان دونوں کی
بیٹیاں نہ زیادہ تنگ کرتیں نہ دوستیں جبکہ میرا کے دونوں
بیٹے حدود درجہ کرتے۔ اماں کی راتوں کی نیندیں حرام
ہو جاتیں۔ صدمے دیے جاتے، خیرات دی جاتی،
نظریں اتاری جاتیں اور صاعقہ اور تین منہ پھڑاڑے
دیکھتی رہ جاتیں۔

کیا یہ ان کی پوچھتا نہیں ہیں؟ ایک دوسرے سے
سوال کر کے خاموش ہو جاتیں کیوں کہ اماں کے سامنے
کسی کو بولنے کی اجازت نہ تھی۔ اور پھر جب صاعقہ کو
میرا بیٹی ہوئی تو اس سے پہلے ہی میرا کو تیسرا بیٹا بھی
ہو چکا تھا۔ اماں کی دعا میں تو کائنات سے ہٹ کر بی بی
دے رہی تھیں۔

”ہائے میرا بچہ جتنا کہ ایک تو ہے جو اپنے باپ کی
نسل کو آگے بڑھا رہا ہے۔ جگ جگ جیے۔“ انھوں نے
عزیز کو سینے سے لگا کر جذبات سے چور لکھے ہیں کہا اور
صاعقہ اور تین کے ساتھ ساتھ عظیم اور عذیر کو بھی یہ بات
اچھی نہیں لگی۔

☆☆☆

دن گزرے رہے اماں کی دو نظری اس طرح تھی۔
صاعقہ کو چار بیٹیاں ہو گئیں جبکہ تین کو دو بیٹیوں کے بعد

ایک بیٹا بھی ہو گیا۔ لیکن اماں کی محبت صرف ان تین
بیٹیوں اشعر، انظر اور منظر کے لیے وقت ہو چکی تھیں۔ وہ
بچوں کو چھپا چھپا کر چیزیں کھلائیں۔ صاعقہ کی چاروں
بیٹیوں اور تین کے بیٹیوں بچہ حیرت سے اپنی دادی کو
دیکھتے بھی کھجور کھاتے کچھ کوئی ایسا سوال کرتے کہ اماں
لا جواب ہو جاتیں اور صاعقہ اور تین بچوں کو ڈانٹ کر
چپ کر دیتیں۔

دن مہینوں کو سالوں میں بدلتے چلے گئے اور ان
سالوں میں عزیز میاں کے چار بیٹے ہو گئے۔ عظیم
کی چار بیٹیاں اور عذیر کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا
ہو گئے۔ تینوں بھائیوں کی تعلیم کوئی بہت زیادہ نہ تھی۔
اس لیے نوکریاں بھی اعلیٰ درجے کی نہیں تھیں۔ بچے
بڑے ہوئے لگے تو اماں کو فکر ہوئی تو عزیز کے بیٹیوں کی
کڑوا کر لڑکے ہیں اچھا پڑھ لکھ لیس کے تو آگے کے
لیے بہتری ہوگی۔ عزیز کی اتنی آمدنی نہ تھی کہ بچوں کو
اچھا پڑھا سکے اور خواب تو دونوں میاں بیوی نے بیٹیوں
کے حوالے سے بے تحاشا دیکھ کر تھے۔ ان لوگوں کو
اپنے بیٹیوں پر بہت دغم تھا۔ انھیں بیٹیوں کے دکھ اور
مسائل سے کسی سروکار تھا نہ دل چسپی انھیں تو بس یہ
غور تھا کہ میرے چار چار بیٹے ہیں۔ تب اماں نے
اپنے رشتے داروں میں جو پھر لوگ تھے چچا چچان
سے عزیز کے بیٹیوں کی پڑھائی کے لئے خاموشی سے
پیسے اکٹھے کرنے شروع کیے۔ ادھر ادھر بھائیوں سے
مارنے لگیں اور ساتھ ساتھ عزیز نے بھی لوگوں سے
بیٹیوں کے حوالے سے امداد لینا شروع کر دی۔ جبکہ عظیم
اور عذیر اپنے بچوں کو پڑھا بھی رہے تھے وہ بچے اپنے
باپوں کی آمدنیوں سے خوش اور مطمئن تھے۔ ان لوگوں
کو خوب سے خوب تر کی خواہش نہیں تھی۔ حالانکہ عذیر کا
ایک ہی بیٹا تھا گھر بھی عذیر یا تین نے بنے بنے کے
حوالے سے کوئی بڑی بات نہ کی تھی۔ وہ لوگ شکر ادا
کرتے کہ اللہ پاک نے ایک ہی سہمی بیٹا تو دیا ہے۔
عاشق بھی سمجھا اور اور اچھا بیٹا تھا۔ آخر کار اماں کی دعا میں
بھاگ دوڑ کام آئی اور اماں کی سیکے کی رشید دار خاتون
نے جو مالی لحاظ سے بہت مستحکم تھیں۔ ان کے شوہر
برنس مین تھے۔ انھوں نے عزیز کے چاروں بیٹیوں کی

پڑھائی کی ذمہ داری اپنے ذمے لے لی اور عذیر کے
بچے اشعر، انظر اور منظر کی پڑھائی کی ذمہ داری کی طرف
سے عزیز اور میرا زیادہ اماں مطمئن ہو گئی تھیں۔ بچہ
پڑھائی میں کچھ خاص اچھے نہ تھے۔ مگر پرائیویٹ
پڑھائی کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ عزیز کی بھانج
اور تنگ دو بی بی چل رہی تھی۔ جس سے پڑھائی کے
ساتھ ساتھ ان لوگوں کی اچھی جگہ نوکریوں کی فکر بھی
شامل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اشعر اور انظر نے اپنا ایم لی اے مکمل کر لیا تو ان
لوگوں نے سعودی عرب جانے کی کوششیں شروع
کر دیں۔ عزیز میاں اور میرا تو شروع سے ہی اس دن
کے انتظار میں تھے۔ ان لوگوں نے بیٹیوں کے حوالے
سے یہی خواب دیکھ رکھا تھا کہ کسی طرح ان کے بیٹے
باہر سٹیل ہو جائیں۔ عزیز میاں نے سرسیر کی بازی
لگادی۔ جو جہاں سے بھی باہر جانے کا ذرا سام بھی
اشارہ کرتا عزیز میاں اور میرا ان کے آگے پیچھے
گھومتے رہتے اور اس وقت عزیز میاں کو یہ بھی
احساس نہ ہوتا کہ سامنے والا بڑا ہے یا چھوٹا وہ چھوٹے
کے لیے بھی اٹھ کر اس کو اپنی جگہ پر بٹھا دیتے۔ اس
روز ان لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اشعر اور
انظر سعودی عرب چلے گئے۔ اماں اپنے لاڈلے
پوتوں کی دوری کے خیال سے جتنی آرزو تھیں اس سے
زیادہ اپنے چھوٹے بیٹے اور بھوئی اچھی اور بہترین زندگی
کا سوچ کر خوش بھی تھیں۔ اشعر اور انظر سعودی چلے
گئے۔ ادھر عظیم اور عذیر کی بیٹیاں اور بیٹا عاشق
پڑھائی سے فارغ ہو کر عذیر کے چھوٹے سے برنس
میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ایک سال بعد اشعر تو ملے
آ گیا لیکن انظر نے اس سال اس کے لیے لڑکی دیکھ رکھی تھی
تھا۔ عذیر اور میرا نے اس کے لیے لڑکی دیکھ رکھی تھی
اور شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ اشعر آیا تو خوب دھام
سے اس کی شادی کر دی گئی۔

اشعر کی بیوی سائرہ اچھی لڑکی تھی۔ اشعر شادی
کے دس دن بعد واپس چلا گیا۔ اگلے سال انظر کے
آنے کا پروگرام تھا۔ تب اس کی شادی کا فیصلہ کیا گیا

تھا۔ ادھر عذیر کی دوسری بیٹی کی بھی شادی ہو گئی اور وہ
بیاہ کر سسرال چلی گئی اور کچھ دن بعد شوہر کے ساتھ
امریکہ شفٹ ہو گئی۔ اماں کا انتقال ہو گیا اور ساتھ ہی
عزیز اور میرا نے یہ گھر چھوڑ کر پوش علاقے میں گھر
لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب تو ان کے مسائل ہی بدل گئے
تھے۔ کیونکہ منظر اور منظر نے بھی یہیں جاب کر لی تھی پھر
وہ لوگ دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئے۔

اگلے سال انظر شادی کے لیے آیا تو ساتھ اشعر بھی
آیا کیونکہ اسے سائرہ کو اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ انظر
کا پہلے سے ہی پروگرام تھا کہ شادی کے بعد جاتے جاتے
اپنی بیوی ریشم کو بھی ساتھ گھر لے جائے گا۔

عرس تک گھر میں خوب شور بنگاہ اور شادی کی
مصرف و نیت رہی پھر مہینہ بعد ہی انظر ریشم اور سائرہ گھر کو
دوران کر کے چلے گئے۔

عزیز اور میرا گھر کاٹنے کو دوڑتا۔ پیسے کی کمی نہ
تھی۔ گھر میں نوکری بھی تھے مگر تنہا ہی تھے منظر اور منظر اپنی
جاب پر ہوتے یا دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور
مصرف و نیت ہوتی۔

☆☆☆

اشعر کا بیٹا ہوا تھا۔ اس نے فون کر کے بتایا تو میرا
کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے خود غواہش بھی پوتا
پوٹی کی اور آج جب وہ دادی ہی تو بچے پاں نہ تھے۔
ان لوگوں نے سوچا کہ منظر کی شادی کر دی اور پھر منظر
کے لیے لڑکی دیکھ کر اس کی شادی کر دی تھی۔ تو میرا
فہمی سے ہی اور اراکونی تھی۔ منظر کی شادی کے بعد گھر
کچھ چھل پھل ہوئی۔ اس عرس میں اشعر کے ہاں بیٹی
اور انظر کے ہاں جڑواں بیٹے بھی ہو گئے۔ تصویریں
دیکھ کر میرا بہت روئی دل تڑپ رہا تھا کہ اپنی بانہوں میں
ان ننھے منوں کو بھی لیں لیکن وہ کسوں دور تھے۔ کتنی بار
ان لوگوں نے آنے کے لیے کہا لیکن ہر بار انظر اور اشعر
نے صاف کہا کہ بار بار آنا آسان نہیں۔ اب اخراجات
بڑھ گئے ہیں اور آپ لوگوں کو بھی تو ٹھٹھ سے زندگی
گزارنے کی عادت ہوئی ہے۔ اس لیے ہمیں زیادہ کام
کرنا پڑ رہا ہے۔ میرا اور عزیز آج تک صاف کر کے
خاموش ہو جاتے۔ تو یہی کہ والدہ کی طبیعت خراب ہوئی

ان کو ہسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا تو اس کے ابو گھر میں اکیلے ہو گئے۔ ہسپتال میں والدہ کے ساتھ ان کی بہن رہتی تھیں۔ اس روز منظر آفس سے آیا تو اس نے کمرے میں جا کر بیگ میں کچھ سامان رکھنے لگا۔ حیرانگی سے ہی پتہ چل گیا۔ پوچھ پر منتظر نے کہا کہ تو یہ کچھ عرصہ اپنے مکے میں رہے گی۔ کیوں کہ اس کی اماں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ اچھا! حیرانہ دھجے سے کہا اور یہ کچھ عرصہ دو ماہ پر محیط ہو گیا۔ حیرانگی جب پولیس کے اسے لے آؤ منظر ٹال جاتا اور پھر ایک روز منتظر نے دھماکہ کر دیا کہ تو یہ کہ پاپا کی طبیعت بھی شیک نہیں رہتی۔ اس لیے وہ اپنا سارا کاروبار میرے حوالے کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے مجھے ان کے یہاں شغف ہونا پڑے گا۔ ہائیں! عزیز نے جرت سے اسے دیکھا۔

”ہم لوگ یہاں پر اکیلا۔۔۔“ اکیلے کہاں ابا۔۔۔؟ آپ کے ساتھ فخر ہے ناں۔ اس صاف رویہ میں آپ لوگوں کا دل بھی لگ جائے گا ویسے بھی کچھ دنوں بعد اشعر بھائی اور افظر بھائی بھی آنے والے ہیں بچوں کے ساتھ آپ لوگ مصروف ہو جائیں گے۔ منتظر نے ساٹ لیجھ میں کہا۔ ”مگر وہاں تو یہ کہ پاپا کو تو کوئی اور ہے بھی نہیں سوائے ہمارے۔ اس لیے ان لوگوں کو ہماری زیادہ ضرورت ہے۔“ لگا سا جواب دے کر منتظر سامان سینٹ لگا اور عزیز کے ساتھ ساتھ حیرانہ تم آکھوں سے اپنے پیارے بیٹے کو دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

اشعر اور افظر آگئے۔ ان کے بچوں کو سینے سے لگا کر حیرانہ دھجے سے روٹی رہیں۔ کب سے تڑپ رہی تھیں۔ اپنے پیاروں کے بچوں کو سینے سے لگانے کے لیے ساتھ ہی فخر نے اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکی عیمہ کے بارے میں اماں کو بتایا کہ آپ لوگوں کو وہاں میرا رشتہ لے کر جانا ہے اور میرا سچا بھائی ہے۔ عیمہ خاصی ماڈرن اور امیر منلی ہے۔ اس کے بے ہودہ لباس اور باتوں کو سن کر حیرانگی کو وہ ایک آنکھ نہ بھائی۔ مگر بیٹے کی خواہش اور پسند زیادہ مقدم تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا جو ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ بگڑ پیدا کر کے اس

سے بھی دور ہونا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے فخر کی شادی کی تیارابی بھی شروع ہو گئیں۔ اور چونکہ اسے آخری لازمی ہو عیمہ بھی گھر آگئی۔ اشعر اور افظر فیلیو سیت واپس چلے گئے تھے۔

عیمہ تیز طرار، اور کسی حد تک بدتیز لڑکی تھی۔ اسے ساس سسر سے کوئی لگاؤ تھا نہ دل چسپی اسے تو صرف فخر سے غرض تھی۔ جس کو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ وہ صبح تیار ہو کر فخر کے ساتھ آفس چلی جاتی۔ پیچھے سارا دن بھائیں بھائیں کرتے گھر میں کھانا ہوا عزیز اور حیرانہ انوکھوں کے دم کو کم پر رہ جاتے۔ آفس سے اگر کبھی فخر اور عیمہ بھی ڈنر پر کوئی پارٹی میں چلے جاتے۔ دونوں عیماں بیوی تیار ہوجاتے۔ کچھ دن تو حیرانہ برداشت کیا اور پھر ایک دن فخر سے کہہ دیا کہ بیٹا ہمیں کون سا پیسوں کی ضرورت ہے۔ عیمہ سے کہو تو کئی چھوڑ کر گھر میں رہے۔ ذرا گھر میں روٹی ہو جائے گی۔

اماں نے کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ عیمہ کوئی جاہل لڑکی نہیں ہے۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ بہترین جاب کرتی ہے۔ وہ گھر میں رہنے یا آپ لوگوں کو کچھ دینے کے لیے نہیں آئی۔ ہم دونوں نے مل کر اپنے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لیے آپ لوگ اگر اکیلا پن محسوس کرتے ہیں تو اشعر بھائی یا افظر بھائی کے پاس چلے جائیں۔ حیرانہ اپنا منہ لے کر رہ گئیں۔ اب دونوں کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ اچھے اچھے ڈاکٹر ز کو دکھاتے کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ لیکن تنہائی سب سے بڑی بیماری تھی۔ جو کھن کی طرح انھیں کھانے چلی جا رہی تھی۔ عزیز کو ان تمام تر مراعات کے باوجود نی بی ہو گیا تھا۔ حیرانہ بی بی اور شوگر کی ریاضت تھیں۔

اب عیمہ امید سے ہوئی تو دونوں بہت خوش ہوئے گھر میں بچے کی آمد متوقع تھی۔ اور بھیر اللہ کر کے دن پورے ہوئے اور عیمہ نے پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ فخر کے ساتھ ساتھ عزیز اور حیرانہ بھی خوشی سے پھولے لپٹیں مارے تھے۔ صدقے خیرات دیے اور مٹھائی بھی تقسیم کی۔ عیمہ گھر آگئی۔ حیرانہ عیمہ کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ بچے کو سنبھالیں، ماشاں کرتیں لیکن عیمہ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ خاص طور پر

جب کھانے کھانے عزیز بچے کے قریب آتا تو اس سے برداشت نہ ہوتا۔ اور پھر کچھ دن بعد ہی فخر نے بھی اپنا زہن پورا کر دیا۔

”ابا پیٹر آپ نے کو پیار مت کیا کریں۔“ ہائیں کیا ہو گیا۔۔۔؟ عزیز نے جھکے سے سر اٹھا کر حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”جی آپ کو خود احساس ہونا چاہیے تھا کہ آپ کو موزی مرض ہے اور سنا بھی کتنا چھوٹا اور نازک ہے خدائے عز و جل جانتے تو۔۔۔ اور اماں آپ۔۔۔ ابھی ابھی ابھی نہیں کتنے مجھے معلوم ہی کہ ساتھ رہیں گے تو آپ لوگوں سے برداشت ہو گئیں اور آپ لوگ لازمی بنے کو پیار کریں گے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگوں کو ایڈمیٹیشن شیفٹ کروادیں۔ میں ملنے آتا ہوں گا کیوں کہ خود پرنو انسان برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن۔۔۔ اولاد کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ دوسرے تو آپ لوگوں کو اوپر کے پوشن میں بھی شغف کر سکتا ہوں مگر آپ لوگ پھر وہی تنہائی کا دونا روئیں گے اس لیے وہاں جانے سے آپ لوگوں کو۔ تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ بہت سارے لوگ آپ لوگوں کے ساتھ ہوں گے اور آپ لوگوں کا نام بھی پاس ہو جائے گا۔ ہائیں۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو فخر؟ ہمارا اپنا گھر ہے چار چار بیٹے ہیں اور ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ خیرانی ادارے میں چاہیں؟“

عزیز جو خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے تڑپ کر سوال کیا۔ سچ کہہ رہے ہو تم۔ اولاد کے لیے رسک نہیں لے سکے۔ ہم نے بھی تو لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا۔ اپنی عزت میں بی بی ملا کر تمہارے بہتر مستقبل کے لیے لوگوں سے امداد لی تمہارے بہتر کیریئر کے لیے کہاں کہاں نہ بھاگ دوڑی۔ اور آج۔۔۔ تم بھی۔۔۔ ”ہائیں ابا۔۔۔ آپ لوگوں نے بھی اولاد کے لیے کیا اور ہم بھی اولاد کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ اب تو وہ زمانہ نہیں رہا۔ اب ضرورتیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ اگر اشعر بھائی، افظر بھائی اور منتظر بھائی بھی اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے دور ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ اس لیے

آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اور اصل بات یہ ہے کہ عیمہ نہیں چاہتی کہ دو بیمار لوگوں کے ساتھ وہ اپنے بچے کی پرورش کرے اس لیے آپ لوگ تیار کریں۔ میں نے وہاں جا کر بات کر لی ہے۔ میں ملنے آتا رہوں گا آپ لوگوں سے۔“ فخر نے فحشی فیصلہ سمجھا۔ حیرانہ تو سن گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیے اور کیا ہو رہا ہے؟ فخر کرنے سے جا چکا تھا دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے روتے تھے۔ بچیں اولاد کی خاطر دونوں نے خاندان سے کٹ کر گھر اور فخر کے ساتھ زندگی گزار دی تھی۔ اپنے بھائیوں کے سامنے خود کو ہمیشہ اٹلی سمجھا۔ امارت اور بیٹوں کے ذمہ میں زندگی گزار دی۔ ایک ایک کر کے چاروں بیٹوں نے کی طرح ان دونوں کو ہتھکڑیاں لگا دی تھیں۔ نہ جانے کتنا وقت ہو گیا تھا۔ دونوں یوں ہی کم کم بیٹھے تھے۔ تب ہی کمرے کی لائٹ بجلی اور دونوں خیالات سے چونکے۔ سامنے ظلم، ہمدرد اور عاشق کھڑے تھے۔

”اشعر عزیز ہم لوگ تمہیں لینے آئے ہیں۔“ عظیم اور عذر نے آگے بڑھ کر عزیز کو کاندھوں سے تھما اور عظیم نے کہا۔ عزیز نے تڑپ کر گھبراہٹا۔ ”بھائی۔۔۔“ وہ آٹھ عظیم سے پلٹ کر رو پڑا۔ ”بس کریں عزیز بھائی ابھی آپ کے بھائیوں کا گھر آپ کے لیے کھلا ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ لوگ کسی خیراتی ادارے میں نہیں جاسکتے۔ عذر اور پھر عاشق نے آگے بڑھ کر عزیز کو مخاطب کیا عزیز بھائی ہمدرد تھا۔ مگر کبھی کیسا لگتا تھا۔ جن بیٹوں کے ذمہ میں اس نے بھائیوں، بھابھوں اور ان کے بچوں کو کھیر جانا تھا آج ان لوگوں نے ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا سب کو اپنی اپنی فیملیاں اور مستقبل عزیز تھے۔ سچ ہے اولاد پیدا کرنا آسان ہے مگر ان کی تربیت کرنا بہت مشکل ہے۔ جو سوچ اور ذہنیت عزیز کی تھی وہی اس کے بیٹوں میں منتقل ہو گئی تھی۔ کچھ پر ابغری عزیز اور حیرانہ عاشق کی کسی گاڑی میں اس گھر کی جانب جارہے تھے جسے وہ چھوڑا، چارنا اور قدیم کہہ کر کب کا چھوڑ چکے تھے۔

☆☆☆

بابل

منزل خان

ان مردوں کے لیے آخری خبر، جو جی کو حجت تصور کرتے ہیں



”رخسانہ کہاں رہ گئی ہو۔ بے گنجی آؤ میرے پاس بیٹے حارث کو۔ اس کو آج میں نے اسکول میں داخل کر دانا ہے۔“ عمران نے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

”حارث اسکول نہیں جانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جاؤں گا تو جیل کے ساتھ جاؤں گا ورنہ اسکول نہیں جاؤں گا۔“ رخسانہ نے کمرے سے نکلے ہوئے پریشانی کے عالم میں کہا تھا۔

”چلو آؤ میرے بیٹے۔“ عمران نے حارث سے کہا۔ ”نہیں ابو میں تو جیل کے ساتھ ہی جاؤں گا، ورنہ نہیں جاؤں گا۔“ حارث اپنی توتلی زبان میں بولا تھا۔ ”اچھا لے آؤ جیل کو۔“ عمران اپنے تین سالہ بیٹے سے نکلے کھاتے ہوئے ایس کچے میں بولا تھا۔

☆☆☆

”جیل کیا تم نے اپنے بھائی کو کام کر کے دیا ہے۔“ کاہن نے جیل کو کھڑا کر کے پوچھا تھا۔

”میں ورنہ نہ میری شکایت ایلو گارڈے گا اس لیے میں اس کو بھی کام کر کے دے دیتی ہوں۔“

”تم لوگ کتنے بہن بھائی ہو اور تمہارے ابو تمہیں کیوں ڈالتا ہے۔“

”میں ہم پانچ بھائی ہیں اور ایک بھائی ہے۔ میرے ابو صرف بھائی سے پیار کرتے ہیں۔ اگر بھائی روئے گا تو ابو میں ماریں گے۔“ ہیلے نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا تھا۔

”تمہاری اور بہنیں بھی کیا اس اسکول میں پڑھتی ہیں۔“

”نہیں۔“ ہیلے نے دوبارہ جیل سے پوچھا تھا۔

”کیا؟“ ہیلے نے تو تم نے خدک کے اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا کیا؟“

”نہیں کس! ابو نے ہماری سچی کوئی فرمائش پوری نہیں کی ہے۔ وہ ہم بھائیوں کا اپنے سامنے آنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہ تو ہم دونوں بہن بھائی جڑواں ہیں۔ ایک ساتھ کھیلے، کھاتے اور جیتے ہیں۔ بھائی میرے بغیر اسکول نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً ابو نے مجھے بھی اس

”میں نے جب کہہ دیا تھا کہ گھر آنے پر ان میں سے کوئی میرے سامنے نہ آیا کرے تو پھر کیوں انہیں میرے آفس سے واپس آنے کا نام نہیں معلوم ہے۔“ عمران گھر میں داخل ہوتے ہی چلا یا تھا۔ ”آپ کو ان مخصوصوں نے کیا کہہ دیا ہے جو آپ ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر ہی پڑ گئے ہیں۔“ رخسانہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

”میں میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ میرا بس نہیں چلتا کہ میں ان کا گانا یادوں۔“ عمران نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”بھائیوں کو خدا کی رحمت ہوئی اور نبی کا ارشاد ہے کہ جس نے دو بیٹیوں کی پرورش اچھے طریقے سے کی، وہ جنت میں میرے ساتھ ایسے ہوگا جیسے شہادت اور درمیان والی انگلی۔“ رخسانہ ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”شک ہے دو بیٹیوں کی پرورش میں کر لیتا ہوں، باقیوں کو تم اپنے منہ سے بھجوا دو۔ آخر ان کو بھی جنت میں جانا چاہیے۔“ عمران طنز پر لہجے میں بولا تھا۔ ”ان کو سمجھانا تو ہمیشہ کے آگے بین بجانے جیسا ہے۔“ رخسانہ نے دل میں سوچا اور کمرے سے باہر جانے لگی تھی کہ عمران کی آواز پرک گئی۔ ”سنو میرے اٹکو سے چشم و چراغ کو میرے پاس بھیج

کے ساتھ داخل کر دیا تھا۔ اور ساتھ میں حتیٰ سے تاکید کی تھی کہ بھائی کو کوئی تکلیف نہ ہو پائے۔“ ہیلے نے روٹھ کر صورت بناتے ہوئے کہا تھا۔ ”ارے مجھے تم نے اتنی سی عمر میں اتنی بڑی باتیں کہاں سے سیکھی ہیں۔“ ہیلے نے پیار سے پوچھا تھا۔

☆☆☆

”حارث میرے بال چھوڑ دو۔“ ہیلے چلائی تھی۔

”نہیں۔ مس! میں جارت ہوم ورک کر کے دیتی ہوں۔“ جارت نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا تھا۔
 ”تو کیا جھوٹ بولا تھا۔ ابھی تو میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس بارڈیٹ پیپر بھی میں نے ہی تمہیں کر کے دیا تھا۔“ جیلہ اپنے بالوں کو جارت کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔
 ”اچھا۔ بات ہے تو تم کھر چلو ذرا ابو کو تمہاری شکایت نہ لگائی تو پھر بولنا۔“ جارت نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔

”وعدہ کرتی ہوں تمہارا سارا ہوم ورک میں کروں گی اور ٹیچر کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ جیلہ نے منت کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”میں اب صرف اس سے کام نہیں چلے گا اگلے مہینے جو ہمارے پیپر ہوں گے وہ بھی تم ہی کر دو گی اور اسے میں انگل فراز کے کتنے سے امر دہی توڑ کے دوں گی۔ ورنہ میں ابو سے تمہیں ڈانٹ چلاؤں گا۔“ جارت بولا تھا۔

☆☆☆
 ”کیا ہوائی فون کیوں نہیں رکھ رہی ہو۔ سب خیریت تو ہے ناں!“ فیضان کے اچانک مخاطب کرنے پر میں یوں چونکی جیسے کوئی مجھے ناشی کے پتھروں سے کھول لایا ہو۔ میں نے فیضان کی طرف جھپٹتے ہوئے دیکھا اور کہا تھا۔

”ابو کا فون تھا بیٹی کی پیدائش کا سن کر کہہ رہے تھے اس کا گادادو۔“
 ”سنان! گھر کی بیٹی نہیں ہے جو گادادو۔ یہ تو میرے آنگن کا پھول ہے جس نے بہار بن کر آتے ہی میرے بچر اور بیابان آنگن کو خوشیوں سے بھر دیا ہے۔

میری بیٹی میرے گھر کی رونق ہے اور دلے بھی بیٹا ہو یا بیٹی دونوں خدا کی رحمت ہیں۔ بیٹیوں کی قدر ان سے پوچھو جن کی جھولیوں انہیں تک خالی ہے۔“ فیضان نے پڑ سکون سمجھے میں جواب دیا تھا۔
 ”میرا مطلب ہے کہ آپ خفا تو نہیں ہیں کہ میں نے ایک بیٹی کو جنم دیا ہے۔“ میں نے ہنسنے لگی آنکھوں سے پوچھا تھا۔

”جیلہ! یہ تم سے کس نے کہہ دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ خدا نے تمہیں پہلی بیٹی سے نوازا ہے۔ میں تمہارے والد کی طرح بیٹیوں کا دشمن نہیں ہوں۔“ فیضان نے پیار سے میرے آنسو پوچھتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے فیضان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے میری بیٹی کو نہایت ہی شفیق اور محبت کرنے والے باپ سے نوازا ہے۔

☆☆☆
 ”یہ کیسے سنایا اپنے بیٹے کو۔ باغ سے پھول توڑتے ہوئے کچا ہے اس میں نے۔“ مائی فخریہ لہجے میں بولا تھا۔
 ”تم دونوں اندر چلو۔ میں آپ سے بہت معذرت چاہتا ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔“ عمران نے بات کو رفع دفع کرتے ہوئے کہا تھا۔
 ”جیلہ! کیا تم اپنے بھائی کو پھول توڑنے سے منع نہیں

تیسری مرد کہانی

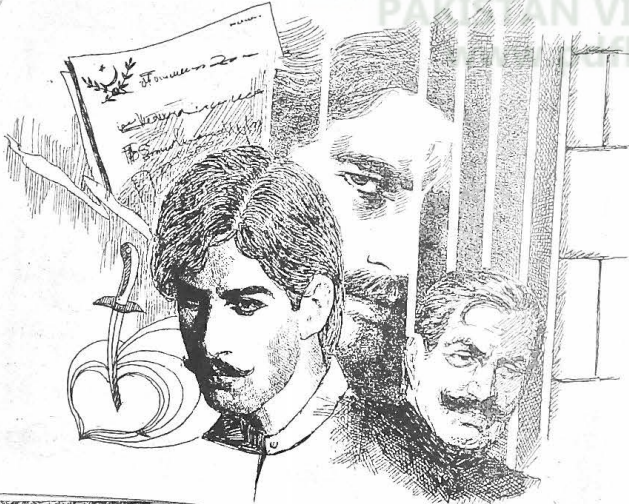
اپنا خون



شعبان کھوسو

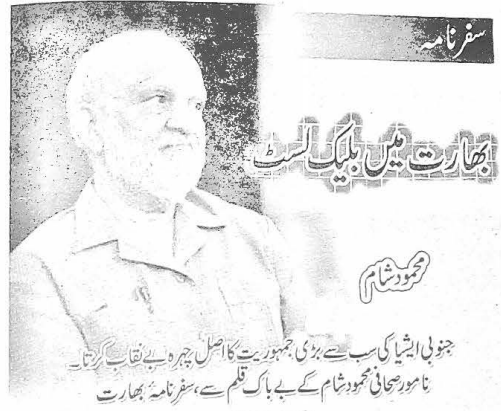
اُس شخص کا قصہ، جسے اپنے خون پر بھروسہ تھا

تاجا اس وقت بہت ہی غصے میں تھا۔ اس کی بیٹی جیسی نازک اس کی بیٹی صغریٰ نہیں کوئی کالی سیاہ، پینانی سے ہی نہیں اس کے ایک ایک سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ غصے سے اس کی آنکھیں باہر کو آ رہی تھیں۔
 ”صغریٰ! اس نے سوائی خجے نہیں کہا۔ اس نے اس کے سامنے سرو سجے قد، ہرئی جیسی آنکھوں اور



بھارت میں بلیک لسٹ

محمد شام



چوتھا حصہ

دہلی ایئر پورٹ میں فسادات کی کڑی؟

ہریانہ اردو اکیڈمی کی طرف سے دعوت نامہ ہے۔ ۱۲۲ پر اپریل ۱۹۹۸ء کو چنڈی گڑھ میں غالب کی دوسم سالہ برسی کی تقریبات کے حوالے سے مشاعرے۔ چنڈی گڑھ کی سال پیلے ۱۹۵۲ء میں دیکھا تھا جب شملہ معاہدے کے لیے صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ جا رہے تھے۔ جہاز نے چنڈی گڑھ ایئر پورٹ پر اتار اٹھا۔ یہاں سے ہم گاڑیوں کے ذریعے شملہ گئے تھے۔ سوچا کہ چنڈی گڑھ دوبارہ دیکھ لیں۔

ہریانہ اردو اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل کشمیر لال زاکر کا دعوت نامہ ماہنامہ تحقیق کے مدیر جناب اظہر جادید کے ذریعے ملا ہے۔ اس سے پہلے تین ششانی صاحب مارچ میں انبالہ اور کترال کے مشاعروں میں طے کی دعوت دے چکے ہیں۔ لیکن صحافی مصروفیات کے باعث جانا نہیں ہو سکا ہے۔

بہار مرحلہ ہے ویزے کا۔ جو اسلام آباد سے ملتا ہے۔ گزشتہ سال امریکی اطلاعات کے زیر اہتمام ایک "ہیولڈنک سیمینار" (سفری مذاکرہ) کے لیے بھارت جانا تھا ویزے کے مراحل امریکیوں نے خود طے کر لیے

تھے۔ اب تو کوئی ثالث نہیں ہے۔ خود ہی ویزا حاصل کرنا ہے۔ فارم بھر کے پاسپورٹ اپنے ایک دوست کو اسلام آباد بھیج دیا ہے اور بھارتی ہائی کمیشن میں کمال پرویز صاحب سے بات کر لی ہے۔ انھیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ گزشتہ سال دہلی ایئر پورٹ پر ویزے کے باوجود بھارت میں داخلے میں مشکل آئی تھی اور ایگریٹیشن کے حکام نے کہا تھا کہ مجھے ویزے کے ساتھ ساتھ کسی خصوصی اجازت کی ضرورت ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایسی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ آپ تو ۱۹۵۲ء سے بھارت جا رہے ہیں۔ آپ کے لیے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوگا۔

لاہور سے دہلی روانگی ہے۔ پی آئی اے کی پرواز ۲۷۰ کے ذریعے ہنڈی منتظر ہے۔ اظہر جادید ہم سفر ہیں۔ میں نے ان کو خبردار کیا ہے کہ دہلی ایئر پورٹ پر گزشتہ سال کی طرح مجھے اس بار بھی روکا جاسکتا ہے۔ آپ ذرا خیال رکھیے گا۔

پرواز جاری ہے پہنچ گئی ہے۔ ایگریٹیشن کے لیے عام طور پر تو ایک کارڈ ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان اور بھارت کے خصوصی تعلقات کے پیش نظر پاکستانی مسافروں کو الگ سے فارم بھرنے پڑتے ہیں۔ فارم،

پاسپورٹ، ویزا، میں نے ایگریٹیشن آفیسر کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر رواں ہو گئی ہیں۔ مائیکرو کیسکریں نے اسے کچھ کہا ہے۔ جس سے اسے ایک جھکا لگا ہے اور اس نے مجھے کہا ہے کہ آئیے اور ایک کمپن میں مجھے بٹھا دیا ہے۔ میرے کاغذات اور پاسپورٹ لے کر وہ کہیں چلا گیا ہے۔ کمپن میں بیٹھے نوجوان ایگریٹیشن آفیسر نے فائل سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا ہے اور کہہ رہا ہے۔ آپ تو پریس رپورٹر ہیں۔ پچھلے سال بھی آپ کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے بھی یاد آ رہا ہے کہ یہ وہی شفت ہے۔ جس سے فروری ۱۹۹۷ء میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت تو مجھے ۳ گھنٹے تک حراست میں رہنا پڑا تھا۔ آج دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ شفت انچارج کہہ رہے ہیں کہ آپ کا ٹاؤپر سے ہی Clear ہوتا ہے۔ آپ بیٹھیں ہوئی جائے گا۔

پی آئی اے والے آئے ہیں، پوچھ رہے ہیں جہاز تو نہیں روکنا۔ اگر کوئی مسافر واپس لاہور بھیجتا ہے۔ تو جہاز روکا جائے۔

جہاز کو تو واپس بھیج دیا گیا ہے۔ اب مجھے یہیں بیٹھنے میں گھنٹے ہو رہے ہیں۔ کچھ فیصلہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ میں ایگریٹیشن حکام سے یہ اجازت لیتا ہوں کہ باہر مشاعرے کے منتظرین میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں انھیں اطلاع دے دوں۔

مددہرمانی کرتے ہیں اور ایک بارودی کارڈ لکھنے کو میرے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ میں اظہر جادید صاحب کو تلاش کرتا ہوں اور انھیں صورت حال بتاتا ہوں۔ نارنگ سانی جو دہلی میں ہمارے میزبان ہیں۔ ان کا موبائل فون نمبر اور گھر کا فون نمبر لے لیتا ہوں کہ جب مجھے ایئر پورٹ چھوڑنے کی اجازت ملے گی۔ آپ کو فون کر دوں گا۔ پھر آپ یہاں سے لے جانے کا انتظام کر لیجئے گا۔

پھر میں آ کر اسی کمپن میں بیٹھ جاتا ہوں۔ پروازیں آرہی ہیں۔ مسافر ایگریٹیشن کا سنزور سے کیسز ہو رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ایک سال پہلے تو امریکن ہمارے ساتھ تھے۔ انھوں نے شور مچایا نہیں گھنٹے بعد

کلیئر فیل مل گئی تھی۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کیوں روکا اور پھر کیوں چھوڑ دیا۔ آج بھی وہ کچھ پوچھ رہے ہیں۔ میں ان سے کہہ بھی رہا ہوں کہ آپ کے ہائی کمیشن والوں کو ویزا ہی نہیں جاری کرنا چاہیے اگر کوئی مسئلہ ہے۔

اب یہ شفت جاری ہے۔ اس لیے انہیں اپنے جانے کی جلدی ہے۔ ادھر ادھر فون ہو رہے ہیں۔ میرا سامان بھی یہیں لا کر دے دیا گیا ہے۔ فیصلہ ہو گیا ہے۔ انٹری ریویژن ڈال کر مجھے ٹرانزٹ سیل میں ڈالا جا رہا ہے۔ میں اپنے وطن میں کچھ بھی ہوں۔ جانا بیچنا۔ اردو کے سب سے بڑے اخبار کا ایڈیٹر۔ کئی بار بھارت یا تکر چکا ہوں۔ شاعروں کا حلقہ بھی جانتا ہے، صحافیوں کا بھی۔ لیکن ایگریٹیشن کے ریکارڈ میں میں بلیک لسٹ ہوں۔ کیوں۔ کیا وجہ ہیں۔ کیا پس منظر ہے۔ یہ نہ مجھے بتایا جا رہا ہے۔ نہ پوچھا جا رہا ہے۔

اب مجھے بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک دشمن ملک میں ہوں۔ ایک تشدد کی والی فضا میں ہوں۔ مجھے یقیناً کسی خاص جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ ایگریٹیشن آفیسر میرے کاغذات کے ساتھ مجھے شفت سے اوپر کی منزل پر لے آئے ہیں۔ ڈیوٹی فری شاہک سے درمیان سے ہوتے ہم ایک ڈرے میں پہنچ چکے ہیں۔ وہاں مجھے ایک اور افسر کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ کہ آپ کو اب یہیں رہنا ہے۔

میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ آپ مجھے واپس پاکستان جانے دیں۔ کوئی بھی پرواز ہو۔ میں خود اس کا ٹکٹ خریدنے کو تیار ہوں۔ آپ کو مجھے اجازت نہیں دینی تھی۔ تو اسی جہاز سے واپس بھیج دیتے جس سے میں آیا تھا۔

ان کا لہجہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کوئی پرواز پاکستان جانے والی نہیں ہے۔ آپ دو راتیں یہیں ٹرینیں گے۔ پرسوں پی آئی اے کی پرواز آرہی ہے۔ اس پر آپ کو چڑھا دیں گے۔

آپ کو کہیں فون کرنا ہو تو یہاں سے سبائی ساتھ جائے گا۔ فون کروادے گا۔ وہ صاحب یہ کہہ کر چلے گئے ہیں۔ اب میں جن کی تحویل میں ہوں۔ ان سے کہتا

ہوں کہ فون کروا دیں۔ تو وہ کہتے ہیں ابھی آپ بیٹھیں۔ دوسری شفٹ آئے گی۔ وہ فون کروا لیں گے۔ یہ سائنس بچ پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک سنبھال لیں۔

اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں اب ہجرت کی قید میں ہوں۔ یہ اپنے خرچ پر ذلیل ہونے والی کیفیت ہے۔ خود ہی جنگ خرید کر یہاں پہنچے ہیں۔ تاکہ اس سلوک سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میں اپنے آپ کو دو روزہ قید کرانے کے لیے تیار کر رہا ہوں اس ڈرے میں کچھ اور بھی قیدی ہیں۔ دو ایک تو ہجرت کے مسلمان ہی ہیں۔ جو سعودی عرب سے واپس بھیج دیے گئے ہیں۔ اب ان کے بارے میں یہ تصدیق کی جا رہی ہے کہ وہ واقعی بھارتی شہری ہیں یا نہیں یا انہیں آئی ایس آئی نے یہاں بھجوا دیا ہے۔ ایک نیپال کے شہری ہیں۔ یہیں بھیچ پر سونا ہے اور ساتھ ہی ایک لیٹرین ہے جسے ہاتھ روم کا نام دیا گیا ہے اور قدیوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ آپ کا استعمال کے لیے ہے۔

اجنبی لوگ۔ غیر ملکی بلکہ دشمن سرزمین، مستقبل نامعلوم، ایسے میں صرف کتاب ساتھ دے سکتے ہیں۔ شاعری کی فائل میرے ساتھ ہے۔ اسی کو نکال لیتا ہوں۔ فرصت ہی فرصت ہے۔ اتنا وقت پہلے کہاں ملا تھا۔ کسی فون کی گھنٹی بجنے کا خطرہ نہیں ہے۔ کوئی ملے والا بھی نہیں آئے گا، کہیں باہر بھی نہیں جاسکتے۔ اس لیے پورے ایشیاک سے اپنی شاعری تو جوہر جی جاسکتی ہے۔ غیر مکمل غزلوں میں نئے شعر کہے جاسکتے ہیں۔ نظموں کی کائنات چھانٹ کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی خیال کی صرف ایک رو ہے۔ پھر ایک وحشت غالب آ جاتی ہے۔ یہ میں کہاں بیٹھ گیا ہوں۔ اس طرح خاموشی سے سب کچھ برداشت کر لینا درست نہیں ہے کچھ شور مچانا چاہیے۔ احتجاج کرنا چاہیے۔

میں اپنے فون کے لیے اصرار کرتا ہوں۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی کہتا ہے کہ نفی شفٹ آنے والی ہے۔ وہ فون کروا دیں گے۔ نفی شفٹ والے کچھ انسان دوست لگتے ہیں۔ وہ ساتھ لے کر چل پڑتے ہیں۔ میں 'جنگ' کے دبلی بیورو میں فون کرتا ہوں۔ انہیں صورت حال

سے آگاہ کرتا ہوں۔ ان سے پاکستان ہائی کمیشن کا نمبر لیتا ہوں۔ مفتی جمیل الدین منٹو انٹرنیشنل پاکستان ہائی کمیشن کو بتاتا ہوں کہ میں بھارت سرکار کا مہمان بن گیا ہوں۔ مفتی صاحب کو بھی پچھلا سال یاد آ جاتا ہے کہ اچھا پھر وہی ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رات بہت ہو گئی ہے۔ پھر بھی مجھ کو کوشش کرتے ہیں۔

میں پھر واپس آ کر اسی ڈرے میں بیٹھ گیا ہوں۔ نیپال کا ایک شہری یہاں کئی دن سے پڑا ہے میں بھی سوچ رہا ہوں کہ نہ جانے کتنے دن یہاں رہتا ہے۔ روز مرہ کے معمولات کا کیا ہوگا۔ کیسے گزرے گی۔ عام طور پر قیدی ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ مکمل مل جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک انجانیا خوف ہے۔ میں بھی کسی سے مخاطب نہیں ہو رہا ہوں۔ مجھ سے بھی کوئی مخاطب نہیں ہو رہا ہے۔ رات والے نہ جانے کیا تمجیں۔ انڈین آئی اے کیا سوچے۔

پینے کا پانی بھی ہاتھ روم سے مل رہا ہے۔ میں نے مگروں سے کہا ہے کہ ایک منزل وائر کی بوتل منگوا دیں۔ انھوں نے پوچھا کہ اور بھی کچھ منگوانا ہو تو بتا دیں۔ میں نے پانی کی ایک بوتل اور ایک سینڈوچ لائے تو کہہ دیا ہے۔

آپ کا فون ہے۔ چلیں۔ مختلف راستوں سے ایک سپاہی مجھے لے جا رہا ہے۔ میرا سامان وہیں سیل میں ہے۔ میں گھبرا رہا ہوں کہ شاید یہ کہیں اور بند کر دیں۔ ایک اسٹنٹ ڈائریکٹر کے کمرے کے باہر لے جا کر مجھے روک دیا گیا۔

آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ کون ہیں۔ مجھے خزانہ سیل سے لایا گیا ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ کوئی فون آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کوئی فون نہیں آیا واپس چلیں۔ پھر بھول جلیوں سے ہوتے ہوئے واپس سیل میں۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔

منزل وائر کی بوتل آ گئی ہے۔ سینڈوچ بھی۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ اور اپنا ذکر کر رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اب سونے کا مرحلہ آ رہا ہے۔ معلوم نہیں نیند آئے گی یا نہیں۔

پھر اپنی شاعری نکال رہا ہوں۔ کچھ لکھنے کی کوشش

کر رہا ہوں۔ الفاظ ہاتھ نہیں لگ رہے، خیالات کتر آ کر گزر رہے ہیں۔

دوسرے قیدی سوچنے لگے ہیں۔ خراٹے لے رہے ہیں۔ آپ بھی سوچاؤ جی۔۔۔۔۔ اب کچھ نہیں ہونے والا۔

'نیند آئے گی تو سوچاؤں گا'۔

'جو آپ کی مرضی۔ خلافت تو اب دو روز بعد آئے گی'۔

نیند تو کہیں دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ اب مجھے بھی ہجرت نہیں آنا چاہیے۔ باقاعدہ دیر سے کے بعد بھی یہ حال ہے۔ یہ تو کوئی خاص دشمنی والی بات ہے۔ یہ بھی نہیں بتاتے کہ ان کے پاس ہمارے خلاف ہے کیا۔ ہم نے ان کا کیا پرہیز کیا۔

'آئے جی آپ کا فون آیا ہے'۔

'میں چلی آیا ہے پیکر لگوادیا تھا'۔

'آپ کے ہائی کمیشن سے فون ہے'۔

اب ان کا رو بہ کچھ مختلف ہے۔ اسی اسٹنٹ ڈائریکٹر انٹرنیشنل کے کمرے میں بھیجتے ہیں۔ مفتی جمیل الدین صاحب کا فون ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ روزانہ خارجہ کے کسی جوائنٹ سیکریٹری سے ہائی کمیشن کی بات ہوئی ہے۔ ہماری حکومت ضرورتاً طور پر ۲۴ گھنٹے قائم کی اجازت دے رہی ہے۔ آپ ہاتھ میں فارم وغیرہ بردویں۔ ہم آپ کو لینے آ رہے ہیں۔ فارم پر لکھا ہوا ہے کہ صرف ۲۴ گھنٹے ہجرت میں رہ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں ڈائریکٹر وزارت داخلہ کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔

مفتی جمیل الدین اور پاکستانی ہائی کمیشن کے کچھ کام آئے ہوئے ہیں۔ فضائیں کشیدگی ہے۔ چہرہ پر تناؤ ہے۔

کشتی مشکل اور کٹھن زندگی ہے۔ ہمارے ہائی کمیشن والوں کی اس مستقل تئیں و زندگی گزرتی ہے۔ ہم ایئر پورٹ سے روانہ ہو گئے ہیں۔ دہلی ایئر پورٹ سے شہر تک راستہ پچھلی بار کتنا خوب صورت اور درoman پرورد لگ رہا تھا۔ اب تو میرا بار

دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا۔ کاش کوئی پرواز آج ہی مجھے واپس پاکستان لے جاتی۔

مفتی جمیل الدین سے ہماری یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ وہ پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ (پی آئی ڈی) کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کراچی میں کئی سال رہے ہیں۔ پھر مختلف ادوار میں مختلف عہدوں پر ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ بھولنے کی بجائے ان کے ہاں ہی ٹھہرنے کا پروگرام بنا ہے۔ بھول میں قیام اور پریشان کن ہو سکتا ہے۔ رات گزرتی ہے۔ رات گزرتی ہے۔ سب خوابوں پر چھایا رہا ہے۔

مفتی صاحب کے ساتھ پاکستان ہائی کمیشن پہنچے ہیں۔ اس کی حدود میں بھیج کر مئی اپنا بیت، مفتی سکین ہو رہی ہے۔ ہائی کمیشن کے ایک آفیسر کو ساتھ لے کر ڈائریکٹر ہوم اے این شرما سے ملنے جا رہے ہیں۔ استقبالیہ، سیکوری، تقارر، داخلہ پاس کے مراحل سے گزرتے ہوئے ڈائریکٹر صاحب کے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب ہات لائن پر بات کر رہے ہیں۔ اسی لیے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

بار بار یہ ہوتی ہے۔ حال احوال سننے کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ مجھے انٹرنیشنل منسٹر سے بھی فون آیا تھا۔ میں فائل منگواتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کون روکا گیا ہے۔ اتنے عرصے سے مشاعرے سے غفلت میں کی طرف سے کرتا رنگہ دگل بھی بچ گئے ہیں۔ خاصے بزرگ ہیں۔ معلوم نہیں انہیں کیوں زنت دی گئی ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ چند ہی انہیں کیوں زنت دی گئی ہے۔ مجھے بھی پر سوال کروا دیں گے۔ ٹرین تو ٹھیک گئی ہے۔ وہ مجھے نہیں پر سوال کروا دیں گے۔ مجھے مشاعرے میں جانے کی ڈائریکٹر صاحب بھی مجھے مشاعرے میں جانے کی عادی اجازت دے رہے ہیں۔ لیکن میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ اب میرا شعر اے یا کسی بھی تقریب میں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ مجھے صرف یہ بتا دیا جائے کہ اس سلوک کی کیا وجہ ہیں۔ اگر میرے خلاف کوئی الزامات ہیں تو ظاہر کیے جائیں اور اگر کوئی خوں معاملات ہیں تو اسلام آباد میں انڈین ہائی کمیشن کو کیوں نہیں مطلع کیا گیا۔ وہ مجھے دیرانی جاری نہ کریں۔

ڈائریکٹر صاحب غور سے سن رہے ہیں۔ لیکن جواب وہی ہے کہ فائل آجائے تو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ اسی روز سر پھر کو دوبارہ ہم ڈپارٹمنٹ کا چکر لگتا ہے۔ فائل ابھی تک نہیں آئی ہے۔ اگلی صبح 11 بجے کا وقت طے ہوا ہے۔ دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ جو بھی اگلی پرواز طے اس سے روانگی ہو جائے۔ اس ملک کو تیشی جلد چھوڑ دیا جائے اچھا ہے۔

گرن سائیٹی Peace Initiative لگانے ہیں۔ ٹریولنگ سیمنار میں امریکہ کے ساتھ شریک میزبان بھی رہے ہیں۔ پچھلے برس ان سے کافی ملاقات رہی تھی انہیں معلوم ہوا ہے تو فہم کیا ہے کہ شام کو دہلی جیم خانہ میں ملوں۔ کچھ احباب سے ملاقاتیں ہوں گی۔ ذہنی کیفیت ملنے لگانے کی تو نہیں۔ لیکن یہ سوچتا ہوں کہ بھارتی حکومت کی میزبانی اور حسن سلوک کا احوال تو بھارت کے صحافیوں، دانشوروں اور پبلشروں تک پہنچ سکے گا۔

ریٹائرڈ ڈی فوجیوں، بیوروکریٹوں، دانشوروں، سینئر صحافیوں کی گپ شپ سے جیم خانہ گونج رہا ہے۔ کرن سائیٹی جس جس کو بتاتے ہیں۔ سب اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں، کالم نویس کالم لکھنے کا اظہار کرتے ہیں۔ کچھ متعلقہ حکام سے بات کرنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں اور پھر اپنی گپ شپ میں مست ہو جاتے ہیں۔

اگلی صبح پھر ڈائریکٹر ہوم کے دفتر میں پہنچتے ہیں۔ اردو اخبارات میں خبر آچکی ہے کہ انگریزی اخبارات میں نہیں آئی ہے۔ حالانکہ کچھ کو بتایا بھی گیا ہے۔ ڈائریکٹر ہوم پھر فائل نہ آنے کا عذر ظاہر کرتے ہیں۔ ایک بار پھر سر پھر کو آنے کا کہتے ہیں۔ میں پاکستان ہائی کمیشن واپس جاتے وقت پی آئی اے سے اگلے روز کی سیٹ تک کروا لیتا ہوں۔ اب اس سلوک کے بعد میرا اس ملک میں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور جو بھی اگلی پرواز دستیاب ہو اس سے جانا چاہتا ہوں۔ یہ سہ میرا آتے ہیں تو ہماری فائل شام صاحب کی میز پر موجود ہے۔ فائل بہت ضخیم ہو چکی ہے۔ کئی فائلیں تیار ہیں۔ لیکن اس میں کیا ہے یہ شرمناک صاحب نہیں بتا رہے۔ وہ

اپنے اعلیٰ افسروں کو بتائیں گے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس پر رپورٹ تیار کر رہا ہوں۔ آپ کچھ دن ٹھہرنا چاہیں۔ ٹھہریں۔ جن سے ملنا چاہیں۔ ٹیکس۔ فائل کو نمٹانے میں کچھ دن لگ سکتے ہیں۔

میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ میرے پاسپیورٹ پر Exit جانے کی مہر لگا دیں میں تو واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی سیٹ تک کروا چکا ہوں۔ میں کسی کو بھی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا، کیونکہ یہاں جس سے بھی ملوں گا۔ بعد میں سی آئی ڈی اور دروازے اس کو تنگ کرتے رہیں گے۔

شرما کا کہنا ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کو خط دے دوں گا کہ کمرے سے اٹھ کر ہم انتظار گاہ میں جا سکیں گے۔ کیونکہ شرمناک صاحب کو کسی میننگ کے لیے جانا ہے۔ انتظار گاہ غیر ملکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کسی کا مسئلہ یاد نہ ٹھہر جائے گا کہ آپ پاسپیورٹ میں کوئی غلطی ہے۔ ایک ہنگامہ ہے۔ شرمناک سے گوریٹوں

انڈین افسروں کو خوب بے نقط سناتے ہیں۔ یہ افسر ملی سے سنتے ہیں۔ پاکستانی، نیپالی، بنگلہ دیشی، سری لنکن، دب کے بات کرتے ہیں۔ بے جرم شتمنی کی سزا مرگ مفاجات۔

جس ٹھکرگ نے یہ خط ہمیں دینا ہے۔ وہ نظر تو آ رہا ہے۔ وہ بھی کسی کمرے میں جا رہا ہے۔ وہ بھی اسے کسی ڈائریکٹر سے دستخط کروانے میں۔ ذرا دھکھٹے بعد وہ ہمیں ایک خط دیتا ہے۔ جو ایک ڈی آئی ٹی پولیس کے نام ہے۔ ہم اس سے کہتے ہیں کہ ہمارا دروازہ تو پولیس حاضری سے مستثنیٰ ہے۔ ہم پولیس کے پاس کیوں جا سکیں۔ اس کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ ہمیں پھر نہیں بھیجے گا۔ کیونکہ اس کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔

دو روز سے ہم اس دفتر میں بار بار آ رہے ہیں۔ بھارت آنی میری کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ سب قریبی رشتے دار نہیں تھے۔ لیکن سب اب یادوں میں ڈھل چکے ہیں۔ کچھ کہتے تو پاکستان پہنچے وقت شہید ہونے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ کچھ کہتا ہی نہیں چلا کر کہاں گئے۔ میرے والدین اور ایک بھائی۔ اس وقت انجیل میں

نہیں۔ اس لیے ہم زندہ بچ گئے تھے۔ خاندان ہمارا مشورہ ہے۔ لیکن ایک طرف صرف یادیں ہیں۔ کوئی زندگی نہیں جس سے ملنے آتا پڑے۔

میں موجود پریشان حال پاکستانی تو سیکڑوں وہ ہیں جن کے عزیز و اقارب یہاں ہیں۔ گے پیارے ہاں ہیں۔ ان کی توجہ جوری ہے۔ انہیں تو یہاں آنا پڑتا ہے۔ ان کو دونوں طرف کے ڈائریکٹر، افسر، ٹھکرگ، تنگ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اس وقت رشتہ انسانیت کا نہیں۔ بتا۔ غیر ملکی کا ہو جاتا ہے۔ قانون خود تو کچھ نہیں کہتا۔ قانون کا استعمال اپنی مرضی سے کیا جاتا ہے۔ پولیس کے نام خط تو ہم اس ٹھکرگ کو واپس کر دیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ ہمیں تو پاسپیورٹ پر Exit لگا دیں۔ تاکہ ہم یہاں سے اپنے وطن واپس چلے جا سکیں۔ اگر Exit نہیں لکھا ہوگا تو اب رپورٹ دالے پھر روکیں گے۔

دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب پاسپیورٹ پر کوئی Exit لگانے والا نہیں ہے۔ ایک دن اور میں گزرا ہوا ہوں۔

پی آئی اے کی پرواز شام کو ہے۔ صبح 11 بجے پھر ہوم آکر پہنچنے گئے ہیں جہاں اسی طرح ہنگامہ ہے۔ جو ہم

ڈائریکٹر صاحب خوش قسمتی سے مل گئے ہیں۔ انہوں نے متعلقہ ٹھکرگ سے کہہ بھی دیا ہے کہ پاسپیورٹ پر Exit لکھ دے۔ انہیں تو رابری کی سینگ میں جانا ہے۔ وہ جلد آنے کا کہہ کر نکل گئے ہیں۔ ہم پھر انتظار گاہ میں بیٹھے ہیں۔ ٹھکرگ نے پاسپیورٹ پر لکھ دیا ہے۔ لیکن اب دستخط اور ہم کا انتظار ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کا کچھ بتائیں ہے۔ ان کا اسٹاف کہتا ہے ڈائریکٹر ہیں ان سے کے پروڈ میں ایک دوسرے ڈائریکٹر ہیں ان سے درخواستیں کی کہ کر۔ کہ دستخط کر دیں۔ میں تو یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا سنگین مسئلہ تو نہیں ہے۔ وہ صاحب انکار کر دیتے ہیں کہ پاکستانی شہریوں کا کچھ شہر انہیں ہے ہم برآمدوں میں چکر لگا رہے ہیں۔ کسی ڈائریکٹر کی تلاش ہے۔ اس نے مشورہ دیا ہے کہ اسٹاف میں سے ہی کسی نے مشورہ دیا ہے کہ

یہاں کے جوائنٹ سیکریٹری بہت اچھے افسر ہیں ان سے مل لیں۔ ان کا اسٹاف جیل و جت کرتا ہے کہ صاحب مصروف ہیں۔ ابھی تو ملنا مشکل ہے۔ اب میرا چٹانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اس لیے میں جوائنٹ سیکریٹری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتا ہوں۔ انہیں اپنا تعارف کروا دیتا ہوں۔ وہ سردار جی ہیں۔ ان کی پیشانی پر تل نہیں آتا۔ اطمینان سے بیٹھے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے ساتھ پاکستان ہائی کمیشن کے افسر ہیں۔ وہ اپنا تعارف کرواتے ہیں۔ تب جوائنٹ سیکریٹری کا چہرہ کچھ کرخت ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ میرا مسئلہ سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ جانا چاہتے ہیں تو ہم مہر لگا دیتے ہیں۔ لیکن آپ کے معاملے پر اعلیٰ سطح پر بات بھی ہو رہی ہے۔ میں نے فائل وزارت خارجہ کو بھجوا دی ہے۔ اب آپ ٹھکرگ اس کا انتظار کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ میں اب ذہنی طور پر اس کیفیت میں نہیں ہوں کہ ایسے ماحول میں رہ سکوں۔ اس لیے میں واپس آکر جانا چاہتا ہوں اور مجھے آج ہی جانا ہے۔ وہ کسی سے نون پر بات کرتے ہیں اور اپنا ایک اسٹاف ممبر ساتھ بھیجتے ہیں اور ہم اسی ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں جو کچھ دیر مل حاف انکار کر کے کہتے ہیں کہ پاکستانی شہری ان کی شہریت نہیں ہیں ہمیں تاکہ یہ سیٹ پر بٹھائے ہیں اور متعلقہ ٹھکرگ ہلا کر فائل دیکھتے ہیں۔ پاسپیورٹ پر اپنے آؤ گراف عنایت کرتے ہیں۔ چہرے کو کہتے ہیں کہ مہر لگالائے پاسپیورٹ ہمارے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہم ان کا ٹھکرگ ادا کرتے ہیں۔

پی آئی اے کی پرواز میں اب دو گھنٹے باقی ہیں۔ حقیقی میل الدین سے میں درخواست کرتا ہوں کہ ایئر پورٹ جانے سے پہلے بستی نظام الدین میں حاضری دینا ہے۔ کچھ دوا عین ماگ لیں۔ کچھ گلے کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب بھی دہلی آتا ہوں تو بستی نظام الدین میں ایلا جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ مزاروں پر حاضری۔ گدی نشینوں سے گفتگو۔ پاک بھارت

تعلقات میں بھڑکی کی دعا میں۔
وہی جہوم زائرین۔ عشق کا اظہار۔ فریادیں۔
التجائیں۔

اب ایئر پورٹ رواگی ہے۔ دلی پہلے بھی آئے ہیں۔ یہ سفر پیچہ ہو رہا ہے۔ پہلے دوسروں کے خرچ پر آتے رہے ہیں۔ اب بھی بھارتی حکومت کی دعوت پر، کبھی امریکی حکمہ اطلاعات، ایک بار افغانستان حکومت کی دعوت پر کامل جانا تھا تو یہاں سے ہی گزرتا پڑا تھا۔ جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی افغانستان کی سرحد پاکستان سے ملتی ہے۔ کامل بھی پاکستان سے نزدیک ہے۔ لیکن اس وقت نجیب اللہ کی حکومت تھی۔ پاکستان سے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس لیے پشاور سے بھی کسی کو کامل جانا ہوتا تھا۔ وہاں سے آریانہ ایئر لائن پکڑ کر کامل جاتا تھا۔ یہ تاریخ کے جبر کے مظاہر ہیں۔ ان سے بچاؤ نہیں ہے۔ دلی میں یہ تین راتیں غضب رہی ہیں۔ دلی نے کیا رنگ دکھائے ہیں۔ اب کے اپنے خرچ پر آئے ہیں تو یہ سلوک ہوا ہے۔ مشاعرے والوں کو نکٹ کے پیسے اور شاعری کا معاوضہ دینا تھا۔ وہ لگیا کیونکہ مشاعرے میں جیتنے تو پیسہ ملتا۔ اپنے خرچے پر یہاں آکر یہ ذہنی کوفت اور ذلت برداشت کی ہے۔

میں نے اس سرزمین پر ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ٹرانزٹ میل میں سینڈویچ اور منزل واپس پر جو ۵۰ روپے خرچ ہوئے۔ اس کے بعد میں نے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ خریداری بالکل نہیں کی۔ پہلے سازشیاں، کاجو، الایچی وغیرہ خریدنا ایک معمول تھا۔ فرمائشیں بھی ہوتی تھیں۔ اب کے بھی تھیں۔ لیکن احتجاج میں نے بھارت کے زرمبادلہ کے ذخائر میں ایک ڈالر کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔

ایگریٹیشن کے کاؤ پر کچھ جیروں کا اظہار ہے۔ لیکن روکا نہیں جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی دھڑکا لگا ہوا ہے۔ جب تک ٹرانزٹ میں جا کر نہیں بیٹھ گیا ہوں اس وقت تک غرض نہیں رہا کہ کبھی روک لیا جاؤں۔ جی آئی اے کے جہاز کی کھڑکی سے میں دہلی

ایئر پورٹ پر الوداعی نظر ڈال رہا ہوں۔ اب بھی ڈر رہا ہوں کوئی جہاز نہ آجائے۔ پرواز ٹیک آف کر رہی ہے۔ دہلی ایئر پورٹ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ میں اپنے آپ میں سوال ہو رہا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لا رہا ہوں کہ اس اذیت گاہ سے نجات ملی ہے۔

میں راستے میں سوچ رہا ہوں کہ اب مجھے اپنے اس مسئلے پر بھرپور احتجاج کرنا ہے۔ دنیا کو بتانا ہے کہ دہلی ایئر پورٹ پر پاکستان کے سب سے بڑے اخبار کے ایڈیٹر کے ساتھ کیا ہوتا رہا۔ دہلی سے لاہور پہنچ گئے ہیں۔ لاہور میں کسی سے ملنے کا جی نہیں ہے۔ ایئر پورٹ سے ہی کراچی کی اگلی پرواز میں بیٹھنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ سیٹ مل گئی ہے۔ ایک اذیت بھرا سفر ختم ہو گیا ہے۔ اب اپنے وطن میں ہیں۔ ایک عذاب سے نکل آئے کی خوبی۔ ایک کرب سے نجات کی تسکین۔

کراچی پہنچ کر میں نے اپنا احتجاجی سفر شروع کر دیا ہے۔ بھارتی اخبارات کے نمائندوں اور ای میل ایڈریس لے کر آیا ہوں۔ انھیں اپنی روداد بھیج رہا ہوں۔ ہندوستان نامور، نامحرف آف انڈیا نے یہ روداد چھاپ دی ہے۔ نامحرف آف انڈیا میں خطوط کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ حقوق انسانی کی تقصیریں۔ صحافیوں کی احتجاجی کر رہی ہیں۔ بھارتی حکومت کے روپے کی مذمت کر رہی ہیں۔ ڈائریکٹر ہوم شرماتے بیان دیا ہے۔ صحافی قدر کے نازک مزاج ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ محمود شام سے متعلق کچھ انکوائریز تھیں ان کا جواب ضروری تھا۔

کوئی سوال پوچھا جائے تو جواب ملتا ہے۔ مجھ سے تو کبھی کچھ نہیں پوچھا گیا۔ میں نے گزشتہ بار بھی بھارت کے بانی کشمیر کو خط لکھا تھا۔ اس کا جواب بھی نہیں آیا تھا۔ اس بار بھی خط لکھا تھا۔ اب جواب نہیں۔

اب پارتھ سارنچی ہائی کشن بن کر آئے ہیں۔ وہ کراچی کے ایک طویل عرصے تک تو فیصل جرنل رہے ہیں۔ ان سے یہاں اچھی ملاقات رہی ہے۔ آئیں بھی باضابطہ خط لکھا ہے۔ جواب تحریری طور پر انھوں نے

بھی نہیں دیا ہے۔ زبانی کہا ہے کہ اب آپ جا میں گئے۔ تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی لیکن میں تو اب اس طرح جاننا نہیں چاہتا۔

ہم نے ایک خط بکریٹری وزارت خارجہ پاکستان کو بھیج لکھا ہے۔ جس کے جواب میں انڈیا ڈیسک کے ڈائریکٹر جمیل احمد نے ۵ جون ۱۹۹۸ء کو لکھا کہ ہم نے اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمشنر سے بھی اس معاملے پر رابطہ کیا ہے اور غنی دلی میں اپنے ہائی کمیشن سے کہا ہے کہ وہ بھارتی حکام سے اس مسئلے پر بات کریں۔

نئی دہلی کے سابق چیف جسٹس راجندر چہرنے مجھے بھی خط بھیجا۔ جو بھارتی اخبارات میں بھی شائع ہوا۔ وہ اقوام متحدہ کی مختلف کمیٹیوں کے رکن بھی رہے ہیں اور اب وہ شہری آزادیوں کی عوامی یونین کے صدر بھی ہیں۔ انھوں نے بھارتی حکام کے رویے کی سخت مذمت کی اور مجھے لکھا کہ وہ پاک بھارت گہرے دوستانہ تعلقات کی خواہش اور یقین رکھتے ہیں اس لیے وہ یہ ایجنل کریں گے کہ میں بھارت بھی نہ آنے کے قسطے پر نظر ثانی کروں۔ ریڈیکل ہیومنسٹ ایسوسی ایشن نئی دہلی کے سیکریٹری این ڈی ستولی نے بھی ذاتی طور پر خط لکھ کر مجھ سے ہمدردی ظاہر کی اور کہا کہ وہ بھارتی حکومت سے اس مسئلے پر احتجاج بھی کر رہے ہیں۔ انڈین جرنلس یونین کے سیکریٹری جنرل سر نیواس ریڈی، انڈو پاک جوائنٹ پبلسر ساروہ کوٹونیر کے کی تلک نے اس سلسلے میں وز پر عظیم کو خطوط اور انگریزیشن حکام کے اس رویے پر احتجاج کیا۔ انھوں نے ازراہ کرم مجھے بھی ان خطوط کی نقول بھیجیں۔

بھارت میں بے شمار انجمنوں نے اس مسئلے پر احتجاج کیا اور مجھے بھی ہمدردی کے خطوط لکھے اور مسئلہ حل ہونے تک احتجاج جاری رکھنے کی تلقین دہلی کروائی لیکن یہاں اردو اکادمی نے ہمیں کوئی خط نہ لکھا۔ نہ حکومت سے کوئی بات کی۔ اس نتیجہ نے ہمیں دعوت دی تھی اور اس قابل سمجھا تھا کہ کل ہند غائب ہندوستان نامور پاکستان کے مشاعرے میں شرکت کر سکوں۔ ان کی طرف سے آج تک کوئی خط موصول نہیں ہوا۔

ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ان کو علم ہی نہ ہوا ہو کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔

مسائل ہمارے..... فکرم گرام یکہ کو

امریکی حکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام پاک بھارت سفری سیمینار پہلے تو مجھے حیرت ہوئی۔ پھر پریشانی کہ جھگڑا تو یہ دوسری دلیوار بہ دیوار ہوسایوں کا ہے۔ اس میں ہزاروں میل دور..... بلکہ زمین کی دوسری سمت واقع امریکہ کو فکرم گرام کیوں ہو رہی ہے کہ ہمارے تعلقات بہتر کر دے۔ ہم تو بچپن سے سننے آ رہے ہیں کہ دونوں ملکوں کے تعلقات خراب کروانے والا ہے ہی امریکہ۔ پھر قدرے اطمینان اور خوشی بھی ہوئی کہ جب امریکہ نے بھارت پاکستان کو قریب لانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ تو دونوں ملک شاید نزدیک بھی آجائیں۔

حتمی نے درد پایا ہے۔ یہی دوا دینا۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ دونوں کو یہ احساس تو ہو جائے کہ انھیں لاڑوا جا رہا ہے۔ دونوں تو بڑے خلوص اور جوش جذبے سے لڑ رہے ہیں۔

امریکی حکمہ اطلاعات نے پاکستان اور بھارت کے صحافیوں، ایڈیٹروں پر مشتمل ایک سفری سیمینار کا اہتمام کیا ہے، جس کا موضوع ہے۔ ”تعارض طے کرنے میں میڈیا کا کردار“ کچھ ایڈیٹر۔ سینیٹریں اور کالم نویس بھارت سے پہلے پاکستان آئیں گے۔ پھر ان کے ساتھ ہی پاکستان کے ایڈیٹر۔ سینیٹریں اور کالم نویس بھارت جائیں گے۔ ادھر لاہور، اسلام آباد، کراچی میں سیمینار ہو رہے ہیں۔ ادھر نئی دہلی اور ممبئی میں سیمینار منعقد ہوں گے۔

۲۳ فروری ۱۹۹۸ء۔ لاہور۔ پرل کانفی نیشنل کے ایک کمرے میں سیمینار کے شرکاء کی تعارفی ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے بیٹھنے والے اور ادھر بھارت سے آنے والے۔ امریکیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے ہیں۔ صدیوں سے اکٹھے رہنے والے۔ نصف صدی سے الگ ہوئے تو انھیں ملنے کے لیے ایک ثالث کی ضرورت پڑی ہے۔

وقت شاید ہے کہ مسائل خائشوں کے ذریعے حل ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایک دوسرے کو پہلے سے بھی جانتے ہیں۔

بھارت سے آنے والوں میں سروش بانا، ایگزیکٹو ڈائریکٹر، بلنڈنگ ڈائمنڈ اورن کمار بھرتی، ڈائریکٹر اسٹریٹجک اسٹریٹجک۔

سکن چیئرمین پادھیا۔ ایگزیکٹو ایڈیٹر۔ آئند بازار پتیکا۔

این ہری کمار۔ چیف ایڈیٹر۔ دکن ہیرالڈ۔

بنگلور۔ ریٹائرنڈ۔ فری لانس جرنلسٹ۔ نئی دہلی۔

ڈائریکٹر عبد الرحیم، چیئرمین۔ شعبہ صحافت۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔

کرناٹک۔ بیہرہ سہائی۔ ڈائریکٹر انٹرنیشنل سینٹر فار پیس اینڈ ڈیولپمنٹ۔

ٹیما سٹالوڈ۔ ایڈیٹر کیڈٹلزم کمیٹی۔

شاہد صدیقی۔ ایڈیٹر۔ نئی دنیا۔ نئی زمین۔ عوام۔

نئی دہلی شامل ہیں۔ پاکستان سے شرکت کرنے والوں کے نام یہ ہیں۔

رائم الحروف۔ طارق محمود شام۔ ایڈیٹر روزنامہ جنگ کراچی۔

سید جاوید اقبال۔ ایڈیٹر سائڈ لائن۔ تحریک ورلڈ۔

کراچی۔ انجم ابراہیم۔ ریڈیو نٹ ایڈیٹر برنس ریکارڈر۔

کراچی۔ ریحانہ حکیم۔ ایڈیٹر ماہنامہ نیوز لائن کراچی۔

خالد احمد۔ ایڈیٹر۔ آج کل۔ فریڈم فائٹرز۔

لاہور۔ قدرت اللہ چوہدری۔ ایڈیٹر پاکستان لاہور۔

پہلی شام تو ملنے لگے میں گزر رہی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان دوریاں ختم کرنے کی کوششیں کرنے والے پہلے اپنے درمیان دوریاں کم کر رہے ہیں۔ امریکی محکمہ اطلاعات کراچی، لاہور، اسلام آباد کے منجملہ انفرز۔ پبلک انفرز کے امریکہ سے آنے

ہوئے سفید فام، سیاہ فام آفیسرز پاکستان اور بھارت دو ہمسایوں کے ایڈیٹرز کے درمیان رابطہ بن رہے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان قربتوں کا آغاز شہر سمبر لاہور سے ہوا ہے۔ جو ۱۹۶۵ء میں بھارتی جارحیت کا نشانہ بنا تھا۔ جس خیم خانہ میں جنرل چوہدری نے جام نوش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ پریل کانٹیننٹل ہوٹل سے بہت نزدیک ہے۔ جنرل چوہدری کو اس وقت حسرت ہی رہ گئی۔ لیکن اب بھارت کے کئی ریٹائرڈ جنرل ٹریک نوڈ چلمیو کے سلسلے میں پاکستان آ رہے ہیں۔ تو وہ جام نوش کرنے کی حسرت پوری کر لیتے ہیں۔ یہ جنرل، بیورو کریٹ جب حاضر رسوں ہوتے ہیں۔ تو پاکستان کے خلاف جارحیت کو فرض اوٹین سمجھتے ہیں۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کے پتھریں بن جاتے ہیں۔

میں چلی بارکی ایسی کوشش میں شامل ہو رہا ہوں۔ پہلے بھی ایسے سینار ہو چکے ہیں۔ ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ماضی میں ان میں شرکت کرنے والے کچھ نہیں تیار رہے ہیں۔ یہی احساس ہو رہا ہے کہ فالو اپ کا سلسلہ کمزور ہے۔ اسلام آباد امریکی سینٹر کے فرسٹ سیکرٹری منجملہ انفرز۔ جناب جیو ڈور ایچ۔

جس کی طرف سے سینار سے متعلقہ خط میں یہ سوالات کیے گئے ہیں۔

۱۔ آپ کے ادارے نے بھارت اور پاکستان کے لوگوں کے درمیان حالات کی بہتری کے لیے پہلے کیا کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی دوسرے کی ایسی کوششیں جو آپ کے نزدیک قابل تحسین رہی ہو۔

۲۔ کیا پاکستانیوں اور بھارتیوں کے ذرائع ابلاغ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر کرنے میں تعاون کر رہے ہیں۔ کیسے اور کیوں؟

۳۔ پاکستانیوں اور بھارتیوں کے درمیان اختلافات طے نہ کر سکنے میں بنیادی رکاوٹ آپ کے خیال میں کیا ہے۔

۴۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرنے کے لیے آپ کے اخبار کے قارئین کیا کر سکتے

ہیں۔ وہ کون سے عناصر ہیں۔ جو بھارتیوں اور پاکستانیوں میں مضبوطی سے اپنے اختلافات دور کرنا چاہتے ہیں اور کون سے عناصر ایسا نہیں چاہتے۔

سوالات بنیادی ہیں۔ ہم تو اس سلسلے میں برسوں سے کوششیں کر رہے ہیں۔ میں تو اس وقت بھارت گیا تھا۔ جب دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات بھی نہیں تھے۔ سوئی سفارت خانہ پاکستان میں بھارت کے مفادات کی اور بھارت میں پاکستان کے مفادات کی گمراہی کرتا تھا۔ کتنے لوگوں سے ملے۔ کتنے گفتگوں تک ان موضوعات پر لگا۔ یہ سفر نامہ بہت مقبول ہوا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستان بھارت دونوں کے شہری آپس میں قربی تعلقات چاہتے ہیں۔

امریکہ سے ایک نامور صحافی آرتھر جیریٹی خاص طور پر اس سینار میں ماڈریٹ کا کردار ادا کرنے آئے ہیں۔ وہ چیک جرنلزم (عوامی صحافت) کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔ کئی ممالک میں تنازعات کے تفسیر کے لیے صحافیوں کی تربیت کرتے رہے ہیں۔ 'اوتھا سٹیزن' میں بین الاقوامی امور پر ادارہ کی نگاہ رہے ہیں۔ نیویارک یونیورسٹی میں چیک لائف اینڈ پریس (عوامی زندگی اور صحافت) کے منصوبے سے وابستہ ہیں۔

۲۵ فروری ۱۹۹۹ء

آرتھر جیریٹی چیک جرنلزم کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کر رہے ہیں۔ پہلی نشست کا موضوع ہے، میڈیا کے مطابق بھارتیوں اور پاکستانیوں کے راستے میں آخر کیا رکاوٹ ہے جو ایک مشترک مقصد کا احساس نہیں ہونے دیتی پاکستانی اور بھارتی صحافی اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اپنے نکتہ پر زور دے رہے ہیں۔ اصل مقررین پاکستان سے سید جاوید اقبال اور بھارت سے شاہد صدیقی ہیں۔ سب نے حصہ لیا ہے اور بڑے کام کی بائیں کی ہیں۔

دوسری نشست میں موضوع سخن ہے۔ ادارے اور افراد (سیاسی جماعتیں تجارتی صنعتی تنظیمیں۔ مذہبی رہنما۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

اصل مقررین پاکستان سے انجم ابراہیم۔ بھارت سے منیہا مکمل واڈمیں۔ دونوں خیال میں بڑے موثر بیجرائے میں اس انتہائی اہم موضوع پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس امر پر دونوں متفق ہیں کہ دونوں ملکوں کی سیاسی جماعتیں اور مذہبی رہنما تو تعلقات خراب کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ان سے کوئی امید رکھنا بے فائدہ ہے۔

تیسری نشست میں موضوع یہ ہے۔ ایسے کون سے مخصوص کام ہیں جو بھارتی پاکستانی مذاکرات میں حائل مخصوص رکاوٹوں کو دور کر سکتے ہیں۔ یا انہماک اور اردو لکھنؤ کی رو بہ رکتے میں آسانی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس نشست کے اصل مقررین ہیں خالد احمد

پاکستان سے اور کمن چھانو پادھیا بھارت سے..... موضوع انتہائی حساس ہے۔ چھپے ہوئے۔ بہت بھرپور مباحثہ رہا ہے۔ میں تو پہلی بار کسی ایسے سینار میں شرکت کر رہا ہوں۔ اس لیے اب جا کر کچھ کھینچنے ہوں کیا ہوتے ہیں۔ بات کرنے کی ادا کیا ہے۔

بات کرنے کی ادا ہوئی ہے

نکتہ گل بھی صدا ہوئی ہے

کھلی بحث میں سب شرکت کرتے ہیں۔ آرتھر جیریٹی دن بھر کی بحث کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

امریکی کو تفصیل خانے کی طرف سے رات کو استقبال دیا گیا ہے۔ جہاں لاہور کے نامور سیاست دانوں، ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں سے ملاقاتیں

رہتی ہیں۔

پہلے کی نشستوں میں اکثر شرکان امور پر ایک دوسرے کے قریب نظر آ رہے ہیں۔

۱۔ دونوں ملکوں میں اخبارات و رسائل آسانی سے دستیاب ہونے چاہئیں۔ ان کا روزانہ مطالعہ عام شہریوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لاسکتا ہے۔

۲۔ اس وقت دونوں ملکوں کے عام لوگوں کے درمیان روابط کافی نہیں ہیں۔

۳۔ یہ شکایات سامنے آئیں دونوں طرف میڈیا اشتعال انگیز بیانات شائع کرتا ہے۔

۴۔ پاکستانیوں، بھارتیوں، ہندوؤں اور

سچی کہانیاں 177

جائیں جو پاکستانیوں اور بھارتیوں کو قریب لانے کے لیے غیر معمولی کردار ادا کریں۔

یہ بھی زیر بحث آیا کہ ٹیلی ویژن چینل اور انٹرنیٹ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اب ہم آباد میں ہیں۔
سفری سیمینار کا یہ دوسرا باقاعدہ دن ہے۔ لاہور

کے ساتھ ہی، اسلام آباد پہنچے ہیں۔ امریکن سینٹر میں کچھ وقت سے پہلے ہی ظہرانہ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد انسٹیٹیوٹ آف اسٹریٹیجک اسٹڈیز میں اسمبلی

کے سلسلے میں نشست ہے۔ جسے تنازع کے تصفیے کے لیے ٹاؤن میٹنگ کا نام دیا گیا ہے۔ سیمینار کے مسافر تو

ہی ہیں معافی طور پر، ہم سب سے ترس رہے ہیں۔
ہیٹیوٹ کے چیئرمین آغا مرتضیٰ پویا شرکا کو خوش آمدید
کہہ رہے ہیں اور امداد ظاہر کر رہے ہیں کہ اس سفر پر

سفری سیمینار کے سلسلے میں امریکی محکمہ اطلاعات

کے کثرتی پبلک افیئر آفیسر بیری والکل انتہائی تفصیل سے بتا رہے ہیں کہ یہ ساتواں ٹریبونگ سیمینار ہے۔

سن پہلی بار یہ زیادہ موثر اور نتیجہ خیز طریق کار کے تحت
رہا ہے۔ پہلے سیمینار میں مختلف پیشوں اور حلقوں سے

بستہ لوگ آتے رہے ہیں۔ اس بار یو ایس آئی ایس
 ایلم آباد میں تریک ٹو ڈیپلومیسی کی ان کوششوں میں
 نشتہ اور ملازمین کے بھی گھر گھر جا کر

میں سیں اور ٹاؤن سیتلیں بھی رہی تھیں جن میں
رین۔ ریٹارڈ سفارت کار۔ جزل بھی شرکت
رہے ہیں۔ اس لیے اب دائرہ کار پہلے سے زیادہ

رہے ہیں۔ اس لیے اب یہ ادارہ کار پیمے سے زیادہ
 مع اور بامعنی ہو چکا ہے۔ آج بھی مختلف شعبوں سے
 متہ خواتین و حضرات کو دعوت دی گئی ہے۔ پہلے چھ

سیکورٹی، دفاع، ایٹمی اسلحے کی تخفیف کے موضوعات

آرتھر جیڑی نے پبلک جرنلزم کے حوالے سے اس

ہمارے افادیت پر روتی ڈالی ہے۔ پھر اھوں لے
کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ پاکستانی اور بھارتی
نہ پاکستان اور بھارت۔ کہ درمیان موجود تمام

۷۔ لے پاکستان اور بھارت کے درمیان سوہو دما

دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے اخبارات و رسائل دستیاب ہونے چاہئیں۔

۷۔ تجارت میں اضافے کے لیے بھی تجاویز آئیں۔

سوچ عام لوگوں تک پہنچ سکے لی۔ ان سچے ان
 سیمیناروں کی کارروائی کو خفیہ نہ رکھا جائے۔
 ۹۔ تقسیم قوم کے نام پر تاریخ کو مسخ نہیں کرنا

۹۔ سمیر کوم نے نام پر ماراں کوس میں رہا
چاہیے۔ دونوں طرف ایسا ہورہا ہے۔
۱۰۔ اخبارات جب تک دونوں ملکوں میں

دستیاب نہیں ہیں۔ یو ایس آئی ایسا انتظام کرے کہ ایڈیٹرز کا کم نوٹیس ایک دوسرے کے کالم۔ ادارے

روزانہ پڑھ سکیں۔ اس سے ان کی اپنی تحریر میں
معروضیت پیدا ہوگی۔

۱۱۔ حکومتوں اور عوام کی سوچ اور نقطہ نظر میں یہی
اختلاف ہوتا ہے میڈیا کو چاہیے کہ وہ اس فرق کو واضح

شام کا استقبال بیری والکلے کی رہائش گاہ پر ہے۔
بہت سے پرانے رفقاء سے ملاقات رہتی ہے۔ دانشور،

ادیب، صحافی، سیاسی، اقتصادی ماہرین سب ہی موجود ہیں۔ رہائش گاہ میں پینٹنگز کا انتخاب بہت متاثر

آج کی بحث نے معاملات کو اور واضح کیا ہے۔
 کا کر اجروانگی ہے۔ جہاں جنگ فورم میں تنازعے

۲۷ فروری ۱۹۹۷ء

اپنے شہر میں ایک مسافر کی حیثیت سے وہ اپنی
ہوٹل میں بھی کمرہ ہے۔ لیکن گھریا راگھر۔ جنگ
جنگ ہے۔ عہد تباہی کے تھنے میں میڈیا کا کردار

فورم۔ موضوع "تلاش کے لیے نئی چیلنجز" نے
 ہے۔ ایک دوورقہ بتا رہا ہیں۔ جسے نئی وی چیلنجز نے
 سمٹ کر رکھ دیا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ روزانہ ایک
 رکھ رہے ہیں۔

سمیت کر رہا ہے۔ ایک دوسرے کو جان رہے
دوسرے سے مل رہے ہیں۔

179



کراچی جنوبی ایشیا میں صنعت و تجارت کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اس لیے یہاں یہ بھی بار بار کہا جا رہا ہے کہ دونوں ملکوں کے تاجروں صنعت کاروں کے درمیان روابط بڑھنے چاہئیں۔ ٹی وی چینلوں پر بزنس حلقوں کے درمیان مذاکرات ہونے چاہئیں۔

یہ بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ سیمینار کے فالو اپ کے لیے دونوں ملکوں میں 'رابطہ کمیٹیاں' تشکیل دی جائیں۔ جن کے مراکز ایک طرف لاہور، کراچی، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ میں دوسری طرف دہلی، بمبئی، کلکتہ، چندی گڑھ، مدراس اور کھننور میں قائم ہوں۔ سیمینار کے معاملات کو زیادہ باقاعدہ شکل دینے کے لیے کمیٹی کے ارکان دونوں ملکوں میں مالکان اخبارات و رسائل کی نمائندہ، انجمنیں نامزد کریں۔ اور موجودہ سابقہ سیمیناروں کی رپورٹیں کتابی شکل میں تیار کی جائیں اور دونوں ملکوں کے بڑے اخباروں، رسالوں اور چینلوں کے ایڈیٹروں، نیوز ایڈیٹروں، اہم کالم نویسوں کو فراہم کی جائیں۔ یہ رابطہ کمیٹیاں سال بھر دونوں ملکوں کے میڈیا کے درمیان فعال واسطہ رکھیں۔ مختلف اخبارات اور چینلوں کے مذاکروں، خبروں، اداروں سے متعلقہ تراشے اہم اخبارات کو فراہم کرتے رہیں۔

یو ایس آئی ایس نے جس طرح یہ پہل کی ہے۔ وہ اس طرح ایک پل کا کردار ادا کرتی رہے۔

شام کا استقبال امریکی حکمہ اطلاعات کی ڈائریکٹر بیڑی شاربپ کی رہائش گاہ پر ہے۔ اس کے بعد عشاءِ سندھ اسپکی کے ارکان غلام قادر پٹیجو اور اقلیتی ممبر مہرمل جاگوانی کی طرف سے ہے۔ جہاں محفلِ رقص و نغمہ بھی ہے۔ رقص اس قدر دلربا ہیں کہ ہمارے کچھ سیمینار شریک بھی محو رقص ہو گئے ہیں۔ سید جاوید اقبال اسے ٹریک تھری ڈپلومیسی کہہ رہے ہیں۔ خاتون شریک بھی لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ اگلی صبح روانگی ہے۔ پاکستان کے حصے کا سفری سیمینار انجام کو پہنچ رہا ہے۔

ہیں۔ یہ رابطہ سرکاری تعلقات اور ڈپلومیسی سے زیادہ موثر ہو رہے ہیں۔ اس لیے ٹریک ٹو ڈپلومیسی زیادہ کارگر ہو رہی ہے۔ امریکی حکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام پاکستان اور بھارت میں ٹریولنگ سیمینار اس سلسلے کی ٹرڈی ہے۔ یہ پروگرام ۱۹۹۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور اس نے مختلف موضوعات پر دونوں متحارب ملکوں کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد اور حلقوں کو قریب تر لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

آج مجھے دس منٹ تک اظہارِ خیال کرنا ہے۔ ہوم گراؤنڈ پر کھیلنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اسلام آباد سے کراچی سفر کے دوران میں نے گزشتہ دو دنوں کی بحث کی روشنی میں کچھ خیالات ترتیب دے لیے ہیں۔ لیکن جہاز سے اترتے وقت وہ اسی میں بھول گیا ہوں۔ اب پریشانی ہے۔ پی آئی اے کے شعبہ تعلقات عامہ کے چوہدری بشیر احمد یاد آرہے ہیں۔ انھیں فون پر زحمت دی ہے ہمیشہ کی طرح انھوں نے مشکل آسان کر دی ہے۔ کاغذات مجھے فورم کے آغاز سے پہلے ہی مل گئے ہیں۔

شہر کی مختلف شخصیتیں موجود ہیں۔ کچھ یو ایس آئی ایس اور کچھ 'جنگ' کے حوالے سے مدعو کی گئی ہیں۔ ان میں وکلا بھی ہیں۔ سیاست دان بھی۔ اساتذہ بھی۔ دانشور بھی سب وطن کا درد رکھتے ہیں۔

سیمینار کے شرکا اب چند روز کی بحث کے بعد اگرچہ ایک ٹیم بن چکے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے تعصبات میں کوئی زیادہ کی نہیں آئی ہے۔ کشمیر کے مسئلے پر بھارتی مندوبین کچھ زیادہ چمک کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ واپس اپنے انہی لوگوں میں جانا ہے۔ وہاں کیا جواب دیں گے، اس کے لیے بڑی ہمت چاہیے۔ اسی ذرا اور بھجوتے میں پورے ۵۰ سال گزر رہے ہیں۔

زیادہ تر شرکا اور سامعین کا زور اس پر ہے کہ تاریخ کو سن کر کیا جائے۔ اخبارات و رسائل کا آپس میں تبادلہ ہونا چاہیے۔ ویزے کی شرائط کم سے کم کی جائیں۔ جنوبی ایشیا کے مسائل پر لگتے ہوئے دونوں طرف کے اخبار نویس، کالم نگار، ایڈیٹوریل رائٹرز، خود ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں۔

اس سیمینار کے اختتام پر وزیر خارجہ نے خطاب کیا۔ انہی سیمینار کے اختتام پر وزیر خارجہ نے خطاب کیا۔

حسرت ناقصہ!



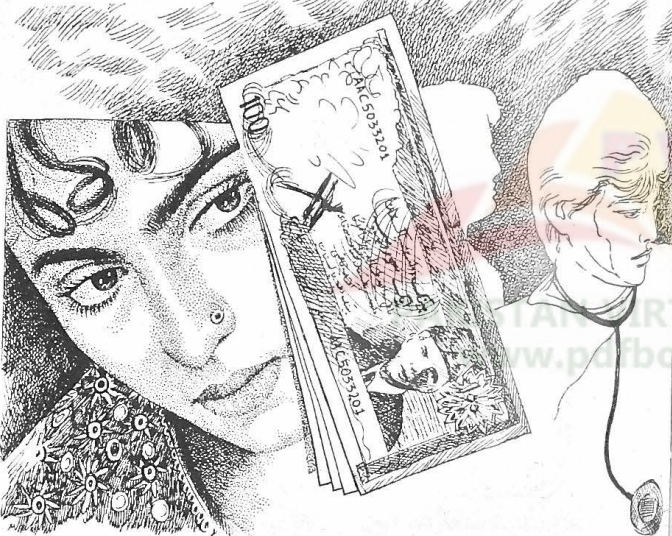
ممتاز احمد

اُس دوشیزہ کی زندگی، ایک حسرت ناقصہ بن کر رہ گئی تھی
وہ آج بھی ایک اسپتال میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جی رہی ہے

میرے والدین کی دو اولادیں ہیں ایک میں یعنی مسرت اور مجھ سے بڑا بھائی دلاور۔ ہماری رہائش عنایت پور گاؤں میں تھی۔ میرے ابو اپنے والدین (میرے دادا، دادی) کی اگلی اولاد تھے تو اسی وجہ سے دادا میرے ابو سے بہت پیار تھا۔ گاؤں میں دو مہرے زمین تھی اور کاشتکاری کے لیے اور زمینیں پر کام کے لیے مزید سے رکے ہوئے تھے۔ زندگی بہت خوش حالی سے گزر رہی تھی۔ بڑا سا گھر تھا اور گھر میں بھی کام کاج کے لیے نوکرانیاں تھیں۔ میرے ابو کو گھر سوار کی کاجون کی حد تک شوق تھا۔ وہ نیزہ بازی اور گھڑ سواری میں بہت مشتاق تھے۔ انھوں نے کئی قسم کے گھوڑے پال رکھے تھے۔ ہر سال نیزہ بازی اور گھڑ دوڑ میں باقاعدگی سے حصہ لیتے اور انعام جیت کر لاتے۔ میرے ابو انتہائی خوب صورت گورے جتنے بے قد کے ساتھ وجہ ہر جوان تھے۔ انتہائی رعب دار شخصیت کے مالک تھے وہ ہمیشہ بوکی کی میٹھ اور لٹھے کی شلوار پہنتے۔ عجیبی طور پر وہ مردانہ وجاہت کی عملی نمونہ تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں ابو کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتیں اور رشیدی آہیں بھرتی تھیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ ابو کی دلہن بنے۔ مگر ابو کو کبھی کھاس نہ ڈالتے تھے۔ میری اسی ساتھ والے گاؤں سمٹھ پنڈ کے چوہدری نواز شکی کی بیٹی تھیں۔ اسی شادی کے ایک سال بعد دلاور بھائی پیدا ہوئے اور

نہاں بعد میری پیدائش ہوئی۔ میرے امی ابو کے لیے دلاور کی اولاد نہ ہوئی۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا امی ابو کی محبت میں دن دن اضافہ ہوتا گیا۔ شہر میں ہر سال میلہ منڈی لگتی تھی جس میں دیگر رنگارنگ پروگراموں کے ساتھ نیزہ بازی اور گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے تو ابو ہر سال باقاعدگی سے ان مقابلوں میں حصہ لیتے تھے اور شرکت کے لیے دو ماہ پہلے بھر پور تیاری شروع کر دیتے۔ چنانچہ

گر پڑے اور پیچھے سے آنے والے تیز رفتار گھوڑوں نے انھیں روند ڈالا۔ آنا فانا ابو کی موت واقع ہو گئی۔ ابو کی جب خون میں لاپتہ رہ گئی تو امی ابو کی محبت میں آئی تو ان کی میت کو دیکھتے ہی امی کو شدید ہارٹ ایکٹ ہوا اور اگلے ہی لمحے وہ چکر کمرز میں گر گئیں۔ اور گرے ہی ان کی روح نفسِ عسری سے پرواز کر گئی۔ جب وہ جنازے اکٹھے اٹھائے گئی تو پورے گاؤں میں کراہ مچ گیا ہر آنکھ تنکبار تھی۔ ہمارے دادا، دادی اس



صدے سے نڈھال ہو گئے تھے ان کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ اس وقت دلاور کی عمر پندرہ سال اور میری بارہ سال تھی۔ اب دادا دادی نے ہماری پرورش شروع کر دی۔ کہتے ہیں اولاد کی عمر بدلتی ہے پیارے ابو کی موت ہوئی تو وہی وجہ کی کہ ہم دونوں بہن بھائی دادا دادی کی آنکھوں کے تارے بن گئے۔ دوسرا یہ کہ ہم بچپن میں یتیم ہو گئے تھے تو ہمارا بہت خیال رکھا جاتا، ناخن رے اٹھائے جاتے کہ ہمیں ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہو۔

اس سال بھی ماہ اپریل میں میلہ منڈی کا انعقاد ہوا تو ابو مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اپنے ملازموں اور گھوڑوں کے ساتھ شہر گئے مگر یہ مقابلہ ان کی زندگی کا آخری مقابلہ ثابت ہوا تھا۔ ابو کا گھوڑا میدان میں سر پٹ بھاگ رہا تھا اور انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتے دوڑتے سب سے آگے جا رہا تھا کہ اچانک ان کے گھوڑے گھڑ گئی اور وہ گر گیا۔ جس کے نتیجے میں گھوڑے کے ساتھ ہی ابو بھی بری طرح زمین پر

جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو ایک دن دادی بھی ہمیں داغ مفاہمت دے گئیں۔ اس وقت میں نوے بیس برس کی تھی۔ گوکہ کہیں کام کاج کے لیے نوکریاں موجود تھیں۔ مگر اب گھر کو میں نے سنبھالنا تھا۔ چنانچہ میں نے گھر داری کی ذمہ داری سنبھالنے شروع کر دی۔ اسکول بھی باقاعدگی کے ساتھ جاتی اور گھر کے کام کاج میں بھی حصہ لیتی اور اس طرح کرتے چڑتے میں نے میزگر کر لیا۔ دلاور توڈل کے بعد ہی اسکول کو خیر آباد کہہ چکا تھا۔ اس کا زیادہ وقت آوارہ گردی میں گزرتا۔ دراصل دادا، دادی کے لاڈ پیارنے اسے لگاؤ دیتا تھا۔

اب وہ اٹھارہ سال کا جوان تھا، کسی کو خاطر میں نہ لاتا، برسے دوستوں میں اس کا ٹھنڈا پینٹھا تھا، جس کی وجہ سے اس کی عادتیں بہت خراب ہو گئی تھیں۔ کام کاج کرنے کی بجائے اس نے بڑے مشاغل اختیار کر لیے تھے۔

اس نے دادا کی زندگی میں ہی کسی نہ کسی طریقے سے ساری زمین اپنے نام کر رکھی تھی اور رفتہ رفتہ آدھی سے زیادہ زمین تاجی اور درم اپنی عیاشیوں کی نظر کر دی۔ دادا جان بہت پریشان رہنے لگے۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ دلاور سدرھ جائے مگر وہ سدرھنے کی بجائے دن بدن بگڑتا گیا۔ ایک تو دادا جان بہت بوڑھے ہو گئے تھے، دوسرا جوان سال ہی بنے اور بھوک اپنا چمک موت سے اُن کو بہت صدمہ ہوا تھا، میرا دادی جان بھی ان کو چھوڑ گئی تھیں اور چوتھا دلاور بے براہ روی اور زمین کے کب جانے کا ان کو بہت غم تھا تو وہ بے چارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے اور بیمار رہنے لگے۔

دلاور کی کنی دلی گھر نہیں آتا تھا ہم اس کی راہ دیکھتے رہتے۔ میزگر کے بعد میں نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ اب بچہ دلوں سے مجھے بخار رہنے کا تھا۔ پہلو تو کلاؤں کے تحسیر سے علاج ہوتا ہر ماہگر آرام نہ آیا۔ پھر گاؤں کے ڈسپنری (پھوڑ ڈاکٹر) کا علاج شروع کر دیا۔ اس کی دوا سے دلی طور پر بخار آتا جاتا مگر پھر بخار شدت اختیار کر جاتا۔ جب کوئی افادہ نہ ہوا اور بخار کے ساتھ اب میرے جواڑوں میں بھی درد شروع ہو گیا۔ جسم بہت کمزور ہو گیا تو ڈسپنری نے مشورہ دیا کہ میرے گھر کو شہر کے بڑے

ہسپتال میں لے جائیں چنانچہ اگلے روز دادا جان مجھے اپنے ساتھ شہر لے جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ ریلوے اسٹیشن ہمارے گاؤں عنایت پور سے پانچ کلومیٹر دور تھا۔ دادا جان نے شہر کے دو گتے لیے اور ہم پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین آگئی تو ہم گاڑی میں سواری ہو گئے۔

ہمارے گاؤں سے شہر کافی دور تھا اور ٹرین پورے پانچ گھنٹے میں شہر پہنچتی تھی۔ گاڑی چل پڑی۔ یہ گاڑی پتھر پٹریں نہیں ایکسپریس ٹرین تھی۔ ہر اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی کیڑا اسٹیشن آتا تو دیر یا تین منٹ کے لیے رکتی اور پھر چل پڑتی۔ مجھے کچھ بھوک لگ رہی تھی اور بوتل پینے کو بھی دل کر رہا تھا تو میں نے دادا جان سے فرمائش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکنے کی تو وہ میرے لیے بوتل اور کھانے کی کوئی چیز لا دیں گے۔

ٹرین کو ہمارے گاؤں عنایت پور سے چلے ہیں گھنٹے ہو چکے تھے۔ ابھی پورے دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ گاڑی اپنی رفتار سے منزل کی طرف گامزن تھی۔ ہمارا کاموسم تھا کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ جو بہت پسلی لگ رہی تھی۔ مجھے اُدکھ آنے لگی تو میں اپنی سیٹ پر بیٹھ بیٹھ سو گئی۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ سوئی رہی۔ جب اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھا بہت مہربانے مسافر کپار غنٹ میں نہیں تھے اور دادا جان بھی میری سیٹ پر موجود نہیں تھے۔ میں بھی شاید دواں روم گئے ہوں۔ ٹرین تیز رفتاری سے چل رہی تھی جب کافی دیر کے بعد دادا جان نہیں آئے تو میں نے جا کر دواں روم دیکھا تو وہ خالی تھا پھر پورے ڈبے کا چکر لگایا مگر دادا جان نہیں نظر نہ آئے تو میں نے اپنی سیٹ کے قریب بیٹھے ایک مسافر سے دادا جان کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ پچھلے اسٹیشن پر جب ٹرین رکھی تو تمہارے دادا جان دوسرے مسافروں کے ساتھ نیچے پلیٹ فارم پر اترے تھے مگر وہاں نہیں آئے اس نے سمجھا تھا کہ انھوں نے یہیں اترنا تھا۔ میں نے جب یہ سنا تو میرے ہوش اُڑ گئے اور میں سخت پریشان ہو گئی۔ جب میں سو رہی تھی تو مجھے بتائی نہ چلا کہ کوئی اسٹیشن آیا اور گاڑی رکی تو دادا جان پہنچے۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے کوئی چیز کھانے اور بوتل نہ لیا تھی کی تو یقیناً دادا جان وہی لینے کے لیے نیچے آئے ہوں گے۔ مگر اب پریشانی یہ تھی کہ وہ وہاں پس کیا نہیں آئے۔

میرا توخت دل گھبرانے لگا کہ اب کیا بنے گا میرے ابا نوک دیر دیر یہیں تھا اور گت بھی دادا جان کے پاس تھے۔ اب میں کہاں جاؤں گی، کیا ہوگا؟

انہی سوچوں اور گھبراہٹ میں میرے آنسو نکل آئے۔ میں گم گم اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پندرہ منٹ کے بعد ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور آہستہ آہستہ ایک اسٹیشن پر رکی مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ دادا جان غلطی سے کسی دوسرے ڈبے میں نہ بیٹھ گئے ہوں۔ اب ٹرین رکی ہے تو شاید وہ آجائیں میں اُن کا انتظار کرنے لگی۔

مگر دادا جان تو میں آئے البتہ اس ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب آگئے اور ڈبے میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے میرے پاس آ کر رک گئے اور مجھ سے پوچھا کہ بیٹی آپ کا نام کس ہے؟ پہلو تو میں چندھوں کے لیے ڈر گئی اب ان کی طرف دیکھا تو وہ ریلوے کے سرکاری یونیفارم میں تھے اور ان کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس بیچیں لگایا تو میں نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ بیٹی میرا نام مسرت ہے۔ اس پر انھوں نے پوچھا کہ بیٹی آپ کہاں سے آ رہی ہو؟ میں نے بتایا کہ عنایت پور سے آ رہی ہوں۔ تو وہ کہنے لگے تمہارے دادا جان پچھلے اسٹیشن پر روکے گئے ہیں اور ان کے پاس سے پہلو گاڑی چل پڑی ہے تو وہ بہت پریشان اور فکر مند ہیں اور پچھلے ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب کے دفتر میں بیٹھے ہیں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب نے مجھ کو ان کے پاس لے کر دیا ہے۔ میرا نام انور ہے اور میں یہاں کا اسٹیشن ماسٹر ہوں تو بیٹی گھرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تو آپ میرے ساتھ آ جاؤ۔

پھر انھوں نے میرا ہانگ اٹھایا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنے دفتر میں لے آئے۔ جس ٹرین سے میں اُترتی تھی اس کو انھوں نے روانہ کر دیا۔ اور ساتھ ہی پچھلے ریلوے اسٹیشن ماسٹر کو نوں کیا اور بتایا کہ مسرت بیٹی کو میں نے ٹرین سے اتار لیا ہے اور وہ میرے پاس بیٹھی ہے۔ اور میری بات دادا جان سے کر دوائی تو دادا

جان نے مجھے تسلی اور دلاسا دیا کہ پریشان نہیں ہونا تم انور صاحب کے ساتھ ان کے گھر چلا جاؤ۔ وہ بھی صبح آ جاؤ گے کیونکہ اب آنے کے لیے یہاں سے کوئی بس، ویکن یا ٹرین نہیں ملے گی تو وہ کل صبح پہلی ٹرین سے پہنچ جائیں گے۔

اس طرح انور صاحب مجھے اپنے گھر لے آئے کیونکہ پچھلے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب نے انور صاحب کو ٹرین پہنچنے سے پہلے فون کر دیا تھا کہ مسرت نامی جوان لڑکی ٹرین میں تمہارا گئی ہے۔ اس کے دادا ٹرین میں سوار نہیں ہو سکے تو وہ مسرت کو اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ اسی طرح دادا جان کو وہ اسٹیشن ماسٹر صاحب اپنے گھر لے گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ انور صاحب اس ریلوے اسٹیشن پھول نگر کے اسٹیشن ماسٹر تھے۔ پھول نگر ایک قصبہ تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر انور صاحب کا گھر تھا۔ جب میں انور صاحب کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو ان کی بیوی اور تین بیٹیوں نے بڑی حیرانگی کے ساتھ دیکھا تو انور صاحب نے فوراً مختصر طور پر انھیں میرے بارے میں بتا دیا۔

اس پر ان کی بیوی آگئی جیلہ نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ان کی تینوں بیٹیوں نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور مجھے سہی بٹھا کر چائے پانی پلایا۔ انور انکل کی بیوی نے ختم ہو چکی تھی تو وہ بھی یونیفارم تبدیل کر کے کمرے میں آ گئے۔ انکل انوری کی صرف تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی شکیلہ بیوی، مگر عمر کسی سے چھوٹی نہ تھافتہ تیری اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام انیلا تھا۔

باتیں شروع ہوئیں تو میں نے انھیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ دادا جان کے ساتھ علاج کے لیے شہر جاری تھی۔ آگئی جیلہ میرے ساتھ ہی تھی میں تو انھوں نے بڑے پیار سے مجھے اپنے ساتھ لگایا اور کہنے لگیں کہ مسرت بیٹی اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ بالکل بھی پریشان نہیں ہونا۔ جب انھوں نے مجھے چھو تو میرا جسم بہت گرم تھا تو وہ کہنے لگی۔

ارے تمہیں تو بہت تیز بخار تھا۔ وہ ہو چلا بیٹی لیٹ

جاؤ اور پوچھا کہ کوئی میڈیسن یا س ہے؟ تو میں نے کہا۔
آئی تقریباً ایک ماہ سے بخار جان نہیں چھوڑ رہا سی
کے علاج کے لیے ہی تو شہر جا رہی تھی۔ فی الوقت میرے
پاس تو کوئی میڈیسن نہیں ہے۔

اس پر وہ بہت فکر مند ہوئیں اور انکل انور سے کہنے
لگیں کہ پتا کریں ڈاکٹر ابوذر کا کلینک کھل گیا ہوگا۔ اس
سے بچی کی دوائیں آئیں۔ تو انکل کہنے لگے کہ ابھی ٹیلی
فون کرتا ہوں۔ جب انھوں نے فون کر کے میری کیفیت
بتائی تو ڈاکٹر ابوذر نے کہا کہ مرینٹھ کو کلینک پر لے
آئیں۔ چیک آپ کے بعد میڈیسن دوں گا۔
چنانچہ آئی جیل اور انکل انور نے مجھے اپنے ساتھ
لیا ایک ٹانگے پر بٹھا کر کلینک لے گئے۔ ڈاکٹر ابوذر نے
بنور تفصیلی چیک آپ کیا۔ بخاری ہسٹری اور دیگر علامات
پوچھیں تو کہنے لگا کہ بخار پرانا ہے کچھ ٹیسٹ کروانے
پڑیں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے پرچی پر ٹیسٹ لکھ کر دیے اور
لیبارٹری میں بھیج دیا جہاں سرخ کے ذریعے میرا خون کا
نمونہ لیا گیا اور کہا گیا کہ رپورٹ کل ملے گی۔ تو ڈاکٹر
ابوذر نے وقتی آرام کے لیے ایک انجکشن لگا دیا اور کھانے
کے لیے میڈیسن دی اور انکل انور رپورٹ لے کر آنے کا
کہا تو انکل اور آئی مجھے کھر لے آئے۔
میں نے ہلکا چمکا کھانا کھا کر میڈیسن کھائی تو تھوڑی
دیر بعد مجھے نیند آگئی۔

صبح جاگی تو طبیعت کچھ بہتر محسوس ہوئی۔ صبح سو بجے
دادا جان بھی پھول کر پیچ گئے تو انکل انور انھیں بھی گھر
لے آئے۔

میں دادا جان کے گلے لگ کر رونے لگی کہ آپ کدھر
رہ گئے تھے تو انھوں نے پہلے مجھے چپ کروایا۔ اور بتایا
کہ تم فرین میں سو گئی تھیں۔ تو ایک انجکشن پر گاڑی رکھی
تھیں چکانا مناسب نہ سمجھا اور تھارے لیے بوس اور کچھ
کھانے کی کٹی چیز لینے کے لیے فرین سے اتر کر ریلوے
اسٹیشن سے باہر آیا۔ جب دن پر پہنچا تو مجھے اچانک چکر
آئے تو میں گر گیا دکاندار نے مجھے فوراً پانی پلایا تو کچھ
طبیعت سنبھلی اس نے مجھے کرسی پر بٹھادیا۔ جب پھر آنے
بند ہوئے تو میں نے تمہارے لیے بوس اور کچھ پھل لیے

اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر آیا تو دیکھا فرین جا چکی
تھی۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تو بہت
پریشان ہو گیا۔ پھر اس اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب
سے ملا تو انھوں نے مجھے تسلی دی اور بتایا کہ اب وہ فرین
پھول کر ریلوے اسٹیشن پر کر کے تو میں اس کے اسٹیشن
ماسٹر انور صاحب کو فون کر دیتا ہوں۔ پھر مجھ سے فرین کی
بوٹی، سیٹ اور تمہارا حلیہ پوچھا تو اسی طرح جب انور
صاحب نے تمہاری مجھ سے ٹیلی فون پر بات کرائی تو
مجھے حوصلہ ہوا تو اب چلی ٹرین سے یہاں پہنچ گیا ہوں۔

آئی جیلہ نے دادا جان کو چائے وغیرہ پلائی اسی
اشاء میں انکل انور لیبارٹری سے میرے بلڈ ٹیسٹ کی
رپورٹ بھی لے آئے تو پتہ چلا کہ بخار، دادا جان اور انکل انور
ڈاکٹر ابوذر کے کلینک پر پہنچے۔

ڈاکٹر نے رپورٹ دیکھ کر بتایا کہ مناسب علاج اور
تفتیش نہ ہونے کی وجہ سے بخار بگڑ گیا ہے اور
ناغیانہ ہو گیا ہے۔ جس کا کم از کم چودہ دن لگا تا علاج
ہوگا اور بلا ناغہ میڈیسن کھانی ہوگی۔ کبھی غذا کھانی ہے اور
دفعہ مکمل ریٹ کرتا ہے اور ایک ہفتے کے بعد دوبارہ
چیک آپ کے لیے آتا ہے۔ ڈاکٹر نے دوا کا نسخہ دیا۔

اس کے بعد دادا جان نے اپنے سر پکڑانے کا بتایا تو
ڈاکٹر نے ان کا بلڈ پریشر چیک کیا اور بتایا کہ آپ کا
بلڈ پریشر بہت ہائی ہے جس کی وجہ سے آپ کو پکڑ آتے
ہیں۔ دادا جان کو بھی دوا لکھ دی کہ روزانہ بلا ناغہ کھانی
ہے۔ انکل انور نے بتایا کہ ڈاکٹر ابوذر بہت سیانا، ہمدرد
اور اچھا ڈاکٹر ہے اب اسی کا علاج شروع کر دیں آپ
کو شہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

انکل انور نے ہمیں دوپہر کا کھانا کھلا دیا دادا نے ان
کے پورے گھر کا شکر یہ ادا کیا تو یہ ہے کہ مجھے ان کے
گھر سے بہت اپنائیت، پیار اور خلوص ملا۔ ان کی سب
سے بڑی بیٹی شکیلہ تو میری ٹیلی بیٹی بن گئی۔ ایک تو وہ میری
ہم عمر تھی دوسرا بہت سچی ہونم و ناز کی بہت پیاری
تھی۔ پورا گھر اتنا بہت اچھا تھا ہم ان کے حسن سلوک
اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔ کھانے کے بعد دوپہر
واپسی کی اجازت تھی تو انکل انور نے تاکید کی کہ ہفتے
بعد لازمی چیک آپ کروانا ہے۔ دادا جان نے وہیں سے

اپنی اور میری میڈیسن خرید لی۔
انکل انور نے ہمیں دوپہر والی ٹرین میں بٹھادیا تو
نام تک ہم گھر پہنچ گئے۔

☆☆☆

ہم دادا بوٹی نے ڈاکٹر کے نسخے کے مطابق میڈیسن
کھانی شروع کر دی۔ ایک ہفتے کے علاج سے مجھے بہت
افادہ ہوا۔ میری صحت بحال ہو گئی۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے
مطابق ہم دادا بوٹی دوبارہ پھول کر گئے۔ ڈاکٹر نے ٹیلی
سے ہمارا چیک آپ کیا۔ آج میں نے ایک خاص بات
نوٹ کی وہ یہ کہ ڈاکٹر ابوذر مجھ پر کچھ زیادہ مہربانی
رہا تھا۔ اس کا پر اشتیاق اور محنت بھری نظروں سے مجھے
دیکھا اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ مجھے کچھ اچھا بھی
لگا۔ پھر دادا بوٹی میں شرماسی رہی تھی۔ ڈاکٹر ابوذر نے دادا
جان کا بھی بخار حال پوچھا اور ان کا تفصیلی معائنہ کیا۔
انھیں دوا مستقل جاری رکھنے کی ہدایات دیں۔ اسی طرح
مجھے مزید ایک ہفتہ بلا ناغہ دوا کھانے کی تاکید کی اور
انگل ہفتے پھر آنے کو کہا۔ ہم انکل انور کے گھر آ گئے تو
پورے گھرانے نے ہمیں رات رہنے کے لیے روک لیا۔
مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر ابوذر پیار
بھری نظروں سے مجھے کیوں بار بار دیکھ رہے تھے۔

جب میں نے قدم آدھے آدھے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے
آپ کو دیکھا تو مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ میرے
والدین دونوں ہی بے انتہا خوب صورت تھے تو خوب
صورتی اور حسن تھے کبھی وراثت میں ملتا تھا۔ میں سر سے
پاؤں تک سن کا جسم تھی۔ مجھ پر جوانی ٹوٹ کر آئی تو
ڈاکٹر ابوذر کا پیار سے مجھے دیکھنا تھا۔

رات گیارہ بجے تک ہم جاگتے رہے۔ آئی جیلہ،
ٹکلی، جگنمات اور انیلا سے خوب باتیں اور سی مذاق ہوتا رہا
جب میں سونے کے لیے لیٹی تو نیند میری آنکھوں سے
کسوٹن دوڑ گئی۔ ڈاکٹر ابوذر کا سر ابا میری آنکھوں کے
سامنے تھا۔ ڈاکٹر ابوذر کی عمر ستائیس سال تھی کھنگرے بالے
بال اور رنگ لبا دکھتے خوب صورت تین نقش بلاشودہ ایک
دوہونہ جو ان تھا۔ اوپر سے اس کا اچھا اخلاق، ہنسنے لہجہ
میں بات کرنا یہ سب مجھے میرے دل کو بھگا گیا تھا۔ رات
سوئے جاتے گزری۔

صبح ہوئی سب سے مل کر ناشائیا آج واپس گھر جانا
تھا مگر میرا گھر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ
آج پھر ڈاکٹر ابوذر کو روک سکیوں۔

جب دادا جان نے واپسی کے لیے کہا کہ تیار کی کرو
تو میں نے بہانہ بنایا کہ پیٹ میں درد شروع ہو گئی ہے
اور جھوٹے سوٹے درد کی ادکاری شروع کر دی تو دادا جان
فکر مند ہوئے کچھ تپا کر فیصلہ ہوا کہ شام ڈاکٹر ابوذر
کے کلینک سرت کو لے کر جائیں گے۔

ڈاکٹر ابوذر دن کو سا کھادے شہر کے سرکاری ہسپتال
میں بطور میڈیکل آفیسر ڈیوٹی کرتے تھے۔ اور شام کو
پھول کر گئیں اپنے پرائیویٹ کلینک میں مریضوں کا علاج
کرتے تھے۔

الغرض شام کو دادا جان مجھے اس کے کلینک لے گئے
تو مجھے دیکھ کر ڈاکٹر ابوذر کھل اٹھے۔ دادا جان نے اسے
بتایا کہ سرت کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا ہے۔ جب
ڈاکٹر مجھے کاؤچ پر لے کر لیٹھوا اوپر سے چیک آپ کیا
تو اسے اعزاز ہو گیا کہ مجھے درد نہیں ہے۔

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو
میں نے مسکرا کر کہا کہ صبح تو تھا درد مگر اب بتائیں کیوں
ٹھیک ہو گیا ہے۔

اس پر ڈاکٹر ابوذر نے بھی مسکراہٹ کے ساتھ
جواب دیا۔ اوکے کوئی بات نہیں میں سمجھ گیا ہوں۔
چنانچہ اس نے بتایا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اصل میں
بخاری چودا کھاری ہیں ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے درد
ہو گیا ہو۔

اس نے نسخے میں ایک گولی کا نام لکھ کر دیا اور کہا کہ
اگر دوبارہ درد ہو تو یہ گولی کھالیں۔
انگل دن میں دادا جان کے ساتھ واپس اپنے گاؤں
عبادت پور آگئی۔

☆☆☆

چک چمکتے ہی ہفتہ گزر گیا۔ میں نے چودہ دن
مسل میڈیسن کا کورس کیا اب میں مکمل طور پر صحت
یاب تھی۔ دادا جان کو کچھ ضروری امور پتہ نہ تھے اس
بازار کی جگہ بھائی دلاور میرے ساتھ آیا۔ حسب معمول
ہم ریلوے فرین کے ذریعے پھول کر پہنچے۔ اسٹیشن پر

اتر کر سیدھے انکل انور کے آفس گئے پھر وہ ہمیں ساتھ لے کر گھر آ گئے۔ دلاور بھائی کو ذرا تنگ روم میں بٹھا دیا اور میں آئی جیلہ کے پاس بیٹھ گئی۔

انکل انور، آغنی جیلہ اور ان کی تینوں بیٹیاں بہت چچی تھیں۔ شکیلہ تو میری کچی سہیلی بن گئی تھی۔ توں باتوں میں پتا ہی نہ چلا شام ہو گئی تو دلدار بھائی کے تھڑا کٹر ابو ذر کے کلینک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر ابوذر نے بخار وغیرہ چیک کیا اور بتایا کہ مسرت اب آپ مکمل صحت یاب ہو گئی ہیں۔ لہذا لیسن کھانا بند کر دیں۔

میں نے ڈاکٹر ابو ذر کا شکریہ ادا کیا کہ میں آپ کے
ج سے ٹھیک ہوئی ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ ادا
کہ آپ تو ٹھیک ہو گئی ہیں مگر مجھے بیمار کر کے
ہی ہیں۔

میں نے حیرانگی سے پوچھا جی..... یہ کیا کہہ رہے
آپ؟

تو اس پر ڈاکٹر نے کہا کہ بہت بڑی مرض میں مبتلا
 پایا ہے میں نے اسے۔

پھر اس نے ایک مٹی دامن کا شربت لکھ کر دیا اور کہا دو یا تین دن روزانہ ایک چمچ پینا ہے اور مجھے فون کے بتانا ہے کہ شربت سے کیا اثر ہوا۔ ڈاکٹر کا پی پی مل فون نمبر نسخہ پر موجود تھا۔

جب میں واپس آنے لگی تو ڈاکٹر بہت اداس لگ رہے
- جبکہ میں بھی اندر سے اداس ہو رہی تھی - ہم انکل انور
عمر آگئے اور رات کا کھانا ہم سب نے مل کر کھایا۔

دلاور بھائی بڑے غور سے چوری چوری شکلیہ کو
تہرے۔

شکلیہ ہی ہی بڑی پیاری نرم و نازک سی کوئل سی بہت
بصورت۔

اٹھے دن ہم دونوں بہن بھائی بذریعہ ٹرین واپس
نئے گاؤں آ گئے۔

تین دن کے بعد میں نے اپنے گاؤں کے نمبردار
 سے شام کو ڈاکٹر ایبوزر کو فون کیا تو میری آواز سن کر
 خوش ہوئے۔ میں نے یہ بھیجا۔

جناب ڈاکٹر صاحب ذرا یہ تو بتائیں کہ میں نے آپ کو کون سے مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔

لوہہ بڑے رومانٹک موڈ میں بولا آپ کی محبت کا مرض لائق ہو گیا ہے۔ میں آپ کا مریض عشق بن گیا ہوں۔ پھر انھوں نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا کہ مس سرت آپ کو پیٹ درد نہیں تھا تو بہانہ کیوں بنایا تھا۔ کپڑے ساخت میرے منہ سے نکلا۔

وہ اپنی محبت کا درد تھا۔
 یہ سن کر ڈاکٹر ٹھٹھکا کہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ اچھا!
 آگ ہے دونوں طرف برابر لگی ہوئی۔ چنانچہ یہیں سے
 ہماری محبت کا آغاز ہو گیا۔

اب میں ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی بہانے
برادر کے گھر جا کر ڈاکٹر ابوزر سے بات کرتی۔ پھر
برے اصرار پر دادا جان نے بھاجا دوزکر کے گھر میں
لی فون لگوا لیا تو ساری ساری رات ڈاکٹر ابوزر سے
دوب باتیں ہوئیں۔ اکٹھے سرنے جینے کی عہد کیے جاتے
دو پھر اسی روشنی میں چہ چہ گزر گئے۔

ایک دور ان میں پانچ چھ بار دل اور بھائی کے ساتھ
بول گزرا کٹر ابو ذر کو سننے لگی۔ ظاہر ہے بیماری کا کوئی نہ
کوئی بہانہ بنانا پڑتا تھا۔ اسی عرصے میں دو تین بار انفل
و اور ان کی پوری فیملی بھی بیمار ہو گئے۔

شکیلہ اکثر ایوز کے ساتھ میری محبت سے واقف تھی۔ وہ اکثر ایوز کا نام لے کر مجھے چھیڑتی رہتی تھی۔ ادھر دلدار بھائی بھی شکیلہ کی محبت میں پورے دل سے چپکے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے رہتے تھے کہ دادا جان کے ساتھ جا کر شکیلہ کا رشتہ مانگو اور اسے اپنی بھابی بنالو تو کب کب دلدار بھائی شکیلہ تو بی اے پاس سے اور آپ

ہر گز جماعت پاس ہو اور دوسرا کرتے بھی کچھ نہیں
 سارا دن آوارہ گردی کرتے ہو۔ کئی کئی گھنٹہ نہیں
 تے تو ان حالات میں آپ کو کیسے رشتہ مل سکتا ہے شکیلہ
؟ اگر آپ کو شکیلہ پسند ہے تو پہلے اپنی عادتیں
 سست کرو۔ اپنے آپ کو بدل لو۔

مہلات دیکھنے لگا۔ آوارہ گردی چھوڑ دی اور کافی سلجھ گیا۔ یہ ساری تبدیلی صرف شکلیہ کو پانے کے لیے تھی۔

اپنے لگے تھے۔ وہ بھی جلد از جلد مجھے اپنا لینا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنے ابو امی کو بھیجو میرا رشتہ اٹھنے کے لیے۔

چنانچہ ایک دن اہل الور کا خون آ لگا دیا اور ابوہریرہ

گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر ابوذر کے اسی ابوالحسن کے
دروں میں انکل انورا اور ادنیٰ جیلے آ گئے۔ میں
انتہا حسین و جمیل خوب صورت توپیلے ہی تھی اور پتے
خاص تیار، ایک اپ وغیرہ نے میرے حسن کو چھ
چاند لگا دیے۔ مجھے پسند کر لیا گیا ڈاکٹر ابوذر کی امی
دروں میں جھڑ پھر پر صدمہ وارے جاری تھیں
مہمانوں کی خوب آؤ بگھٹ کی گئی۔ میں یہ بتانا
گئی کہ میرے نانا چوہدری نواز شہ، مانی، ماموں مر
جی آئے تھے سب کو یہ رشتہ پسند آیا۔

اب دلاور بھائی بھی زور دینے لگے کہ جلدی
تکلیف کر رہی تھی مانگا جائے۔ دلاور بھائی کے اطور
بل گئے تھے۔ اب وہ بہت ذمہ داری سے سب
کہتا ہوں کہ کاشت کٹائی وغیرہ کی خود نگہانی کرتا
سے کھانا، بیج، اسہرے وغیرہ خود لے کر آتا تو داد
بہت خوش اور مطمئن تھے۔

ہو میں نہیں۔ تمام اجازتیں ہیں ان دیوہیوں کو دینا
 جا رہا تھا۔ وہ طوائف کی جڑ کو اکڑوں کے زیورات دیے
 تھے وہ بہت گھما گھمی اسے اندازہ تھا کہ یہ زیورات
 لوٹ کا مال ہے۔ ان زیورات کی وجہ سے وہ کسی مصیبت
 میں نہ پھنس جائے تو اس نے اپنے آپ کو بچانے کے
 لیے اسی وقت پولیس سے رابطہ کیا اور سارے زیورات
 اُن کے حوالے کر دیے۔ پولیس نے وہ تمام زیورات کھ

والوں کو دکھائے جہاں ڈاکوؤں نے ڈکیتی کی تھی تو انھوں نے فوراً پہچان لیے کہ یہ ان کے ہی زہر ہیں۔ اب پولیس کا کام آسان ہو گیا تھا۔

اس طوائف نے تمام ڈاکوؤں کے حصے بھی بتا دیے ان میں سے ایک کو وہ ذاتی طور پر بھی جانتی تھی اس کے بارے میں پوری تفصیل بتادی۔ پولیس نے اپنے خبرچاروں طرف پھیلا دیے اور بالآخر چوبیس گھنٹے کے اندر پولیس نے ڈاکوؤں کا سراغ لگالیا اور بھاری نفری اسلحہ کے ساتھ دلاور بھائی کے ذریعے پر چھاپے مارا۔ سب ڈاکو گرفتار کر لیے گئے۔ زیورات اور پیسوں سے بھرا اپنی کیس بھی برآمد کر لیا۔ بدست سے اس وقت دلاور بھائی بھی وہاں موجود تھے تو ڈاکوؤں کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔

اگلے روز ملک کے تمام بڑے اور قومی اخبارات میں ڈاکوؤں کی گرفتاری، ان کی تصاویر اور ناموں کے ساتھ سرخ سرخی لگادی گئی۔ پولیس کی کارکردگی کو بہت سراہا گیا تھا۔ ڈاکوؤں کی تصاویر کے ساتھ بھائی دلاور کی تصویر اور نام نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ گوکہ دلاور بھائی سو فیصد بے گناہ تھے۔ ان ڈکیتوں سے ان کا کوئی واسطہ تعلق نہ تھا مگر بد قسمتی سے پیسہ اور زہر ان کے ذریعے سے برآمد ہوا تھا۔ اور وہ خود بھی وہاں موجود تھے تو انھیں بھی ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھا گیا۔

دلاور بھائی کی گرفتاری کی خبر اخبار میں ڈاکوؤں کے ساتھ ان کے نام اور تصویر چھپنے سے ہم پر قیامت ٹوٹ گئی۔

ہر طرف یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ دلاور ڈاکوؤں کا ساتھی ہے۔ دادا جان پہلے ہی بہت کمزور و نحیف لاغر ہو چکے تھے تو یہ خبر ان سے برداشت نہ ہوئی ان پر شدید فوج کا حملہ ہوا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

تمام ڈاکوؤں کے ساتھ دلاور بھائی پر بھی ڈکیتی اور قتل کا الزام لگا کر ان کے خلاف پرچہ درج کر لیا گیا۔ پولیس نے ان پر بہت تشدد کیا کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف کر لیں مگر وہ بے ناوارہ نہ تصور تھے جو ترمبول نہ کیا مگر

انھیں جرم قرار دیا جا رہا تھا۔ پولیس تفتیش کر رہی تھی بالآخر انھیں جیل بھیج دیا گیا اور کس عدالت میں۔ ان حالات میں ڈاکٹر ایوزر کے والدین نے میرا اور ڈاکٹر ایوزر کا رشتہ ختم کر دیا کہ وہ ایک ڈاکو کی بہن کو اپنی بنوئیں بنائے۔

میں نے ڈاکٹر ایوزر کو فون کر کے اپنے بھائی کی بے گناہی کا یقین دلایا بہت قسمیں کھائیں وہ خود بھی بہت پریشان اور ہمدردی تھے مگر اس کے والدین نے سختی سے انکار کر دیا کہ یہ شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ایوزر اپنے والدین کا اگلا تیا تھا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے غریبی میں اپنے بیٹے کو بڑھا لکھا کہ ڈاکٹر بننا تھا۔ وہ اپنی دو بہنوں اور والدین کا سہارا تھا۔ اپنے ماں باپ سے بغاوت نہیں کر سکتا تھا۔ میں دن رات رونی رونی دیکھوں نے میرے اندر ذریعے ڈال دیے۔ اور میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔

نانا جان اور ماموں نے پیسہ پانی کی طرح جہان مگر نہ ہی دلاور بھائی کی ضمانت ہو سکی اور نہ ہی ان کی بے گناہی ثابت ہو سکی۔ کس عدالت میں چل پڑا۔ ہماری رہی سہی زمین اور گھر بھی گیا۔ مجھے نانا جان اپنے پاس مٹھ پنڈلے گئے۔ مجھے دن رات ڈاکٹر ایوزر کی یادیں ستائیں۔ میں اس کی محبت، بھائی کے غم اور دکھ میں سوکھ کر کاٹا ہو گئی۔

ایک دن پولیس کی وین قیدیوں کو لے کر عدالت میں پیشی کے لیے لے جا رہی تھی اس وین میں ڈاکوؤں کے ساتھ دلاور بھائی بھی تھے تو راستے میں ڈاکوؤں کے ساتھیوں نے ان کو چھڑانے کے لیے حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا پچھ حملہ آور مارے گئے اور پچھ پولیس والے ڈکیتی اور شدید ہو گئے۔ وین کا دروازہ توڑ دیا گیا اور سب قیدی فرار ہو گئے۔ بھائی کو بھی ان ڈاکوؤں نے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر اس گاڑی میں بٹھالیا جو ڈاکوؤں کو چھڑانے کے لیے آئی تھی وہ گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی پولیس نے وائرلیس کر کے قریبی علاقے کی پولیس کو بلایا اور پولیس کی بھری نفری اپنی گاڑیوں میں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کافی لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی جب پولیس ان

کے پیچھے نہ پارہی تھی پولیس نے ڈاکوؤں کو چھڑانے والی گاڑی پر فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں گاڑی کے پیچھے دونوں ٹائر برست ہو گئے اور گاڑی ہلچلے لکھائی سڑک سے اتر کر کھدوں میں اچھلنے لگی اور رگ گئی جسے ہی گاڑی رکی جس کا جھدہ رخ ہوا سب بھاگنے لگے۔ بھائی بھی ایک سمت بھاگنے لگے کھنڈر سا آگے جا کر ایک ریلوے لائن آگئی دلاور بھائی ریلوے لائن کے ساتھ دوڑنے لگے۔ پولیس ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی ریلوے اسٹیشن آ گیا تھا پولیس بھائی کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ وہ بار بار بھائی کو روک جانے اور گرفتاری کا بول رہے تھے مگر بھائی بیٹ فارم پر بھاگے جا رہا تھا۔ اب پولیس والوں نے درے درے کے لیے فائرنگ شروع کر دی تھی اس اسٹیشن پر اور درے کے لیے فائرنگ شروع کر دی تھی اس غائب بھی کافی نظر آ رہا تھا اور بھائی اس رش میں غائب بھی ہو گیا تھا۔ پولیس کی فائرنگ سے بھائی کو کمر اور ناگوں پر گولیاں لگ گئیں وہ پلٹے فارم پر گر گیا۔ چند لمحوں کے بعد پولیس اس کے سر پر گئی۔ بھائی نے وہیں ریلوے اسٹیشن پر تڑپ کر جان دے دی۔

اگلے دن اخبار میں پہلے صفحے پر خبر شائع ہوئی کہ قیدیوں کی پولیس وین پر حملہ کے نتیجے میں قیدیوں کو چھڑانے والے تین حملہ آور ہلاک چار پولیس اہلکار شہید ہوئے دو شدید زخمی اور فرار ہوئے والے تمام ڈاکو گرفتار کر لیے گئے۔ ایک دلاور نامی ڈاکو پھول نگر کے ریلوے اسٹیشن کے پیٹ فارم پر بھاگے ہوئے پولیس مقابلہ میں فائرنگ سے ہلاک۔

دو دن کے بعد دلاور بھائی کی نعش پوسٹ مارٹم کے بعد نانا جان نے وصول کر لی اور اسی دن بھائی کو قبر خاک کر دیا گیا۔ وہ پھول نگر جو مجھے دنیا کے سب شہروں اور علاقوں سے خوب صورت اور پیارا لگتا تھا۔ جہاں میری محبت پروان چڑھی تھی۔ اسی پھول نگر کے پیٹ فارم پر میرا رگا بھائی جو کہ بے گناہ تھا۔ پولیس کے انھوں مارا گیا تھا۔ پھر دوے پر صدموں نے مجھے تو ڈر دیا۔ میں بتا رہے گی اور دن رات لکھی کا دورہ پڑتا رہتا اور فلم کے ساتھ خون بھی آتا۔ میرا سارا حسن کلا گیا رنگ

کالا ہو گیا۔ اور میں بڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ ماموں مجھے علاج کے لیے شہر لے گئے تو وہاں انکشاف ہوا کہ مجھے ٹی بی کا مرض لاحق ہو چکا ہے۔ جس کا بہت لمبا علاج ہے۔ نانا جان اور نانی جان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ماموں نے گاؤں کی ساری زمین بیچ کر شہر میں گھر بنایا ہے اور وہ دن رات اپنے بڑس میں مصروف رہتے ہیں۔

ڈاکٹر ایوزر کے تعلق پتا چلا کہ انھوں نے کسی اور لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور پینٹا زینٹین کرنے کے لئے ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ مجھے گورنمنٹ کے ٹی بی ہسپتال میں داخل کرادیا گیا ہے جہاں میرا علاج ہو رہا ہے۔ ڈاکروں کا کہنا ہے کہ مکمل صحت یاب ہونے کے لیے مجھے اب سے ایک سال کا عمر صبر لگا۔

حسرت تمام کے ساتھ ایک مومبئی امید ہے کہ شاید ڈاکٹر ایوزر واپس آ کر مجھے ایسٹل کیونکہ مقدمہ کی سماعت کے دوران ثابت ہو گیا تھا کہ بھائی ڈکیتی میں ملوث نہیں تھا۔ جس گھر میں ڈاکٹر ڈاکو لگایا تھا تو ان لوگوں نے باقی تمام ڈاکوؤں کو شناخت کر لیا تھا اسی طرح ایک کے حملے نے بھی کوہاوی ڈکیتی کے دلاور بھائی ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکوؤں نے بھی اپنے بیان میں کہا تھا کہ وہ تو بزدلی کا پلہ ہے۔ بھائی کے لیے ان کے پاس گئے تھے تو پولیس نے ڈاکوؤں کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کر لیا تھا۔ مگر اب اس کوہاوی کا کیا فائدہ یہاں جایا بھائی تو ڈاکوؤں کی حیثیت سے پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔

مجھے اب بھی ڈاکٹر ایوزر کا شدت سے انتظار ہے۔ میں نے وہ سب اخبارات سنبھال کر رکھے ہیں جس میں مقدمہ کی ساری روادار لکھی ہے جس کے مطابق ثابت ہو گیا تھا کہ بھائی بے گناہ تھا۔ باقی تمام ڈاکوؤں کو سزا سناتے موت ہو گئی تھی۔ مجھے امید ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر میرا ڈاکٹر ایوزر سے سامنا ضرور ہوگا اور میں اسے اپنے بھائی کی بے گناہی کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤں گی کیونکہ میری محبت سچی ہے۔ دعا کریں مجھے میری جیت مل جائے۔

☆☆☆

چنانچہ رخسار زواری کہیں بن کر آگئی۔

ہنگر گزار زوار اور قناعت پسند رخسار کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ اہم سے اہم تر ہوتا گیا اور یہ دنیا ہی ان کے لیے جنت بن گئی۔ حسین جنت۔

زوار اگر رخسار کے سلیقے کے قائل تھے تو رخسار ان کے طریقے کو سراہتی۔ محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور جب ان کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے خدا نے ایک نئی جان رخسار کے پیٹ میں ڈالی تو گھر میں خوش و انبساط کے ساتھ اضطراب نے ڈیرے ڈال لیے۔ والدہ صاحبہ تو چلوغیر خاندان سے تھیں۔ بہنوں، بھائیوں اور بھتیگوں والی لیکن والد صاحبہ محاورہ تائیں بلکہ حقیقتاً نسلیں سے گھر میں بیٹی کی قناریاں سننے کے کوہے تاب تھے۔ جب ان کا اپنا زمانہ تھا تب بھی انھوں نے ہر مرتبہ بیٹی کا انتظار کیا تھا لیکن خدا نے ان کی خواہش کو کٹھن رکھا۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ زوار کے وقت اپنے دوست کی بیٹی کو زواری کو دودھ شریک بہن اور اپنی رضاعی بیٹی بنایا۔

لیکن کی اس طرح سے پوری نہ ہوئی جس طرح سے حقیقی بیٹی پوری کرتی۔

پول تو والد صاحب فارغ وقت میں افنی بھی چارپائی پر بیٹھے سلیقے سے بیگڑی سر پر جھانے، حقے کی نئے منہ میں دبائے گڑگڑاتے ہوئے دھواں ہوا کے پیر کرتے رہتے لیکن اضطراب ان کی ہر حرکت سے واضح ہوتا۔

بیوی سے اصرار کر کے انھوں نے دور محل کی دائی بھی بلوائی جو دوران حمل نہ چپ کی چال سے بتا دی کہ لڑکا ہوگا لڑکی۔ دائی کا تجربہ ہائیوں پر محیط تھا۔

”سرمدار علی فیصلے خدا کی ذات کے۔ ہم کون ہوئے جس شخص کو بونے والے پر میرا تجربہ بتاتا ہے کہ لڑکی ہوئی باقی خدا کی مرضی۔“ دائی نے آسان کی طرف ہاتھ اٹھائے تھے۔ سرمدار علی اسے سروسوہنے کہ ایک سبز کوڑا کتا فوت دائی کی جھولی میں ڈالا۔ سبز نوٹ کی اس زمانے میں بے تحاشہ وقعت تھی۔ مگر دائی نے جو خبر سرمدار علی کو سنائی وہ خبر کہیں زیادہ بڑی تھی۔ زمانے کی رفتار ان دنوں ایسی تیز نہ ہوئی تھی۔

الطراساؤنڈا اتنا عام نہ تھا اور یوں بھی لوگ الٹراساؤنڈ لگوا کر بچے کی جنس معلوم کر دانا گناہ کبیرہ خیال کرتے تھے اور پھر وہ وقت آگیا۔ جس کا انتظار کیا تھا۔

تجربہ کار دائی کو یہ بایا گیا تھا۔ زوار کو بھی بیٹی کی تمنا تھی لیکن سرمدار علی کے انداز ہی نہ تھے۔ لمحہ جاں کسل پھیل کسل کر سر کٹا رہا۔ یہاں تک کہ تھمتا تے چہرے کے ساتھ دائی اور زواری کی والدہ صاحبہ باہر آئیں۔ والدہ صاحبہ کے ہاتھ میں گرم پکڑوں میں لپٹا ہوا جوتا۔

”صد مبارک سرمدار علی۔ یوں تو میں نئی زندگی کی مبارک باد بے پہلے باپ کو دیتی ہوں لیکن تیری خوشی دیکھ کر مجھے آج تو مبارک کا زیادہ حق دار لگ رہا ہے۔“ سرمدار علی تو جسے خوشی سے دیوانے ہو گئے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ پونی کو ہاتھوں میں تھا تھا۔ ”یہ میری بیٹی ہے“ سرمدار علی کی آنکھوں میں جھلک اُسنو چکے۔

”بیٹی کے باپ کو بھی صد مبارک“ دائی نے کہا۔ باپ اور دادا نے دائی کو مٹھائی کے پیسے دیے اور توقع سے بڑھ کر دیے۔ دائی دعا میں دیتی ہوئی رخصت ہوئی۔

”سرمدار علی بیٹی پیوٹی ہے کہیں۔ درد ہی نہ اتار دو۔“ والدہ صاحبہ نے ٹوکا تھا تو بمشکل تمام سرمدار علی نے بیٹی بیوی کے حوالے کی۔

بیٹے کو ساتھ لگایا تو کتنی دیر ساتھ بیٹھنے کھڑے رہے۔

”حقے یقین آئے یا نہ آئے زوار پر یہ سچ ہے اتنا خوش میں سمجھتی نہ ہوا“ سرمدار علی کے کچے میں سرست تھی۔

بیٹی کے نام رکھنے کا وقت آیا تو کسی نام پر اتفاق ہی نہ ہوتا تھا۔ پونہ ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا اور پھر ڈیڑھ ہفتے بعد سرمدار علی کی رائے کو مقدم جان کر بیٹی کا نام سونیا رکھا گیا۔

”سونیا سردار“ باپ کی خوشی کے لیے زوار نے بیٹی کے نام کے ساتھ اپنے نام کی بجائے باپ کا نام جوڑا تھا۔ سونیا گھر بھر کے آنکھ کا تار اٹھی۔ ایک دن

زوار نے پونہ پیار میں سونی بلایا تو سونی بیباک کا نام نہرا۔ گھر بھر میں آسودگی تھی۔ سونی کی قناریاں گھر میں کہیں تو سارا گھر جھوم اٹھتا اور کبھی جوسو یا پیار ہوتی تو سارا گھر پریشان ہو جاتا۔ پونہ وقت گزرتا گیا۔ سونی دو سال کی ہوئی تو سرمدار علی پر فانی آن گزرا۔ فانی کا پہلا حمل ہی جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ والد صاحب کے گزرنے کے چند ماہ بعد والدہ صاحبہ بھی فانی حقیقی سے جا ملیں۔

زوار نے یہ دیکھ صبر سے سہمے کہ یہ لمحہ تو ہر کسی نے صبر سے سہایا ہوتا ہے۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ چلتی رہی کہ ایک دن۔

☆.....☆.....☆

تھلی ہوں میں تپتی ہوں

پھولوں سے میں لگی ہوں

ٹھنڈا پانی پیتی ہوں

اوپر پٹکا چلتا ہے

نیچے مٹا سوتا ہے

سننے کی ماں سونی

کھائے ڈبل روٹی

ڈبل روٹی خراب

سننے کی ماں ناراض

سونی کہتی جاتی اور کہتی جاتی۔ ستون سے گلے لگ کر گدھو تھی دیر یہ نظم گاتی رہی اور پھر دھیان سامنے پڑے اپنے تین بیویوں والے سائیکل کی طرف گیا تو دوڑ کر سائیکل کی طرف نئی اور سائیکل پر بیٹھی۔

تھلی ہوں میں تپتی ہوں

پھولوں سے میں لگی ہوں

اب آواز پیلے سے بھی اونچی ہو گئی تھی۔ پورا زور لگا کر گاتھی تھی۔ تین بیویوں والا سائیکل ابھی بیڈل کے ساتھ چلا نا نہیں آتا تھا۔ پاؤں ڈھکیل ڈھکیل کر سائیکل کھینچتی۔

ٹھنڈا پانی پیتی ہوں

اوپر پٹکا چلتا ہے

نیچے مٹا سوتا ہے

زوار نے کرٹ بدل گھڑی پر ٹائم دیکھا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ جولائی کے گرم دن تھے۔ پانچ بجے کا کافی دن نکل آتا تھا۔ کچھ دیر پونہ کی سکنڈی سے لیٹے رہے۔ پھر اٹھے۔ داش روم کا رخ کیا۔ منہ پر جینے مار کر آئے اور چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اس وقت محنت میں دو چار پائیاں بھی تھیں گرمیوں کے دنوں میں یاں بیوی محنت میں سو تے تھے۔ رخسار برآمدے میں چوکی پر بیٹھی آٹا گوندہ رہی تھی۔

”اٹھ گئے آپ، ضرور سونی کے شور کی وجہ سے اٹھے ہوں گے کل دوپہر کو سونی تو شام کو کتنی خوش کی مگر یہ محترم نہیں انھیں اور صبح میں تنگ کرنے کے لیے چار بجے ہی جاگ گئی“ رخسار نے آئے کو مٹھائیاں مارتے ہوئے کہا تھا۔

سننے کی ماں سونی کھائے ڈبل روٹی ڈبل روٹی خراب سننے کی ماں ناراض سونی سائیکل کھینچتی جاتی اور کہتی جاتی۔ زوار نے گردن موڑ کر دلا ری کو دیکھا۔ بے ساختہ بے تحاشا پیار اُٹھ آیا۔

”سونی اچھ آو۔“ زوار نے پکارا۔ سونی نئی ان سنی کرتی سائیکل کھینچتی رہی اور گنگنائی رہی۔

”کیسا صاف ہوتی ہے ناشاء اللہ۔ سکول داخل کر دیا بنا چاہے۔“ زوار رخسار سے مخاطب ہوئے۔ ”نہ جی اگلے سال داخل کروا دیں گے۔ ابھی تو صرف تین سال کی ہے۔ ابھی تو کھینچنے دیں۔“ آٹا گندہ چکا تو رخسار پرات لے کر باورچی خانے کی طرف چلی

تھی۔ ”تھلی ہوں میں تپتی ہوں“ ارے لگتا تھا کہ سونی یہ گاتھی تھی پیر اور ہوئی اور نہ ہی تھکتی۔

”اوٹ تھلی زوار ادھر آ۔“ زوار نے ایک بار پھر بیٹی کو پکارا تھا۔ سونی سائیکل جھپوٹی دوڑ کر باپ کے پاس آئی اور باپ کی گود میں چڑھ گئی۔

”آرام سے آرام سے۔“ سونی کی رفتار

دیکھ کر زار کوڑا رسا لکھیں گری نہ جائے۔

اپنے لیے بھی ناشتا لائی تھی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔
دونوں میاں بیوی میں خوب محبت تھی۔ شادی کے
چار سال بعد بھی ایک ہی برتن سے کھاتے۔

”جمو تو بہت دور ہے۔ ہم آج ہی چلیں گے۔“
زوار نے کہا تو رخسار نے دوبارہ سے تردید نہ کی۔ جاتی
تھی شوہر نادر کہاں رکے والے ہیں۔ ان دنوں جمعو کے
چھٹی ہوا کرتی تھی۔ اسی لیے گھر کے کام اور تفریح کے
ارادے جمعے کے روز کے لیے اٹھار کھے جاتے۔

”آؤ سوئی ناشتا کرو“ رخسار نے سونی کو بلایا تھا۔
”مجھے نہیں کھانا“ سونی کھاتی رہی۔ صبح صبح وہ
دودھ بھی پی چکی تھی اور آرم بھی کھا چکی تھی۔ اب کہاں
کچھ کھانا تھا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ پکڑے کہ وہ اپنی رحمت کی چادر
مسل ہمارے اوپر تارتے ہوئے ہے۔“ ناشتا ختم ہوا تو
زوار ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔ ”بہی ہاگل“ رخسار
نے ناشتے کے برتن سینے اور پیٹ کی طرف چل دی۔
”تختی ہوں میں تختی ہوں۔“ سونی کاراگ جاری تھا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

دوپہر کا وقت تھا۔ گرم لو کے بھڑچل رہے تھے۔
انسان حیوان، چرند پرند بھی اپنے کھکانوں میں دیکے
تھے۔ دھوپ میں بھسلا دیے والی نماز تھی۔
نویدا دور سے چل کر آ رہا تھا۔ پسینے میں شرابور
قمیض بدن سے چپکی ہوئی۔ حلق خشک، ایسے لگتا جیسے
کانٹے اگے ہوئے ہوں۔ زمین کی گری سلیپر سے
بیروں کو منتقل ہو رہی تھی۔ گھروں کی دیواروں کے
سامنے اتنے لمبے نہ تھے کہ بندہ ان میں سستا سکے۔ منہ
ہی منہ میں بڑبڑاتا، گرمی کو کو ستاؤہ سارے درجہ کے لیے
دیکھتا جا رہا تھا کہ سامنے مسجد کے مینار نظر آئے اور جان
میں جان آئی۔

مسجد میں جا کر سب سے پہلے وہ رفع حاجت سے
فارغ ہوا۔ وضو کا میں بیٹھ کر کئی دیر منہ پر چھینے مارتا
رہا۔ سر جھکی گیا کیا۔ پاؤں بھی دھوئے اور سر ہو کر پانی
پیا۔ مسجد کا پانی کا ذائقہ تھوڑا تمکین تو تھا پر پینے لائق
تھا۔ اس سب سے جسم کو کئی آگ تھوڑی ٹھنڈی ہوئی تو
اس نے اندرونی حصے کا رخ کیا۔

”بنا وہ یہاں سے ملتی نہیں یا اور آج کل گرمی
بہت ہے۔ میں دور سے لاؤں تو پکھل جائے گی۔“

زوار نے کہا تو سونی نے منہ بسورا۔
”میں پکھلی ہوئی کھالوں گی۔“ تین سالہ بیٹی پکھلی
کو پکھلی کہہ رہی تھی۔ زوار نے مسکراتے ہوئے بیٹی
کے گال پر بوسہ دیا۔ سونی منہ بسورے بیٹھی رہی۔
”چلو ایسے کرتے ہیں، شام کو میں جب دفتر سے
آؤں گا تو پھر آنکسریم کھانے چلیں گے۔ میں تم اور
ای“ سونی نے ہونٹ دباتے ہوئے سر ہنسی میں بلایا۔
”نہیں ابھی“ سونی سے کہاں صبر ہوتا تھا۔

زوار ایک بار پھر ہنس پڑے۔
”سونی ابو کو تنگ مت کرو۔ انھوں نے کام پر جانا
ہے۔ شام کو آنکسریم کھلانے لے جائیں گے نا۔“
رخسار بچکے کے دروازے پر کھڑی کہہ رہی تھی۔ سونی
نے تیوری چڑھا کر ماں کو دیکھ اور کچھ کہے بنا باپ کی
گود سے اترتی اور پھر سے سائیکل پر آن بیٹھی۔
”تختی ہوں میں تختی ہوں“ راگ ایک بار پھر
جاگ اٹھا تھا۔

”تیار رہنا تم بھی شام کو پھر گائے والی آنکسریم
کھانے چلیں گے۔“ رخسار ناشتے لے کر آئی تو زوار نے
شرارت سے کہا تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ سارا دن دفتر میں گزار کر
آپ اتنے تنگے ہوئے آتے ہیں۔ گرمی بھی تو بہت
ہوتی ہے۔ دوبارہ سے کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ
آرام کیجئے گا۔ جمعو آپ کو کچھ بھی ہو جائے اس دن
چلے جائیں گے۔ سونی تو بیٹی ہے۔ ایسی چھوٹی موٹی
جیزوں کے لیے اس کا دل تو ہمتا ہی رہے گا۔“ رخسار

اس گرمی میں بھلا کس نے مسجد میں آنا تھا۔ کچھ دیر
یونہی بیٹھا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک کمین
مسکراہٹ آن پھری۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کس چیز پر
کھڑے ہو کر پکھا اتارا جاسکتا ہے۔ مسجد میں سنول،
میز، کرسی طرز کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس نے تین چار
بار نگاہیں ادھر سے ادھر دوڑائیں۔ مسجد میں سفوں کے
علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تھوڑا مایوس ہونے لگا تو قبضے دیوار
میں بنے اوپر بیچے کے طاوون میں قرآن مجید نظر
آئے۔ قرآن مجید کے کئی کئی تھے۔ اتنے کہ چاروں
طاوون ترتیب میں لکھے قرآن مجید سے پر تھے۔ لمون
زہن میں لمون سوچ آئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جا کر مسجد کا داخلی دروازہ بند کر آیا۔
اول تو کوئی آنا نہ اور کوئی آج بھی جاتا تو اس نے
زیادہ سے زیادہ مارنا ہی تھا۔ نوید امارے ڈرنے والا
نہیں تھا۔ اس گری میں لوگوں کو کوئی توقع نہیں کیا جاسکتا
تھا اور نوید ابھانے میں یوں بھی تو اہر تھا۔
داخلی دروازے کی کھڑکی لگائے کے بعد اس نے
قرآن مجید کے نسخے نکالے۔ پیچھے کے پچھانے کی
ذمہ داری لگائی۔ ترتیب سے اوپر نیچے رکھے سے وہ کم از کم
دو دفٹ اونچائی میں آگے۔

نوید ان کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ کلام اللہ بیروں کے
نیچے تھا اور وہ بچت سے پکھا اتار رہا تھا۔ آسانی سے
پکھا اٹھا گیا۔ جب نیچے اترنے لگا تو قرآن مجید کے نسخے
ادھر ادھر کڑھک گئے۔
”دکس نے کہا تھا یوں ذمہ لگا کر مسجد بھر دیں۔“
نوید نے ساتھ ہی ناقابل اشاعت گالی کی تھی۔
پیچھے کے پر اس نے چھری سے کھولے کے تمام
واردات سات منٹ میں ہو گئی۔ پکھا اور پٹلیوں میں
دباؤ دھ سمجھ نکل گیا۔

پیچھے کو قریب ترین کماڑی کے دکان پر اونے
ہونے بیجا۔ جو پیسے ہاتھ لگے اس میں سے سب سے
پہلے ایک گلاس ٹھنڈی پینیں لی۔ ”گرمیوں میں
ٹھنڈے شروب کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔“ جب وہ
گلاس منہ سے لگاتا تھا تو جبین کا شروب اس کی
موچھوں کو گلیا کرتا تھا۔

اس گرمی میں بھلا کس نے مسجد میں آنا تھا۔ کچھ دیر
یونہی بیٹھا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک کمین
مسکراہٹ آن پھری۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کس چیز پر
کھڑے ہو کر پکھا اتارا جاسکتا ہے۔ مسجد میں سنول،
میز، کرسی طرز کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس نے تین چار
بار نگاہیں ادھر سے ادھر دوڑائیں۔ مسجد میں سفوں کے
علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تھوڑا مایوس ہونے لگا تو قبضے دیوار
میں بنے اوپر بیچے کے طاوون میں قرآن مجید نظر
آئے۔ قرآن مجید کے کئی کئی تھے۔ اتنے کہ چاروں
طاوون ترتیب میں لکھے قرآن مجید سے پر تھے۔ لمون
زہن میں لمون سوچ آئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جا کر مسجد کا داخلی دروازہ بند کر آیا۔
اول تو کوئی آنا نہ اور کوئی آج بھی جاتا تو اس نے
زیادہ سے زیادہ مارنا ہی تھا۔ نوید امارے ڈرنے والا
نہیں تھا۔ اس گری میں لوگوں کو کوئی توقع نہیں کیا جاسکتا
تھا اور نوید ابھانے میں یوں بھی تو اہر تھا۔
داخلی دروازے کی کھڑکی لگائے کے بعد اس نے
قرآن مجید کے نسخے نکالے۔ پیچھے کے پچھانے کی
ذمہ داری لگائی۔ ترتیب سے اوپر نیچے رکھے سے وہ کم از کم
دو دفٹ اونچائی میں آگے۔

نوید ان کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ کلام اللہ بیروں کے
نیچے تھا اور وہ بچت سے پکھا اتار رہا تھا۔ آسانی سے
پکھا اٹھا گیا۔ جب نیچے اترنے لگا تو قرآن مجید کے نسخے
ادھر ادھر کڑھک گئے۔
”دکس نے کہا تھا یوں ذمہ لگا کر مسجد بھر دیں۔“
نوید نے ساتھ ہی ناقابل اشاعت گالی کی تھی۔
پیچھے کے پر اس نے چھری سے کھولے کے تمام
واردات سات منٹ میں ہو گئی۔ پکھا اور پٹلیوں میں
دباؤ دھ سمجھ نکل گیا۔

پیچھے کو قریب ترین کماڑی کے دکان پر اونے
ہونے بیجا۔ جو پیسے ہاتھ لگے اس میں سے سب سے
پہلے ایک گلاس ٹھنڈی پینیں لی۔ ”گرمیوں میں
ٹھنڈے شروب کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔“ جب وہ
گلاس منہ سے لگاتا تھا تو جبین کا شروب اس کی
موچھوں کو گلیا کرتا تھا۔

دوبچے کے قریب رخسار نے سونلی کو تھپک تھپک کر سلا یا اور تین بچے وہ دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوتے میں بھی اس کے خواب وہ آنکسریم آئی رہی جو گائے کھاتی تھی۔ رخساری ابھی بمشکل آنکھ لگی تھی کہ چار پائی بنی اور ٹپکا ہوا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو سونلی چار پائی سے اتر رہی تھی۔

”تو بس کدھر شرارتی ہے؟“ رخسار سوچ کر رہ گئی۔ ”باہر مت جانا سونلی“ رخسار نے مندی مندی آواز میں کہا تھا۔ گرمیوں میں صبح نماز کے وقت اٹھتی تو دوبارہ نہ سوتی اس لیے دوپہر کو طبیعت پر کافی کسکندگی سی چھا جاتی۔ دوپہر کو سونا اس کے معمول کا حصہ تھا۔

سونلی کمرے سے باہر آئی اور برآمدے میں پڑے اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ کھلونوں سے باتیں بھی کرتی اور انھیں الٹ پلٹ بھی کرتی۔ لیکن جلد ہی بیزار ہو گئی۔ کھلونوں کو پرے دھکیلا اور دوبارہ کمرے میں آ گئی۔ اس وقت تک وہ ننگے پاؤں تھیں۔ کمرے سے اپنا چیک سڑپ والا جوتا اٹھالائی اور پہن لیا۔ چار پائی پر چڑھی اور چہرہ کہنی پر لٹکائے زوار کا رخسار کرنے لگی۔

زوار کی نو سے پانچ والی ڈیوٹی تھی گھر پہنچنے پہنچتے عموماً انھیں ساڑھے سائے پانچ، پونے چھ ہوجاتے تھے اور ابھی تو ساڑھے تین بجے تھے۔

سونلی نے ایک نظر پاؤں میں پہنے جوتوں کو دیکھا۔ اسے ابھی دامن اور پائیں پاؤں کے جوئے کا نہیں پتا چلتا تھا۔ غور سے جوتوں کو دیکھا تو لگا غلط پہنے ہوئے ہیں اتار کر دایاں جوتا بائیں پاؤں میں اور بائیں جوتا دائیں پاؤں میں پہن لیا۔ صحیح انداز میں پہنے ہوئے کو اتار کر غلط انداز میں پہننے کے بعد وہ منقش ہوئی کاپ صحیح پہنے ہیں۔

تلی ہوں میں تلی ہوں
پتھولوں سے میں لگی ہوں۔
خٹھنڈا پائی پتی ہوں
اور پتھنڈا چلتا ہے

نیچے سنا سوتا ہے

سنے کی ماں سونلی
کھائے ڈبل روٹی
ڈبل روٹی خراب
سنے کی ماں ناراض

گاتے گاتے اس نے نظر برآمدے میں لگی دیوار گیر گھڑی پر ڈالی۔ بس یہ تھا کہ گھڑی سے وقت کا پتا چلتا ہے اور پتھنڈا نہیں پتا تھا۔ گھڑی سے نظریں ہٹا کر پھر سے گاتے لگی۔

”خٹھنڈا پائی پتی ہوں“
”خٹھنڈا پائی پتی ہوں“
”خٹھنڈا پائی پتی ہوں“
ایسے جیسے ٹیپ ریکارڈ کی کیسٹ پھنسنے لگی ہو۔ ایک ہی فقرے کو بار بار آواز میں اتار چڑھاؤ لائے بغیر گاتی رہی۔

”خٹھنڈا پائی پتی ہوں“ چار پائی سے اٹھی اور صحن پار کرتی گھر کے دروازے تک آئی کھڑی بیٹھی تھی۔ سونلی اڑیاں اٹھا کر پیچوں کے بل کھڑی ہوئی تو با آسانی کھڑی کھولی۔

دروازے میں کھڑے ہو کر گلی میں دیکھا ابو آ تو نہیں رہے۔ کئی سنسان پڑی تھی۔ لو کے جھوکے کئی کے ذرات اڑ رہے تھے۔ مایوس ہو کر دروازے میں کھڑی رہی۔

”ابو آجائیں“ دیوار پر ہاتھ جمائے نگاہیں لگی کے ٹکڑے بھاڑیں۔ سونلی نوید گئی کہ ٹکڑے نمودار ہوا۔

”پتی کیا کر رہی ہو؟“ نوید سے دروازے پر رک کر سونلی کو نظر میں تو لیا تھا۔

”میرے ابو نے آتا ہے۔ ہم نے آنکسریم کھانے جانا ہے۔ وہ جونی دی میں گائے کھاتی ہے۔“ سونلی کی نگاہیں گلی کی کٹھ سے ہتی نہ تھیں۔ جیسے بس چند سینڈز میں زوار نے آ جانا ہے۔
پتی سرخ اتار جیسی تھی۔ دیکھتے ہی چھوٹے کا دل کرتا۔

”کیا نام ہے تمھارا؟“ نوید سے پان زودہ دانتوں کی نمائش کی تھی۔
”سونلی“

”تمھارے ابو کا کیا نام ہے؟“

”ابو کا نام۔۔۔۔۔“ سونلی نے لمبے بھر کو نگاہ بکڑ جانی اور سامنے کھڑے انکل کو دیکھا کچھ رہی سوسجی اور پھر بولی۔

”ابو کا نام ابو ہے“ نوید سے کے ہونٹ پھیل گئے۔ اس نے کئی منظر ڈرائی بالکل سنسان تھی۔
”سونلی مجھے تمھارے ابو نے بھیجا ہے۔ کہا ہے ابو کو لے آؤ۔ وہ آنکسریم دانی کان پر ہیں۔“
کونٹ سے نگاہیں کٹ کر پر جمائے سونلی کی آنکھیں لمبے بھر میں چمک اٹھیں۔

”ابی نے بھی جانا ہے ان کو لے آؤں“ سونلی بدلی سے اندر کمرے میں گئی تو نوید سے نے اس کی کلائی پکڑی اور گود میں اٹھالیا۔
”میں ابی کے لیے ابو ساتھ لے آئیں گے۔“

نوید سے نے پچکا رہا تھا۔
”ساتھ لے آئیں گے تو آنکسریم پلگھ جائے گی۔“
”ابو سونلی کو پتا تھا۔“
”نہیں کچھ ہوتا آؤ ہم چلیں۔ تم بتاؤ کتنی آنکسریم کھاؤ؟“

”اتنی“ سونلی نے ہاتھ پھیلا کر اشارہ کیا۔ نوید سے یزقو مٹھا اٹھا کر بار کر گیا تھا۔
”بیب میں مجھے کو پتہ ہے تلی ہو تو موجود تھی۔ قریب ترین جو بھی آنکسریم کی دکان آئی وہاں سے سونلی کو آنکسریم لے کر دی تاکہ وہ بے چین ہو کر رونا اور پتہ نہ شروع کر دے۔“ آنکسریم کھاتے ہوئے سونلی بے انتہا خوش تھی۔ اتنی خوشی کہ حساب ہی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

نوید کا اصل نام نوید نہیں تھا۔ وہ نوید ابی تھا۔ ہوش سنہالی تھی اس نے اپنے آپ کو اس محلے کے ایک کھرکی ڈپوٹری پر پایا تھا۔ جس کے بارے میں ٹریفک لوگ سوچتے سے بھی گزرتا تھے۔
کسی کو اس کی پروا نہ تھی۔ پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملا۔ جہاں کچھ کھانے کو دیکھا وہاں جھپٹ پڑا۔ جانوروں کی طرح بغیر پردہ و تربیت کے وہ بھڑتا رہا۔ بھڑتا رہا۔ یہاں تک کہ کوئل جوان ہو گیا۔

اب نوید سے کو اہمیت ملنا شروع ہو گئی تھی؟ کئی کام وہ اپنے زور بازو پر کرتا تھا۔ اونچے اونچے گھروں والے بیویوں کا ڈھیر کھا رہے والے سرد خونڈ لاتا۔

اسی ملک کی پیدوار ہونے کے باوجود ملک کے کسی ادارے یہاں تک کہ شناختی کارڈ دفتر میں بھی اس کا اندراج نہ تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس محلے کے اکثر لوگ جن میں ان کا کارڈ اور بے تحاشا عورتیں تھیں (یونی بے نشان تھے۔

ایسے ہی ایک دن ایک خوب بیویوں والے صاحب نے فرمائش کی۔ Pedophilia کا رواج نہ تھا پر گلی کے کتے بیویوں کی طرح خود بخود جوان ہونے والا نوید انسانی خود غرض اور خود پرست تھا جتنا ایک لک کا کتا ہوتا ہے۔ چھوٹی بچی چڑا لایا۔

کئی دنوں اس کے ذہن میں خیال آیا کیونکہ وہ خود کا رواج بدستور کرے۔ چھوٹی بچیاں لے آئے گا تو چند سالوں بعد وہ اس کے لیے سونے کا انڈہ دینے والی مرغیاں ہی ثابت ہوں گی۔

چنانچہ اس نے دور کے گلی محلوں سے بچپان چرائیں۔ یا بچہ یا بچی پر اکٹفا کر لیا۔ آخر انسان تھا کوئی کتا تو نہیں کہیں سمجھتا سمجھتا جاتا۔ خود اور اچھے کا فرق تو انسان کو پتا ہوتا ہے اس لیے وہ ہمیشہ خود سے اچھے کو زباں پر دے پرفویت دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

جہلم سے افسر بھائی، اسلام آباد سے ملازم بھائی اور گاؤں سے راشدہ آپا دوڑے چلے آئے۔ جہری کچھ اسی کی۔
کہاں گئی سونلی؟
گھر پر ایک سکوت بھری خاموشی نے ڈیرہ ڈال دیا۔

اخبارات میں اشتہارات دیے گئے۔ بی بی اور ریڈیو پر بے اعلانات کیے گئے۔ زوار نے خود ہی گلی جا کر سونلی کو ڈھونڈا پر تمام گوشیشیں لا حاصل پھرئیں۔ سونلی لاچا ہوئی۔ وہ رحمت جو چار سالوں بعد خدا نے اتاری تھی۔ چانچنی نہ چلا گئی تھی۔
”دبیر کو زوار“۔ صدر بھائی نے خوب دلا سے

دے۔ جہلم میں ان کے پاس افسری کا عہدہ تھا۔ تعلقات بھی کچھ نہ کچھ تھے لیکن تمام تعلقات استعمال کرنے کے باوجود سونے کا پتہ نہ چل سکا تھا۔

”صبر۔۔۔۔۔“ زوار نے زرد سے سوچا تھا۔ ”میری بیٹی کوگی اور آپ کہتے ہیں صبر کروں“ زوار چیخ پڑے۔

صفر بھائی نے زوار کا ہاتھ پکڑا اور بولے ہوئے دبانے لگے ان کے کس میں پیار بھری تسلی شامل تھی۔ زوار نے لمبے بھر میں ہاتھ جھٹک دیا۔

”مجھے آپ کی ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔ کیسے“ افسر ہیں آپ ایک بچی کو نہیں ڈھونڈ سکتے۔“ زوار ہڈیانی انداز میں چیخنے لگے۔ غم آنکھوں والی راشہ رضا کی بھائی کو درد بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

”زوار تم خود کو پریشان نہ کرو، سونی مل جائے گی۔ انشاء اللہ“ اسلام آباد سے آئے اسلم بھائی تسلی دیتے تھے۔

”کسے ملی گے، دو ہفتے ہوئے کو آئے ہیں اور کوئی سراغ ہی نہیں مل رہا۔ میں کیا کروں۔ خودکشی ہی نہ کروں۔“ زوار رونے لگے اور روتے ہی چلے گئے۔ کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ انہیں چپ کروائے۔

زوار کے باقائلم بیٹی بھائی زوار خالی نظروں سے زوار کو دیکھتی رہ گئی۔ پچھلے دو ہفتے میں اس نے اتنے آنسو بہائے تھے کہ اب گلگت تھا جیسے آنکھیں ہی خشک ہو گئی ہیں۔

”صدیوں بعد ہمارے خاندان میں بیٹی پیدا ہوئی تھی سب سکتے خوش تھے۔“ زوار روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ سب سر جھکائے بیٹھے رہ گئے۔

”ابو کی خوشی کا تو لہکا نہ ہی تھا۔ میری سونی کا نام سونا بھی انھوں نے ہی رکھا تھا اور مجھے یاد ہے کہ سونی کی پیدائش پر ابو نے مجھ سے کہا تھا کہ اتنا خوش وہ بھی نہیں ہوئے تھے۔“ الفاظ ٹوٹنے لگے تھے۔

”سونی کہاں ہو؟ یا اللہ یہ کیسی آزمائش ہے؟“ زوار چیخ رہے، روتے رہے، رونے کے سوا وہ کچھ بھی کیا کرتے تھے؟

اور پھر سونی کو نہ ملنا تھا نہ، ملی۔ دور سے آئے بہن بھائی تسلیاں دیتے اور صبر کی تلقین کرتے رخصت ہو گئے۔ وہ بھائی بھینوں نے اپنے ہر بے نیکی پیدائش پر بیٹی کی تمنا کی تھی اور زوار کے ہاں سونی کی پیدائش پر اتنے ہی خوش تھے جیسے خود ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے جاتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

”شکر خدا کا کہ اس نے ہمیں بیٹی نہ دی۔ اگر وہ گم ہو جاتی تو۔۔۔۔۔“ اس سے آگے وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

گھر میں بھائی خاموشی گھٹاؤ ہوئے لگی تھی۔ زوار بولائے بولائے سے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے اور پھر سے پہلے کمرے میں آ جاتے۔

زوار الٹ پلٹ کرسونی کے کھلونوں کو دیکھتی اور سینے سے لگا کر رونے لگ جاتی۔ بھوک کا احساس ہوتا تو بھی دونوں میاں بیوی ڈھیت بنے بھوک کے درد کو برداشت کرتے رہتے۔ کئی کئی بار چلنے سے ایک نوالہ نہ اتارتے۔ گھر ایسا میلا ہو گیا جسے صدیوں سے صفائی نہ کی گئی ہو۔ خود زوار اور زوار کس قدر ملجے چلے میں رہنے لگے تھے۔

غم ایسا تھا کہ گلگت تھا کہ کلیجہ درد سے ہی پھٹ جاتے گا اور وہ مرجائیں گے لیکن سب بات بھی نہ کیجی پھٹتا تھا اور نہ ہی وہ مرتے تھے۔ دن کے دن گزر جاتے دونوں میاں بیوی بات نہ کرتے۔ کرنے کو جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔

ایسے ہی دن گزرتے جا رہے تھے۔ دفتر سے ایک خط آیا، دوسرا خط آیا اور پھر تیسرا اور آخری خط آیا۔ تیسرے خط میں مطلع کیا گیا تھا کہ زوار کو نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے۔

جب تیسرا خط موصول ہوا تھا اور زوار بیٹھے بڑھ رہے تھے تب زوار بھی ساتھ والی چار پائی پر پٹشی تھی۔ لگاؤں زوار پر جمائے زوار کو دیکھتے ہوئے بھی انہیں نہ کچھ رہی تھی۔

”دفتر سے خط آیا ہے۔ مجھے برخاست کر دیا گیا ہے“ خط پڑھنے کے بعد زوار نے خود ہی کہا تھا۔ خط

بھٹ جاتی پر پھینکنے کے انداز میں رکھا تھا۔ زوار ہوں کا زانو تبدیل کیے بغیر زوار کو یوں ہی دیکھتی رہی۔ جسے اس خبر کا ہونا نہ ہونا ایک ساتھ۔ کئی لمحے یوں ہی خاموشی میں گزر گئے۔ دونوں ہاں بیوی خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر زوار بولی۔

”سونی کب ملے گی زوار؟“ جواب دینے کے لیے ان کے پاس الفاظ نہیں تھے اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جو زندگی کو نکلنے کی ملامت دے رہی تھی۔ ٹھوڑی دیر بعد زوار بولے۔ ان کی آواز میں کرب تھا۔

”سوچتا ہوں کہ ہم شہر کی بجائے کسی چھوٹے سے گاؤں میں رہتے۔ یوں میری بیٹی تو گم نہ ہوئی“ زوار کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ زوار کو روتے دیکھا تو زوار کی آنکھیں بھی خود بخود دھیر آئیں۔

”خدا نے مجھے بیٹی دی تو خدا کا شکر ادا نہ کرتے تھا تھا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ کاش بیٹی کی جگہ چٹا ہوتا۔ پانچویں اس ظالم زمانے نے میری بیٹی کے ساتھ کیا مال کیا ہوگا۔“ زوار تڑپ اٹھی۔ شوہر کی بات کاتے ہوئے بولی۔

”ایسی باتیں مت کرو زوار۔ میری سونی بہت چھٹی ہے۔“ زوار کے رونے میں روانی آگئی تھی۔ ”ہاں ہماری سونی تو بہت چھٹی ہے۔ ابھی تو اسے دایں اور بائیں جوتے کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ آنسوؤں نے زوار کا پورا چہرہ بھگو دیا تھا۔ لاڈلی کی ہر بات یاد آتی تھی۔

”ہاں زوار۔ وہ خود سے صحیح جوتا بھی نہیں پہن سکتی تھی۔ اور کمرے سے پانی بھی نہیں بھر سکتی تھی۔ اسے کوئی ٹوٹی دیا نہیں آتا تھا اور اسے پیاس بھی ہر آدھے گھنٹے بعد لگتی تھی۔ سارا دن میرا سر کھاتی رہتی کہ پانی بھر دو اور جب پانی پیتی تو سارے کپڑے بھی گلے کر دیتی۔ گلاس کا منہ بڑا ہوتا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے پانی بہتا۔ دونوں میاں

بیوی کا ایک ہی غم تھا۔ ”اور وہ نظم جو وہ صبح شام گاتی تھی پچھلی ہوں میں پچھلی ہوں۔۔۔۔۔“ آنکھیں آنسوؤں سے اتنی بھر گئیں کہ سامنے بیٹھی زوار دھندلی دکھائی دینے لگی تھی۔ ”پچھلی نہیں تھی، تبتا ہوں میں تبتا ہوں۔“ کہتے ہوئے زوار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ٹھوڑی ٹھوڑی“ ”سناؤ پھر۔۔۔۔۔“ زوار نے بوجھل آواز میں فرمائش کی تھی۔ ”ہیں۔۔۔۔۔“ آنسو ہاتھ کرتے زوار فرمائش میں سر ہلانے لگی۔

”بلیز۔۔۔۔۔“ زوار کے لیے میں اتار دیتی۔ ”سناؤ زوار بلیز۔۔۔۔۔“ زوار نے آنکھیں رگڑی تھیں۔ ہچکچاہٹیں یعنی زوار شوہر کو دیکھنے لگی۔ پچھلے چند دنوں کے لیے تو مسرندہ چہرے والے زوار کو گمز اور دلا کر زوار کا تھا۔

چند لمحے خاموشی کے سیٹھ لیے اور پھر کمرے میں زوار کی آواز گونجنے لگی۔ ”پچھلی ہوں میں تبتا ہوں“ پچھلوں سے منی تھی ہوں۔ آنسوؤں کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔

”ٹھنڈا پانی پیتی ہوں اوپر پینکا چلتا ہے“ ”چنے سنا سنا ہے“ پچھلا الفاظ بھی صحیح طرح سے ادا کرنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔

”سنے کی ہاں سونی کھائے ڈبل روٹی“ ”ڈبل روٹی خراب“ ”سنے کی ہاں ناراض۔۔۔۔۔“ ”خاموشی سے روتے زوار نظم کے ختم ہونے تک بلند آواز میں رو رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

خاتونِ مہربان سے ہے۔ ہر دم کا کوہِ نور ہے۔ ہر دم کا شمعِ نور ہے۔ ہر دم کا شمعِ نور ہے۔ ہر دم کا شمعِ نور ہے۔

گردش!



جادوید راجی

جادوید راجی کے شرابار قلم کا شاہ کار، طویل کہانی نمبر کی سوغات
ایک ایسی ذہینیت کی واردات، جو آپ کو کبھی نہ بھولے گی

بچہ گھر کے دروازے پر نگاہ ڈالی تو وہاں اسے اپنی والدہ حیران پریشان کھڑی دکھائی دیں۔
عثمان نے والدہ اور بھائی کو دیکھ کر اطمینان کا ہنس ضرور لیا مگر پولیس کی موجودگی حالات کی کسی بڑی خرابی کا سراغ دے رہی تھی اور اسے پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے گھر یقیناً ڈاکہ مارا گیا ہے مگر اسے اس کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا تھا۔
عثمان نے کھانے کا انچارج خود بھی جائے واردات پر چار پانچ سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ عثمان نے کار ایک طرف کھڑی کی اور باہر نکلا تو عادل تیزی سے اس کی طرف آیا۔ عادل اس کے سامنے پہنچ کر رونی صورت بنا کر بولا۔
”بھیا! ڈاکو بچھ لے گئے سب کچھ“
”اللہ مالک ہے یار“ عثمان نے اپنے آپ کو سنبھالنے ہوئے کہا اپنے آپ کو سنبھالنے کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا، پھر وہ اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے بولا۔
”آپ اندر جائے امی۔“ اور اس کی والدہ اس کے کہنے پر آنکھوں میں آنسو بھر لے دروازے کی

اوٹ میں ہو گئی تھیں۔ اپنی ماں کو اندر جانے کی ہدایت کر کے اور چھوٹے بھائی کی پیشہ پر کسی کی غرض سے ساتھ چھپتا ہوا عثمان اس طرف بڑھا جہاں عثمان انچارج کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پر تکلف انداز میں ہاتھ ملایا اور پھر عثمان نے اپنا تعارف کروانے کے بعد عثمان انچارج کو گھر کے اندر چلے کیلئے کہا۔
”ہم گھر کا معائنہ تو کر چکے ہیں جناب“ ڈاکے کی پوری تفصیلات بھی معلوم ہو چکی ہیں ڈاکوؤں نے آپ کے کمرے کی الماری بھی تو ڈر دی ہے۔“ عثمان انچارج نے کہا۔
”میرے کمرے کی الماری..... کیا مطلب؟“
عثمان کی آنکھوں میں ایک لمے کیلئے تشویش کی جھلک نظر آئی تھی۔
”ہمیں پورے ڈاکے کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے؟“ انسپکٹر نے عثمان سے کہا۔ ”آپ کے بھائی اور والدہ نے بتایا کہ شاید کچھ نقدی وغیرہ آپ کی الماری میں تھی مگر یہ بات انہیں نہیں معلوم کہ اس نقدی کی مالیت کیا ہے۔ یہ بات آپ ہمیں بتادیں تاکہ ہم

تیکم احمد شاہ ایک معصوم صفت خاتون تھیں، دو بیٹیاں اور ایک بیٹی کی ماں تھیں شوہر کی موت کے بعد کافی بیمار رہے تھی لیکن دونوں بیٹے عثمان شاہ اور عادل شاہ ماں کے بڑے فرماں بردار تھے۔ عثمان شاہ بہترین ملازمت کرتا تھا جبکہ چھوٹا بیٹا عادل پڑھ رہا تھا۔ بیٹی ندریکہ کی شادی کر دی اور وہ امریکہ چلی گئی تھی۔ عادل شاہ عثمان سے ایک سال چھوٹا تھا۔ تیکم احمد شاہ کی خواہش تھی کہ جلد از جلد عثمان کی شادی کر دیں مگر عثمان کا اصرار تھا کہ عادل کے ایم بی بی ایس مکمل کر لینے کے بعد دونوں بھائی ایک ساتھ شادی کریں گے۔

تیکم احمد شاہ نے اپنے شوہر کی زندگی میں اتنے راز نہ کیے ہوں گے جتنے عثمان نے انہیں کرا دیئے تھے۔ عثمان ایک ایسے سرکاری محکمے میں ملازم تھا جہاں اوپر کی آمدنی اصل آمدنی ہوتی ہے۔ پہلی تاریخ والی آمدنی تو اس کے گھر کی دوکانوں کا پٹرول بھی پورا نہیں کر سکتی تھی اور اب تو عثمان نے شہر کے فیشن ایبل علاقے میں جدید طرز کی ایک کوٹھی بھی خرید لی تھی جہاں وہ اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک خانساں ایک ڈرائیور ایک ملازمہ اور دو



دیگر کاروائی کر سکیں۔“
عثمان نے انسپکٹر کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے
عادل سے پوچھا، ”کیا کی چیز گئی ہے؟“
”امی کے سارے زیورات پرانے ہائڈ اور دس
لاکھ روپے نقد جوہار کی الماری میں رکھے تھے“ عادل
نے رو ماتھے لہجے میں کہا۔

”سارے پرانے ہائڈ؟“ عثمان نے پوچھا۔
”جی ہاں تقریباً دو لاکھ روپے کے تھے وہ
سب“ عادل نے جواب دیا۔
”آپ کی والدہ کا خیال ہے کہ زیورات کی
مالیت چندہ لاکھ روپے تھی۔“ انسپکٹر نے دونوں
بھائیوں کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔
”آپ تو ماشاء اللہ پڑھ لکھے آدمی ہیں اتنی
بھاری مالیت کے زیورات اور پرانے ہائڈ آپ نے
چیک کے لاکر میں کیوں نہیں رکھ دیئے۔ آپ کو تو
معلوم ہے کہ حالات ان دنوں بہت خراب ہیں۔“
عثمان نے ایک بار پھر انسپکٹر کی بات کا جواب
دینے کی بجائے اس سے کہا وہ ڈرا گھر کے اندر کا
ایک چکر لگا آئے اور اپنے کمرے کو بھی چیک کر
لے تاکہ ڈاکہ میں جانے والی اشیاء اور نقد کی کا خود
بھی اندازہ لگا سکے۔ وہ گھر کے اندر چلا گیا اور
انسپکٹر قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جو لازم نے
تھوڑی دیر پہلے لاکر دی تھی۔

عثمان جیسے ہی پوچھ سے ہو کر بند گھر میں داخل
ہوا تو جیک احمد شاہ اس کے گلے لگ کر رونے لگیں ان
کی آنکھوں سے برسات ہو رہی تھی وہ روتے ہوئے
بولیں۔

”میرے بیٹے کی محنت لوٹ کر لے گئے بھخت
مارے خدا غارت کرے ان تینوں کو بڑا بدکردار یا میرا
پورا گھر خالوں نے۔“ وہ بچوں کی طرح ہلک ہلک کر
رونے لگیں۔

”آپ کیوں فکر کرتی ہیں میرے ہاتھ کی لکیریں
تو کاٹ کر نہیں لے گئے۔“ عثمان نے اپنی ہاں کی
آنسو بھری آنکھوں کے سامنے دائیں ہاتھ کی پٹیلی کر
تے ہوئے کہا۔

”آپ اپنی طبیعت ٹھیک رکھیں امی ہر برس
کام میں کوئی نہ کوئی اچھا ہی بھی ہوتی ہے اگر وہ ڈاکو
خدا نخواستہ آپ کو یا عادل کو نقصان پہنچا دیئے تو۔“
عثمان نے کمال ضبط سے اپنی ماں کو تسلی دی۔
”تو اپنا کرا دیکھ لے بیٹا“ تیری الماری بھی ان
کسیوں نے توڑ ڈالی ہے۔“ بیگم احمد شاہ نے بمشکل
کہا۔

عثمان کو خود بھی اپنے کمرے میں جانے کی جلدی
تھی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی نظر سب
سے پہلے الماری پر پڑی۔ جس کے دونوں پٹ کھلے
ہوئے تھے اس نے سب سے پہلے الماری کے دونوں
لاکر دیکھے جو نوٹے ہوئے تھے پھر اس نے جلدی سے
اوپر والے خانے میں پوشیدہ لاکر کو دیکھا تو اس کا چھوٹا
سایہ بھی کھلا ہوا تھا۔ عثمان نے جلدی سے اس میں
باتھ ڈال کر ٹھونڈا اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک لخت اس کا
پورا جسم پیسے میں بھیج گیا اس نے محسوس کیا کہ اس کی
ناٹوں کا دم کسی نے نکال لیا ہے اگر وہ عقب میں کھڑی
ہوئی اپنی ماں کو نہ دیکھ لیتا تو شاید اپنی لٹھرائٹ پر
زبردستی قابو نہ پاسکتا جس نے اس کے جسم کو لڑا کر رکھ
دیا تھا۔ اس کی ماں حیرت اور سوالی نظروں سے اسے
دیکھ رہی تھی۔

”کیا تیرے بھی کچھ پیسے یہاں رکھے
تھے؟“ بیگم احمد نے بولے سرگوشی کی۔

”نہیں تھوڑے سے پیسے ہی تھے اوپر والے
خفیہ لاکر میں۔“ عثمان نے اپنی ماں کو جواب دیا
اور قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی کی
پشت پر پڑے ہوئے تولیے سے عثمان نے اپنے
چہرے اور پیشانی کا پسینہ پونچھا اس کے دماغ میں
چنگاکیاں سی بھر گئی تھیں۔ لوٹ مار کرنے والے
اس کی الماری کے خفیہ خانے سے ستر لاکھ روپے بھی
لے گئے تھے۔ ان ستر لاکھ روپوں کے بارے میں
عثمان نے اپنی ماں اور بھائی کو بھی نہیں بتایا
تھا اسے ویسے ہی اپنی آمدنی چھپانا مشکل تھی۔ لہذا
ان ستر لاکھ روپوں کے بارے میں کیا بتاتا۔ اس
کے چھوٹے بھائی کو تو کسی حد تک اندازہ تھا کہ عثمان

رشوت لیتا ہے مگر ماں نے جب بھی زیادہ آمدنی
کے بارے میں سوال کیا تو عثمان نے اسے محض اللہ
کا فضل ہے کہہ کر بات ٹال دی۔ بیگم احمد کا تعلق
جس زمانے کی عورت سے تھا وہ واقعی اتنی ہی سیدھی
سادھی ہوا کرتی تھیں کہ اولاد کی کوئی برائی اسے
برائی ہی نہیں محسوس ہوتی تھیں۔

عثمان کو ملازمت کرتے ہوئے چار پانچ سال ہو
گئے تھے مگر اس کی پوسٹنگ ایک ایسی سیٹ پر تھی جہاں
دھن رہتا تھا۔ ان چند برسوں میں اس نے اپنے باپ کو
اجداد کی تمام کسریں پوری کر لی تھیں۔ بہت سی دولت
اس نے اپنی بہن کے توسط سے امریکا منتقل کر دی
تھی۔ اپنے گھر کے علاوہ اس کے چھ سات پلاٹ
مختلف علاقوں میں تھے۔ اس کے علاوہ ایک
انڈسٹریل پلاٹ بھی اس کی ملکیت تھا مگر اس تمام
جائیداد میں سے کچھ بھی اس کے نام نہیں تھا یا تو اس
کے چھوٹے بھائی یا ماں کے نام تھا۔ وہ پلاٹ تو اس
نے اپنے کمرے دوستوں کے نام پر خریدے تھے۔
دوستوں میں عثمان کی مقبولیت کا سبب اس کا کشادہ
دست ہونا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صرف

ادھر صرف پیسے کو جمع کرنے کیلئے حاصل کرتے ہیں بلکہ
اس کے مزاج کی روگینی نے اسے کسی حد تک شاہ خرچ
بھی کر دیا تھا لہذا اس کا حلقہ یارار بڑھتا ہی چلا
گیا مگر آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اس کے
جیروں تلے سے زمین نیچ لی ہے۔ کہنے کو تو اس نے
اپنی ماں سے کہہ دیا کہ اس کی الماری سے کچھ ہزار
روپے غائب ہیں مگر اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس کے
ساتھ کیا ہوا تھا؟

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا اور
صحن سے ہوتا ہوا باگڑی میں آگیا جہاں اس کا چھوٹا
بھائی اور پولیس والے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”میری الماری سے بھی پچیس ہزار روپے غائب
ہیں انسپکٹر صاحب۔“ عثمان نے انہوں بھرے انداز
میں کہا۔ انسپکٹر نے کاغذ پر کچھ نوٹ کرتے ہوئے کہا۔
”آپ کی والدہ نے پرانے ہائڈ ز اور زیورات کی
جو مالیت بتائی تھی کیا وہ درست ہے؟“

”وہ پرانے ہائڈ ز دراصل میرے ایک دوست
کے تھے لیکن اس میں سے بہت سے میں نے اپنے
دوست کو واپس کر دیئے تھے۔ یہ بات میری والدہ کے
علم میں نہیں تھی، میرا خیال ہے کہ ڈاکو تمام ہائڈ ز لے
گئے۔“

”اور زیورات کی مالیت کے بارے میں آپ
کا کیا خیال ہے؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”ان زیورات کی مالیت اگر میری والدہ چندہ
لاکھ کی بجائے پچاس لاکھ روپے بھی بتائیں تو کم
تھی۔“ عثمان نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس صاف صاف بات
کر رہی؟“ انسپکٹر نے رکھائی سے کہا۔

”یہ دراصل جذبات کا معاملہ ہے۔“ عثمان نے
آہستگی سے کہنا شروع کیا۔ ”وہ زیورات میری والدہ
کے پاس میرے والد کی نشانی تھیں میرا مطلب ہے
کہ وہ ان کی شادی کے وقت سے ان کے پاس تھے
اور وہ انہیں سنہال کر رکھتی تھیں۔“ عثمان نے ذرا سا
توقف کیا اور پھر بولا۔

”آپ تو جانتے ہیں کہ انسانی جذبات اور
احساسات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی مگر میرا خیال ہے
کہ زیورات کی مالیت قیمتوں کے حوالے سے دو تین
لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔“

انسپکٹر نے حیرت سے عثمان کے چہرے کو
دیکھتے ہوئے کہا ”میں آپ کی حقیقت پسندی اور
سچائی سے بہت متاثر ہوا جناب ورنہ آج کل تو لوگ
چوری یا ڈاکے کے بعد اپنے سامان اور نقد کی کو اتنا
بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے
علاوہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکے یا چوری کا
سامان شاز و مادہ ہی واپس ملتا ہے“ انسپکٹر نے عثمان
کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی بات جاری
رکھی۔ ”وہی آپ فکر نہ کریں میں کوکوش کروں گا
کہ ڈاکو کو کچھ نہ پائیں۔ آپ کے آنے سے
پہلے ہی میں نے علاقے کی ناک بندی کا حکم دے
دیا تھا۔“

”جی تھیک ہیو۔“ عثمان نے جواب دیا۔

انسپیکٹر جمیل نے ذرا سے فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک شخص کو اشارہ سے اپنی طرف بلایا عثمان نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا بدلتوں اور شرٹ پہنے ہوئے یہ شخص معمولی حیثیت کا حامل دکھائی دیتا تھا۔ انسپیکٹر کے بلانے پر وہ پوچھل قدموں سے چلتا ہوا قریب آیا تو اس کے چہرے پر ہوا نیاں اُڑ رہی تھیں اس نے تجھے انداز میں کہا۔

”جس۔“

”اب تم جا سکتے ہو اگر تمہاری ضرورت پڑی تو تمہیں بلایا جائے گا۔“ انسپیکٹر کا لہجہ تحسانہ تھا۔ ”یاد رکھو پولیس کو اطلاع دیے بغیر شہر سے کہیں باہر مت جانا۔“

”ٹھیک ہے سر۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ عثمان نے استغاثہ میں انداز میں عادل سے پوچھا ”کون ہے یہ؟“

”یہ لائن میں ہے بھائی“ فرید خان ہے اس کا نام جس وقت ڈاکو ہمارے گھر میں تھے ہوئے تھے یہ ہمارا فون ٹھیک کرنے کیلئے آیا تھا جب اس نے برہنہ ٹنگھی بھائی تو ڈاکو چونک پڑے ان میں سے ایک باہر آیا اور اس کو کھٹکے لٹی فون کا بندہ جانتے ہوئے اندر لے گیا یہ غریب سمجھا کہ گھر میں بلانے والا اہل خانہ کا کوئی فرد ہو گا چنانچہ یہ اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی ان لوگوں نے اس کے بھی کچھ تھپتھپا ہاتھ اور آپ کے کمرے میں ڈال دیا۔ انہوں نے اس کے منہ میں پڑا بھی خوشنودیا تھا جب وہ لوگ ڈاکہ ڈال کر فرار ہو گئے تو ہم نے اسے کھولا۔ یہ شدید دہشت اور خوف کا شکار ہے۔ پولیس والوں نے اسے بھی پوچھ گچھ کیلئے روک لیا تھا۔

”تم نے کیا کیا دیکھا ہے؟“ انسپیکٹر کی موجودگی میں عثمان نے فرید خان سے پوچھا۔

”دیکھا کیا تھا صاحب جی۔۔۔ گھر میں گھستے ہی انہوں نے میرے ساتھ باؤں باندھ دیئے۔“ فرید خان نے مسکینے سے کہا ”میری جیب سے بھی پانچ سو روپے نکال کر لے گئے۔“

”کیا تم ان میں سے کسی کو پہچانتے ہو؟“ عثمان نے

فرید خان سے سوال کیا لیکن جواب انسپیکٹر نے دیا تھا۔

”میں اس سے پوچھ چکے کہ کچا ہوں جو ڈاکو اسے اندر لے گیا تھا اس نے بس ذرا دیر کیلئے نقاب اُٹھائی تھی باقی دونوں ڈاکو نقاب پہنے ہوئے تھے لیکن آپ کی بات ہے کہ کیا آپ کو کسی پر شک ہے کیونکہ آپ کی والدہ اور بھائی نے تو کسی پر شبہ کا اظہار نہیں کیا ہے؟“ انسپیکٹر نے عثمان کی طرف رخ کرتے کہا۔

”نہیں انسپیکٹر صاحب! ہم لوگوں کی تو کسی سے دشمنی نہیں ہے لہذا ہم کسی پر شبہ کیسے کر سکتے ہیں؟“ انسپیکٹر جمیل نے اس پر اصرار کرتے ہوئے کہا ”آپ کا خیال درست ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ یہ کوئی روشتن کی ذہنی ہو مگر پھر بھی ڈاکو ہمیشہ ڈاکہ ڈالنے سے پہلے حالات ضرور معلوم کر لیتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ اپنے ملنے جلنے والوں پر توجہ دیں۔ ہو سکتا ہے اس واردات میں کسی کا ہاتھ ہو؟“

”ٹھیک ہے ہم لوگ غور کریں گے۔“ عثمان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”اتحباب میں چلتا ہوں۔“ انسپیکٹر نے عثمان اور عادل سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے فوراً مطلع کریں۔“ انسپیکٹر دیگر سپاہیوں کے ساتھ وین میں سواری ہو کر چلا گیا تو محلے کے دیگر لوگ اظہار ہمدردی کی غرض سے عثمان کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد عثمان ڈرائیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا تو اہل محلہ میں سے کچھ لوگ بیٹھ کر ڈاکے کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔ عثمان کو ان لوگوں سے اُجھن ہو رہی تھی وہ جانتا تھا کہ اُٹھ کر اندر چلا جائے مگر کچھ تو مردت اور اچھے یہ کہ اندر گھر میں محلہ کی عورتیں بھی اس کی ماں کے پاس موجود تھیں مجبوراً ڈرائیونگ روم ہی میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے اس کا موبائل لا کر دے دیا جس کی تیل مسلسل بج رہی تھی۔ موبائل پر فہرید دیکھ کر عثمان نے ڈرائیونگ روم میں بیٹھے لوگوں سے معذرت کی اور اُٹھ کر باہر آ گیا باہر آکر اس نے فوراً فون اُٹھالیا۔

”میں نے تمہیں منع کیا ہے کہ دفتری اوقات میں مجھے فون نہ کیا کرو۔“ عثمان نے جھنجھلاہٹ اور ہیرا

سے سرگوشی کی اس نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ اس کی آواز کوئی دوسرا فرد نہ سنے پائے۔

”تمہارے دفتر ہی فون کیا تھا تو پتا چلا کہ تم اچانک گھر چلے گئے ہو گھر کا فون بھی نہیں مل رہا تھا موبائل بھی اُٹھ نہیں ہو رہا تھا اب جا کر تم نے فون ریسو کیا ہے۔“ دوسری طرف سے زارا نے جواب دیا۔

”میں ابھی تم سے بات نہیں کر سکتا شاید تم وقت ملے گا تو خود فون کروں گا۔“ عثمان نے رکھائی سے کہا۔

”کیا آج شام کو آؤ گے نہیں؟“ زارا نے نرمی اور لگاؤ سے پوچھا۔

”شاید نہیں بلکہ بالکل نہیں۔“

”کیا بات ہے؟ تم پریشان لگے رہے ہو طبیعت تو ٹھیک ہے دفتر سے اچانک اُٹھ کر گھر کیوں آ گئے؟“ زارا نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال کر ڈالے۔

”میں کہہ رہا ہوں نا کہ شام کو بات کروں گا۔“ عثمان نے ترشی سے کہا اور سیل فون بند کر دیا۔ اگر عثمان اپنے گھر میں ہو تو یوں ذہنی سخت حال نہ ہوتا تو بھی وہ زارا سے اسی طرح بات کرتا۔ زارا اب اس کیلئے جی کا جنجال ہوتی جا رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس سے تعلقات کی اسے زندگی بھر قیمت ادا کرنی ہوگی۔ شروع شروع میں تو عثمان کو اس نے اپنے ایسے دکھنے سنائے کہ وہ نرم پڑ گیا۔ اپنی اداؤں سے کچھ دنوں تک تو اس نے عثمان کو ادھی بھیا بھی اور اس کے جسم و جان کی تحفظ کو دور بھی کیا یہی وجہ تھی کہ عثمان نے اسے ایک فلیٹ کرائے پر لے کر دیا اور اسے بیس ہزار روپے مہینہ بھی لگا دیا۔ وہ اس فلیٹ میں اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی عثمان ہفتے میں ایک آدھ رات زارا کے فلیٹ میں بسر کرتا۔ جس رات وہ زارا کے گھر میں ہوتا زارا کا ماموں کسی کام سے نہیں اور چلا جاتا تھا بربری کے جواب میں عثمان جو تختے تختاف زارا کو دیتا وہ معمول کی رقم کے علاوہ ہوتے تھے یہی وجہ

تھی کہ زارا اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے رکھتی۔ زارا نے عثمان کو بتا رکھا تھا کہ شادی کے چھ مہینے بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی بیٹی اپنی ماں کے پاس دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ عثمان غیر معمولی ذہانت رکھنے والا نو جوان تھا اسے زارا کے مامی سے کوئی غرض نہیں تھی وقت گزاری کیلئے زارا اسے میری لہذا وہ شخص اسے اپنی نگین حراج طبیعت کو بھلانا نہ ایک کھلنا سمجھتا اس کے کچھ قریبی دوستوں کو بھی معلوم تھا کہ اس نے ایک داہنی ہاتھ بھی رکھی ہوئی ہے۔

ان دنوں عثمان کا دل زارا کی طرف سے اس لیے اوجھ رہا تھا کہ اب وہ شادی پر اصرار کرنے لگی تھی اور یہ مطالبہ کرنا عثمان کیلئے تقریباً ناممکن تھا۔ عثمان کی پریشانی اور اُجھن کا سبب یہ بھی تھا کہ زارا کے پاس عثمان کی کچھ تصویریں بھی تھیں اور جس فلیٹ میں وہ رہتی تھی اس کے کرائے دار کی حیثیت سے کاغذات پر عثمان کے دستخط تھے۔ دیئے ہوئے عثمان کو نہ تو کوئی دھمکی دی تھی اور نہ اس کی باتوں میں کسی طرح کی بیک میلنگ کا شائبہ ہوتا تھا مگر عثمان کے اصرار کے باوجود اس نے وہ تصویریں واپس نہیں کی تھیں۔ تصویریں ان دنوں کی ایک ساتھ تھیں اور یہ تصویریں زارا کے ماموں نے بنائی تھیں۔

اس کے علاوہ ایک بار عثمان نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسے بڑا اور خوبصورت فلیٹ اپنے نام پر لے کرانے پر لے لے گا تو زارا نے یہ بات نہیں مانی تھی۔ اس طرح کے کچھ اور ایسے معاملات تھے جن سے عثمان کو زارا کی نیت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ دوسری طرف زارا اس سے شادی کیلئے اصرار کرتی رہتی تھی۔ ایک بار تو اس نے زارا سے صاف کہہ دیا تھا۔

”زارا میں شادی کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔ کووارے ہو گئے؟“

”ہاں! مجھے یہی زندگی پسند ہے۔“

”مگر مجھے پسند نہیں ہے۔“ زارا نے کہا۔

”تو پھر۔۔۔؟“

”اس کا فیصلہ تم خود کرو گے۔“ زارا نے بھی سخت لہجے میں کہا اور عثمان کو غصہ آ گیا۔

”ہمارے درمیان اس کی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”غلط تم مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔“

”کیسا جھوٹ؟“

”میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم جانتے ہو کہ میری زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے جبکہ مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری امی تمہارے لیے رشتے دیکھتی پھر رہی ہیں۔“

”کون کیا کر رہا ہے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”مگر مجھے ہے۔“

اس دن کے واقعے کے بعد عثمان کے دل میں زارا کی طرف سے بال آ گیا تھا۔ زارا کی عمر بے شک زیادہ نہیں تھی لیکن وہ اندر سے بہت گہری تھی اور اسے اپنے تجربے کا ماموں کی پوری سپورٹ حاصل تھی اور ماموں اسے مشورے دیتا رہتا تھا۔ اب وہ مکمل عثمان کے پیچھے گئی رہتی تھی کہ وہ اس سے شادی کرے لیکن عثمان اسے ناتواں پتا تھا لیکن ان باتوں سے اسے شدید آسائش ہونے لگی تھی۔

وہ زارا کے نہ صرف سارے اخراجات اٹھاتا تھا بلکہ اس نے زارا کو اور بھی بہت کچھ دیا تھا۔ سونے کے خوبصورت زیورات، ہیرے کی انگوٹھیاں، لباسوں کے انبار، البتہ اب زارا اسے اس کی خاصی اُن بن رہنے لگی تھی اس نے بھی کہا تھا کہ زارا تم مجھے پسند ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن شادی نہیں کر سکتا۔

”اس کے لیے تم نے کسی اور کا انتخاب کر لیا ہے؟“

”زارا نے طنز سے کہا۔

”یہ بات بھی نہیں ہے۔“ عثمان نے ہنسنے لہجے میں کہا اور زارا نے ایک دم نرمی اختیار کر لی غالباً اس نے مسئلہ ایسا کیا تھا۔

ایک رات عثمان دوستوں کو محفل سے رگ رلیاں مٹا کر نشے میں غمور زارا کے فلیٹ پر گیا تو

ماموں وہاں موجود تھا۔ زارا اور ماموں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ عثمان کو ان کی یہ ہنسی ناگوار گزری تھی تاہم اس نے کچھ نہ کہا لیکن ماموں طنزیہ انداز میں بولا۔

”لو ابھی زارا۔ تمہارے ان داتا آگئے اب ہم چلتے ہیں۔“

ماموں یہ کہہ کر چلا گیا لیکن عثمان کو اس کے الفاظ اور انداز بہت برا لگتا تھا۔ وہ وہ قدم آگے بڑھا تو اس کی نگاہ سائینڈ ٹیبل پر رکھی فریم میں گئی اپنی اور زارا کی ایک تصویر پر پڑی۔ اس کے دماغ میں آگ لگ گئی اس تصویر کو فریم میں لگوانا بھی ماموں اور زارا کی ایک سازش تھی تاکہ دیکھنے والے ان دونوں کی قربت کا اندازہ لگا سکیں۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے تصویر کا فریم اٹھا کر زمین پر پھینک دیا۔ شیشے کی کڑیاں کمرے میں بکھر گئیں۔

زارا نے یہ دیکھا لیکن اس نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا اور اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر عثمان کا غصہ اس کی پریشان کن تھا۔ اس نے نوے فریم سے تصویر نکال کر پڑے پڑے کر دی اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”تصویروں کے گنبد کہاں ہیں؟“

”وہ میرے پاس سے ضائع ہو گئے ہیں۔“

”ابو اس کرتی ہو؟“ وہ بولا اور زارا نے کسی مدخل کا اظہار نہیں کیا اور باہر چل گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں تیسری بولٹ اور گلاس وغیرہ تھے۔

دوسری صبح عثمان ریسکون تھا۔ آکھلے کچھ تو زارا نکھری نکھری خوبصورت گھر لیو اس میں بہت دلکش نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیوں سے لنگھتی کر رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر ادا کی کے سامنے تھے۔

”ناشتا بنا لو۔“ اس کے لہجے میں بلا کی اپنائیت تھی۔

”اُمیں ہاں بنا لو۔“ وہ اٹھ گیا زارا نے اسے بڑی اپنائیت سے ناشتا کرایا اس کی ہر چیز جو تھی ناٹا وغیرہ اس طرح رکھی جیسے رکھتی تھی۔ ناشتے کے

بعد جب وہ چلا تو وہ اس طرح پیار بھرے لہجے میں بولی۔

”کب آؤ گے؟“

”کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“ وہ سرد لہجے میں بولا اور وہاں سے چلا گیا۔

اسے فریم میں کئی تصویر پر بھی غصہ آیا تھا کہ زارا نے یہ چاہتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی قانونی رشتہ نہیں ہے اس طرح یہ دیدہ دلیری سے تصویر فریم کر کے کمرے میں سجادی تھی۔ عثمان کو زارا کے اس رویے سے کسی خطرناک ارادے کی بو آتی تھی اور وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس لمحے عثمان نے بھی بھول گیا تھا کہ زارا اس کی بھی قسم کے رد عمل کا اظہار کر سکتی ہے اس واقعے کے بعد عثمان زارا کے فلیٹ پر نہیں گیا اور اس بات کو اب تقریباً یاد گیارہ روز ہو گئے تھے۔

گزشتہ دیک اینڈ پر بھی وہ عثمان کا انتظار کرتی رہی مگر عثمان نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ والدہ کے بیمار ہونے کے باعث نہیں آسکتا اور اب زارا روز فون کر کے اسے بلا رہی تھی مگر وہ روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔ اب وہ زارا سے ملاقات کو خود پر بوجھ تصور کرنے لگا تھا۔ اس کے خیال میں زارا اب حد سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

زارا سے بات کرنے کے بعد عثمان ڈرائیونگ روم میں جانے کی بجائے اوپر والے کمرے میں آ گیا۔ یہاں تنہائی تھی اور وہ تنہا ہو کر سوچنا چاہتا تھا اس وقت اس کا دماغ پر ملنے جلنے والے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ گھر کے ملازمین سے لے کر دفتر کے ساتھی تک پر اس کی نگاہ خشک بھرے انداز میں پڑ رہی تھی۔ تصویر ڈیر کے بعد اس نے عادل کو بلا کر ہدایت کی کہ اس ڈیپٹن کی خبر اس کے قریبی دوستوں کو دے۔ اچانک اس نقصان سے عثمان کو شدید ذہنی صدمے کا سامنا تھا اور مستزاد یہ کہ وہ اتنے بڑے نقصان کا دعوے دار بھی نہیں تھا۔ اگر پولیس رپورٹ میں وہ اتنی ڈیپھر ساری رقم درج کر دیتا تو مختلف حساب دیتا پھر تباہی ظاہر ہے کہ کالے دھن کی قانونی حیثیت ثابت کرنا نہایت دشوار بات تھی حالانکہ تین چار

مرتبہ تو اس نے کافی بڑی مالیت کے بانڈ خریداے تھے تاکہ کالا دھن ٹھکانے لگے اور اس کی مالی حیثیت کا سرکاری طور پر جواز نکل آئے۔

عثمان کمرے میں اکیلا بیٹھا ادھیڑ میں بن لگا رہا اس کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اتنے زیادہ نقصانات نے اس کے صبر کا پتہ نہ چھکا دیا تھا اس نے اپنے بھائی اور ماں پر تو یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے کتنا بڑا خسارہ ہوا ہے مگر اندر ہی اندر جتنے بیچ و تاب کھارہا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا اس کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا مگر ان میں سے ایک آدھ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اپنا ذرا دوسروں رکھتا ہو اور اس وقت اسے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو سرکاری حلقوں تک رسائی رکھتا ہو۔ اچانک عثمان کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ فوری طور پر سیزنیاں اُترتا ہوا بیچے ڈرائنگ روم تک آیا اس نے دیکھا کہ اظہار ہمدردی کرنے والے لوگ جا چکے تھے مگر کچھ گھنٹوں اب بھی لا بی ٹی بیٹھی اس کی والدہ کو تسلیاں دے رہی تھیں۔ اس نے عادل کو اپنے گھر سے باہر جانے کی اطلاع دی اور جلد ہی واپس آئے کہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ تیزی سے چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

انسپیکٹر جمشید نے کسی سے بات کر کے ریسیور کرڈیل پر رکھا اور کھنٹی بجا کر اپنے دونوں سب انسپیکٹروں کو طلب کیا۔ اس نے نظر انداز میں میز پر پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھا اور غیر محسوس انداز میں پیپر ویٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے گھمانے لگا۔ پیپر ویٹ کی گردن کے ساتھ اس کی دماغ بھی بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا وہ آپ ہی آپ کسی بات پر متنی چیز انداز میں مسکراتا چاہتا تھا کہ اس کے دونوں معاون مستعد انداز میں اندر داخل ہوئے اور اس کے اشارے پر میز کی دوسری طرف والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

انسپیکٹر جمشید کو اس اٹھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اس کا معاون عملہ اس کے

زعب و دہدے سے بہت لرٹ ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی اس کے سامنے بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر ابراہیم خاں اور گل زمان خود سے کوئی گفتگو کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ انسپکٹر جمشید ان دونوں کو دیکھ رہا تھا اور دہدوں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ اس کی خاموشی دونوں کو ابھن اور تذبذب میں ڈال رہی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے نظریں ملائیں اور سب انسپکٹر گل زمان نے اپنے اندر بہت پیداکرتے ہوئے انسپکٹر جمشید سے کہا۔

”جی سر کیا حکم ہے؟“

انیکٹر گل زمانے دامن بچاتے ہوئے کہا۔
انیکٹر جمشید نے غصے بھرے لہجے میں اسے
گھورتے ہوئے زور سے کہا، ”کوئی دیکھتی بھی معمولی
نوعیت کی نہیں ہوتی دیکھتی صرف وہی ہوتی ہے اور
پولیس والوں کو اس کا جواب دینا ہوتا ہے اگر مگر ہم اس
بار بھی ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہے تو یہ
ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ انیکٹر جمشید نے ذرا
سے وقفے کے بعد میز پر جھٹکتے ہوئے جیسے سرگوشیاں
انداز میں اپنے معاونین سے کہا، ”اور میرا خیال ہے
کہ یہ دیکھتی معمولی نوعیت کی ہے بھی نہیں۔“
”کیا مطلب سر؟“ دونوں بیک وقت تعجب
بھرے انداز میں بولے۔

”ہاں۔۔۔ ممکن ہے اس سے کچھ سرائی مل سکے۔“ انیسٹر جشید کے ساتھ پرنسٹن یونیورسٹی کے ”قلم اس کام کیلئے ابھی نکل جاؤ“ میں اس لائن میں گھر کا پتا ہے۔“ انیسٹر نے گل زمان کو ایک کاغذ دے کر دیا۔ گل زمان نے کاغذ پھاڑنے کے بعد اسے پڑھا۔ انیسٹر جشید نے اجازت طلب کی اور کرسی سے اٹھ کر اس کاغذ کو دیکھا۔ سب انیسٹر ابراہیم بھی اس کے ساتھ ہی کرسی سے اٹھ کر دیکھا۔ لیکن جشید نے اسے دوبارہ دیکھنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ صرف دو فنسکو ہو گیا جبکہ گل زمان سیلوٹ کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

کہ یہ سب باتیں میں کسی اور سے نہیں کر سکتا تھا۔“ عثمان کے لہجے میں قدرے مضمون تھی۔

”میں تمہارے اعتماد کو ٹھیک نہیں پہنچاؤں گا۔“ شاہد نے عثمان سے کہا۔ ”دو تیرے اچھا کیا کہ پولیس رپورٹ میں تمام درج نہیں کر لائی۔“

”یونوری کی مجبوری تھی۔“ عثمان نے مضامین بچھے ہوئے کہا۔ ”میرا بس نہیں چلتا کہ میں ان دو کوؤں کو قسم کر کہوں۔“

اخلاقی سے کہا۔

”لیکن دوستوں کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہو تو افسوس ہوتا ہے۔“

”کیوں نہیں مجھے واقعی ان کے گھر دیکھتے تو افسوس ہے، پیٹھے آپ لوگ۔“ انسپکٹر جمشید نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ دونوں بیٹھ گئے۔

”میں نے اپنے دوست کو بڑی امید دلائی ہے۔“ شاہد نے کہا۔

”کس بات کی۔“

”یہی کہ انسپکٹر جمشید مختلف انسان ہیں وہ ان کا مال ضرور برآمد کر لیں گے۔“

”لیقینا لیکن۔۔۔“ انسپکٹر جمشید معنی خیز انداز میں خاموش ہو گیا۔

”لیکن کیا؟“

”یہ بھی تو ہمیں اپنا دوست سمجھیں۔ تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بچتی۔“

”براہ کرم وضاحت کریں۔“ شاہد بولا۔

”یہ ہم سے بھی بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ انسپکٹر جمشید نے گہری نظروں سے عثمان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ عثمان نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن شاہد نے کہا۔

”آپ کا خیال درست ہے انسپکٹر جمشید۔ ایک شریف آدمی بہت سی مشکلات کا شکار ہوتا ہے۔ عثمان بھی ایک شریف آدمی ہیں اور سرکاری ملازم ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ سرکاری ملازم۔۔۔“ شاہد نے اتنا ہی کہا تھا کہ انسپکٹر جمشید نے درمیان سے جملہ کاٹ دیا اور کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

”مگر انہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

”میں نے عثمان سے یہی کہا کہ انسپکٹر جمشید ہمارے دوست ہیں اور اب یہ آپ کے سامنے کچھ سچ کہنا چاہتے ہیں۔“ شاہد بولا۔

”بس بات یہ ہے کہ میں سرکاری ملازم ہوں۔“

”اس بات کو بار بار نہ دہرائیں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ شاہد صاحب آپ انہیں میرے بارے میں بتا کر نہیں لائے۔“ انسپکٹر کا مودبانه خراب ہونے لگا۔

”تمہیں سب کچھ سچ بتانا ہو گا عثمان ورنہ میرا یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ عثمان آہستہ سے بولا

”اس وقت ہم ذاتی حیثیت سے بات کر رہے ہیں اور میں ذاتی طور پر کوشش کروں گا کہ ڈاکو میرے ہاتھ سے نکل کر نہ جائے یا نہیں لیکن آپ کو میرے سامنے ایک ایک لفظ سچ بتانا ہو گا۔“ انسپکٹر کا لہجہ پھر نرم ہو گیا۔

”تم پورا بھروسہ کر سکتے ہو عثمان۔“ شاہد بولا۔

آخر کار عثمان نے زبان کھول دی اور ساری روداد انسپکٹر جمشید کو بتانے لگا۔ اس نے رقم اور زیورات کی تفصیلات سے بھی انسپکٹر کو آگاہ کیا۔ انسپکٹر جمشید کو بھی اس تفصیل پر حیرت ہوئی تھی۔ بات اس کی توقع سے کہیں آگے کی تھی۔ اگر یہ پوری تفصیل میڈیا اور اخبارات کو حاصل ہو جاتی تو زبردست حاشیہ آرائی ہوتی۔ اس نے سوچا کہ واقعی اس کا اندازہ

ٹھیک تھا اس کے سامنے حقیقت نہیں آئی تھی اور دیکھتی کی اس واردات کا اصل پہلو کچھ اور تھا۔

آخر کار پوری کہانی اس کے علم میں آگئی اور اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”ٹھیک ہے سسر عثمان صورت حال ایک نئی منزل میں داخل ہو گئی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ ڈاکو میرے ہاتھ لگ جائیں اور آپ کا سب کچھ واپس مل جائے۔“

”بہت شکریہ انسپکٹر۔“ عثمان نے کہا کچھ دیر کے بعد دونوں وہاں سے نکل گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

عثمان کافی رات تک جاگتا رہا تھا۔ رات کے تین بجے کے قریب اسے سونے کا موقع ملا تھا لیکن اس کے باوجود وہ دیر تک بستر پر کمریش بدل رہا تھا کیونکہ اس واردات کے صدمے نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ دوست بھی اسے ٹھیکے رہے تھے جتنے منہ اتنی باتیں سب اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے تھے۔

غرض یہ کہ دن اسی میں گزر گیا تھا۔ نادر اور عامر

بھی اس سے اظہار ہمدردی کرنے آئے تھے لیکن اس وقت عثمان موجود نہیں تھا۔ بے رات کو وہ طرح طرح کے خواب دیکھتا رہا۔

دوسری صبح دروازہ زور سے بجاتا تو اس کی آنکھ کھل گئی اس نے چونک کر دیکھا تو ابھی صرف صبح کے سات بجے تھے۔

اتنی جلدی۔۔۔ کون ہو سکتا ہے۔ ذہن بری طرح جھکا ہوا تھا، سر میں درد کا بھی احساس ہوا۔

”کون آگیا؟“ وہ عام طور سے صبح ساڑھے آٹھ بجے تک سونے کا عادی تھا۔ دیے بھی اتنی بڑی واردات ہوئی تھی آج تو آفس بھی نہیں جانا تھا۔

دروازہ دوبارہ بجاتا تو وہ جھنجھلا گیا، ”کون ہے؟“

”میں ہوں بیٹا۔ دروازہ کھولے۔“ یہ آواز اس کے بھائی عادل کی تھی۔

”خیریت ہے عادل!“ وہ کسی قدر پریشان ہو گیا اور فوراً بستر سے نیچے آ کر آیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور دوبارہ بولا ”خیریت؟“

عادل کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور اس کے ہاتھ میں کھلا اخبار نظر آ رہا تھا۔ اس نے اخبار عثمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ خبر پڑھے“ اس نے کہا اور عثمان خبر پڑھنے لگا۔ اس کے گھر میں پڑنے والے ڈاکے کی خبر تھی لیکن اس کے علاوہ ایک اور خبر بھی تھی جس کے گرد عادل نے حاشیہ بنادیا تھا۔ اس خبر نے عثمان کو بری طرح چونکا دیا۔

یہ خبر لائن میں فرید خان کے قتل کی خبر تھی۔ کسی نے اسے کل رات نو بجے کے قریب گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ قاتل اسے قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔

”لائن میں فرید خان۔“ عثمان کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

”ہاں یہ وہی ہے نا جو ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔“ ڈاکٹر عادل نے کہا۔

”ہیں۔۔۔ لیکن۔۔۔“ اسے کیوں قتل کیا گیا؟

عادل شاہ نے کہا اور عثمان چونک کر عادل کو دیکھنے لگا۔ یہ بات صرف وہ جانتا تھا کہ ان دونوں خبروں کا آپس

میں کیا تعلق ہے۔ ایک لمحے کیلئے اسے سخت رنج ہوا اسے معلوم تھا کہ بے جا رے فرید خان کو کھٹل موقوف واردات کا گواہ ہونے کی سزا ملی ہے۔ اس نے یقیناً کسی ڈاکو کو پہچان لیا تھا اور پھر وہ اس واردات کا معنی گواہ تھا اور ڈاکوؤں کیلئے اس کا زندہ رہنا خطرناک تھا۔ بس یہی بات اس کی موت کا سبب بنی۔

عثمان کو فرید خان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا لیکن اس کے علاوہ اسے اس بات کا بھی شدید ملال تھا کہ دیکھتی کی واردات کا واحد چشم دید گواہ ختم کر دیا گیا ہے۔

کل رات نادر اور عامر نے خاص طور سے کہا تھا کہ فرید خان اس کیلئے ضروری مرہ ہے اسے ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے۔ عثمان الگ سے فرید خان سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے اس سے کچھ اہم باتیں کہیں تھیں لیکن انسپکٹر جمشید سے ملنے کے بعد اس نے فوری طور پر فرید خان سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ بات انسپکٹر کی مرضی کے خلاف ہو لیکن اب اسے فرید خان سے نہ ملنے کا افسوس تھا۔

”اسے صرف ہماری وجہ سے قتل کیا گیا ہے بیٹا۔“ عادل نے کسی قدر غور سے لہجے میں کہا۔

”سو فیصدی۔“ عثمان بے خیالی کے عالم میں بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمیں بھی مار سکتے ہیں۔“

”اس کیوں ہم نے تو انہیں نہیں دیکھا۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”فرید خان نے انہیں پہچان لیا تھا اسی وجہ سے اسے مار دیا گیا۔“

”اس باتوں۔“ عثمان نے کسی قدر غصے سے کہا پھر سنبھل کر بولا ”ہم سے تو انہیں یہ خطرہ نہیں ہے کہ ہم نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ڈاکو جو فرید خان کے گھر میں بجائے پر باہر گیا تھا اپنی نقاب اتار کر گیا تھا اور فرید خان نے اسے دیکھ لیا تھا۔“

”مگر فرید خان نے تو بیان دیا تھا کہ وہ اسے نہیں

پہچان لیا تھا۔“

”مگر فرید خان نے تو بیان دیا تھا کہ وہ اسے نہیں

پہچان لیا تھا۔“

پہچان سکتا کیونکہ وہ گھر میں فون کی لائن چپک کرنے داخل ہوا تھا اور اس نے یہ غور بھی نہیں کیا تھا کہ دروازہ کس نے کھولا۔“

”اؤ کو یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔“

”مگر انہوں نے اسے اس وقت کیوں نہیں مار دیا۔“

”یہ وہی بتا سکتے ہیں۔“ عثمان عادل شاہ کی بچکانہ باتوں سے اکتا کر بولا۔ ”ویسے بھی اس پر نیند کا غمار طاری تھا۔ پھر وہ بولا ”جاؤ آرام کرو۔ میں کچھ دیر اور سونا چاہتا ہوں۔“ وہ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن اسے دوبارہ نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر تک بستر پر کوشش بدلتا رہا اسے رہ رہ کر فرید خان کی موت کا خیال آ رہا تھا۔ جب کوشش کے باوجود نیند نہ آئی تو وہ اٹھ کر غسل خانے میں داخل ہو گیا اور ٹھنڈے پانی کے غسل سے کافی حد تک طبیعت کو بحال کیا۔

ناتشتے کی میز پر وہ اپنی والدہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ عادل نے ہوشیاری سے کام لیا اور والدہ کو فرید خان کے قتل کی خبر نہیں سنائی ورنہ اس وقت ان کی حالت کافی خراب ہوتی۔

ناتشتے سے فراغت کے بعد انہوں نے اسے مخاطب کیا ”عثمان!“

”جی ائی۔۔۔“

”آفس نہیں جاؤ گے؟“

”آج نہیں جاؤں گا امی۔“

”کیوں؟“

”میں طبیعت میں سستی ہے رات کو کھینک سے سو بھی نہیں سکا۔“

”میں بھی غمزدہ ہوں۔ میرے بیٹے کی محنت کی کمائی اس طرح برباد ہوگئی۔“

”مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے امی لیکن میں آپ کے دکھ کو جانتا ہوں مجھے پتا ہے کہ آپ کس چیز کیلئے غمزدہ ہیں۔“

”میں۔۔۔؟“ امی نے کہا۔

”ہاں۔ ابو کی نشانی وہ لاکٹ جس میں ابو کی تصویر تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ کس طرح تنہائی

میں اسے کھول کر دیکھتی رہتی تھیں اور آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آج میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے وہ لاکٹ آپ کے گلے سے اتروا کر تجوری میں رکھ دیا۔ صرف اس لیے امی کہ آپ نہ رو دیا کریں۔ آہ کاش ڈاکو سب کچھ رکھ لیں وہ لاکٹ مجھے واپس کر دیں۔“

امی پھر ابدیدہ ہو گئیں ”پھر بولیں۔“

”وہ مجھے تمہارے ابو نے رونمائی میں دیا تھا۔ اس وقت وہ بہت غریب تھے اور انہوں نے بیسیر پیسہ جوڑ کر وہ پلکا سلاکت بنوایا تھا۔ اس وقت جب سونا بھی کوڑیوں کے مول کہتا تھا۔ آج کی طرح نہیں کہ کوڑیاں بھی سونے کے مول کہتی ہیں۔“

”مجھی وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ سیل پر اشارہ موصول ہوا۔ عثمان نے موبائل دیکھا ”انسپکٹر جمشید کی کال تھی۔“ عثمان شاہ صاحب!“

”جی بول رہا ہوں۔“

”ذرا تھانے آجائیے۔“

”کوئی خاص بات سر۔“

”ہاں آجائیے۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

سب انسپکٹر ابراہیم خاں نے انسپکٹر جمشید کو اطلاع دی تھی کہ فرید خان گھر پر نہیں ملا ایک بیٹی آبادی میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا اس کی بیوی نے حیرانی سے پوچھا تھا کہ فرید خان سے اسے کیا کام ہے۔ ابراہیم خاں اسے مال کر چلا گیا تھا۔ اس نے انسپکٹر جمشید کو اس بارے میں اطلاع دیدی تھی کہ فرید خان اسے نہیں ملا کچھ صلح وہ اس سے مل کر اسے تھانے لے آئے گا لیکن دوسری صبح کے اخبارات میں فرید خان کے قتل کی خبر ملی تو جمشید بھی حیران رہ گیا۔ اسے بھی فرید خان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ بے چارہ بال بچوں والا آدمی تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسی کیس کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ وہ اس کیس کی گہرائیوں پر غور کر رہا تھا کہ ابراہیم خاں نے اندر آکر سیلیٹ کیا۔

”کیا خبریں ہیں ابراہیم خاں؟“

”سب خیریت ہے سرجی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”صحیح کو اٹھ کر اخبار نہیں پڑھتے؟“

”نہیں سرجی، گھر والی سے جھگڑا کرتا ہوں۔“

ناشتا کرتا ہوں، بچوں کو اسکول چھوڑتا ہوں پھر تھانے آجاتا ہوں۔ ابراہیم خاں کے انداز پر جمشید کو ہنسی آگئی۔ پھر اس نے کہا۔

”بیوی سے روز جھگڑا کرتے ہو؟“

”ضروری ہے سرجی۔“

”کیوں؟“

”میں شام کو واپس جاتا ہوں تو خوشامدیں کرتی ہے اچھا لگتا ہے۔“

”ایک بڑی خبر ہے۔“ جمشید نے کہا۔

”کیا سرجی؟“

”بے چارے فرید خان کو قتل کر دیا گیا۔“ جمشید نے کہا اور ابراہیم خاں بھی حیران رہ گیا۔ اس نے اخبار میں پوری خبر پڑھی پھر افسوس سے بولا۔

”یہ تو واقعی بڑی خبر ہے۔ سرجی بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”یہ کل زمان کہاں رہ گیا؟ اسے ایک کام سونا تھا ابھی تک اس کا پتا نہیں ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے اتنا ہی کہا تھا کہ کل زمان نے آفس آکر سیلیٹ کیا۔ جمشید نے گردن ہلاتی اور پھر بولا ”تمہارا بی اعتبار کر رہا تھا۔ بیٹھو تم بھی بیٹھو ابراہیم خاں۔“

”شکر ہے سر!“ دونوں بیٹھ گئے۔

”ہاں کل زمان کیا خبر ہے؟“

”آپ کا اندازہ خشک تھا سر۔ یہ وہی گینگ ہے سزیم نے رات بھر اس جگہ کی نگرانی کی ہے دو سیاہی مبرے ساتھ تھے مگر رات کو کوئی اس طرف نہیں آیا۔“

”جلیل خان والا گردہ ہے۔“

”نہیں سر، کل زمان نے جواب دیا۔“

”قلین میری اطلاعات کے مطابق جلیل تو ملک سے باہر ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”جلیل خان اگر باہر ہے تب بھی کوئی فرق نہیں

پڑتا کیونکہ اب تو اس کے گرگے اس کے بغیر بھی وارداتیں کر لیتے ہیں۔“ کل زمان یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

”یہ میری بات کا جواب تو نہیں گل زمان، مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں جلیل کے گینگ پر شبہ کیوں ہے؟“

”شبہ نہیں مجھے یقین ہے سزیم لوگ ہر واردات کے بعد اپنی جگہ بدل لیتے ہیں۔ کل رات ان میں سے کسی کا بھی فلیٹ میں نہ آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اب انہوں نے وہ جگہ کا بھی چھوڑ دیا ہے۔ آج دن میں اور پتا چل جائے گا۔“

”دفلیٹ کس کی ملکیت ہے؟“

”پلازہ کے چوکیدار نے بتایا کہ فلیٹ کا مالک سعودی عرب میں سزیم ہے اور چند روز پہلے ہی ایک بوڈھی عورت اور اس کے دو جوان بیٹوں نے وہ فلیٹ ایک اسٹینڈ ایجنٹ کے ذریعے کرائے پر حاصل کیا تھا۔“

”اسٹینڈ ایجنٹی والے اتنی تحقیق کہاں کرتے ہیں انہیں تو اپنے کاروبار سے غرض ہے۔“

”وہ بوڈھی عورت کون ہو سکتی ہے؟“

”وہ تو کسی کی بھی ماں یا خالہ ہو سکتی ہے سزیم لوگ مکان وغیرہ حاصل کرنے کیلئے اور پھر مکمل داناں کو دکھانے کیلئے کسی عورت کو غرور سامنے رکھتے ہیں یہ انتظام تو ہر بوڈھی جانتا ہے اصل بات یہ ہے کہ اب وہ لوگ شہر کے کس حصے میں ہیں؟“

”جب وہ لوگ پچھلی واردات کے بعد اپنی پرانی کہیں گاہ سے اس فلیٹ میں منتقل ہوئے تھے تو اس وقت بھی ان کی تلاشی میں چار پانچ روز لگ گئے تھے مگر خوش بخت نہ ہونے کے باعث ہم ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکے تھے۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بار وہ شہری چھوڑ گئے ہوں۔“

”وہ پیشور لوگ ہیں سزیم کا کام ہی کم ہے اور یہ کام اس بڑے شہر میں کرتے ہوئے انہیں بہت سی سہولتیں دیتی ہیں۔ اس تنہا شہر میں خود کو چھپانا ان کیلئے بہت آسان ہے۔“ کل زمان نے اپنی رائے کا

اظہار کیا۔

”ہمارے غمروں کا کیا حال ہے؟“

”وہ بھی لگے ہوئے ہیں سرالیتہ گینگ کے ایک آدمی کو گزشتہ ایک ماہ کے دوران تین جارحیتہ بین ماؤں کے ایک پلازہ میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔“

”گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ اردلی نے انسپکٹر کو عثمان کے آنے کی اطلاع دی۔ انسپکٹر جمشید نے عثمان کو اندر بلوایا اور گل زمان کو اشارہ کیا، گل زمان باہر نکل گیا تھا۔ عثمان اندر داخل ہو گیا تھا جمشید کے اشارے پر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اب اس ڈیوٹی میں ایک کل کا اضافہ ہو گیا ہے آپ نے آج کا اخراج تو پڑھ ہی لیا ہوگا۔“

”جی ہاں مجھے فریڈ خان کے قتل کی اطلاع مل چکی ہے، بہت افسوس ہوا۔“ عثمان نے آہستہ سے کہا۔

”اب صرف افسوس کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ انسانی جان مال و دولت سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس معاملے کو جلد از جلد حل کیا جائے۔“

”میں تو آپ سے ہر تعاون کیلئے تیار ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کو ساری بات بتادی ہے۔“ عثمان کے لہجے میں کل والی جھجک ختم ہو گئی تھی۔

”پہلی بات تو یہ ہے عثمان صاحب کہ یہ کیس آپ کے بھرپور تعاون کے بغیر حل نہیں ہو سکتا لہذا میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس سلسلے میں جس کیس کی پرہنجی شک ہو اس کا نام اور بتائیے۔“

”تو یہ بڑی مشکل بات ہے انسپکٹر صاحب“ حالانکہ مجھے توکل سے اپنے سامنے تک پر شبہ ہو رہا ہے کہ شبہ کو یقین میں تبدیل کے بغیر کسی کا نام بتانا تو زیادہ کی بات ہے وہ ہتھیار خواہنا پولیس کی زد میں آجائے گا اور شبہ بے مقصد ثابت ہوئے تو میرے اور آپ کے تعلقات بھی کشیدہ ہوں گے بہتر ہے کہ

آپ اپنے طور پر ہی تحقیقات کریں اس سلسلے میں مجھے معاف ہی رکھیں تو بہتر ہے۔“ عثمان نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

”میرے علاقے میں کل اتنا بڑا ڈاکہ پڑا ہے عثمان صاحب اور پھر ایک بے مقصد سا آدمی اس سلسلے میں مارا بھی جا چکا ہے میں مزید کسی غفلت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا بہت ممکن ہے کہ مجرموں کے آئندہ اقدام اور بھی خطرناک ہوں۔ لہذا پلیز آپ مجھے۔۔۔ انسپکٹر کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا۔

”آپ کو چاہیے تھا کہ کل ہی اس لائن مین کو اپنی حفاظت میں لے لیتے۔“

”ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں یہ آپ ہم پر جھوٹ دیں اور ہمیں مشورے نہ دیں۔“ انسپکٹر نے کس قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”سوری سر میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ عثمان نے جلدی سے معذرت کی۔

”ہمارے آدمی نے کل رات آٹھ بجے تک اس کا انتظار کیا تھا۔“ انسپکٹر جمشید نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا۔

”اس کی موت کی خبر کب ملی؟“

”آج صبح اس علاقے کے ایس ایچ او نے بتایا ساتھ ہی کچھ اور تفصیل بھی۔“

”پوچھ سکتا ہوں کیا؟“ عثمان نے کہا۔

”ہاں رات کو نو بجے کے قریب فریڈ خان واپس آ گیا تھا۔ پھر وہ کھانے سے فارغ ہوا تھا کہ کوئی اسے بلانے آیا۔ وہ باہر نکلا پھر واپس نہیں آیا اسے گلی سے دور ایک میدان میں لے جا کر گولی ماری گئی۔ اس کی لاش کے بارے میں محلے کے لوگوں نے بتایا۔ اس کی بیوی نے آپ کے گھر پڑنے والے ڈاکے کے بارے میں بھی بتایا جس میں پولیس نے اسے بھی شامل تفتیش کر لیا تھا۔ اس علاقے کے تھانہ انچارج کا بھی یہی خیال ہے کہ ڈاکے اور فریڈ خان کے قتل کا واقعہ ایک دوسرے سے ملتا ہے۔“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“ جمشید نے کہا۔

”کیا۔۔۔؟“

”یہی کہ آپ ہم سے تعاون نہیں کر رہے اور یہ آپ کے حق میں بھی برا ثابت ہو سکتا ہے۔“ انسپکٹر نے سر دھکے میں کہا۔

عثمان کو اندازہ ہو گیا کہ واقعی صورت حال اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ انسپکٹر کو ناراض کرنا کسی طور مناسب نہیں ہے اور پھر اب تو وہ اس کا راز دان بھی بن چکا ہے لیکن سمجھ میں آتا تھا کہ وہ کس پر شبہ کا اظہار کرے آخر کار اس نے کہا۔

”میں جانتا ہوں انسپکٹر صاحب کہ آپ میرے لیے ٹھکانہ کام کر رہے ہیں لیکن۔۔۔“

”غلط خیال ہے آپ کا۔“ جمشید نے بات درمیان سے کاٹ دی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”میں کوئی کام آپ کیلئے نہیں کر رہا۔ میں صرف اپنے فرض سے متعلق ہوں۔“

”پینک، پینک۔“ عثمان جلدی سے بولا اور پھر کہنے لگا ”میں آپ کو اپنے عزیز واقارب اور دوستوں کے بے شکوہ دیتا ہوں۔“ ابھی عثمان نے اتنا ہی کہا تھا کہ جمشید نے پھر اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

”نہیں مسٹر عثمان اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں ان سب کے بارے میں جھان بین کر سکا پھر ان آپ کچھ خاص نام مجھے بتا دیں لیکن وہ لوگ جن پر آپ کو واقعی شبہ ہو۔“

عثمان اب سمجھ میں پڑ گیا، پھر بولا ”یہ ایک مشکل کام ہے۔“

”لیکن یہ آپ کو کرنا ہوگا۔ آپ ایک دولت مند انسان ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ آپ نے یہ دولت ناجائز ذرائع سے کمائی ہے مگر یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہو گے کہ کون کون شخص آپ کی اس ناجائز کمائی کے بارے میں جانتا ہے اتنا بڑا ڈاکہ بخبری کے بغیر نہیں پڑ سکتا۔“

عثمان گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ انسپکٹر بے حد چالاک آدمی ہے اور بہت

گہرائیوں میں اتر گیا ہے۔ وہ بات اس کے ذہن میں گہجی کچھ کے ڈال رہی تھی کہ معاملہ بخبری کا ہی ہے۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا جو اس کی اس زندگی کے بارے میں جانتے تھے۔

”آپ اب بھی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔“

”وہ۔۔۔ دراصل انسپکٹر صاحب۔“

”دراصل کچھ نہیں ہوتا صرف اصل ہوتا ہے۔“

”وہ میں نام آپ کو بتا رہا ہوں۔“

”جی، انسپکٹر نے رائٹنگ پیڈ سامنے سر کا لیا اور عثمان نے پانچ ایسے نام بتادے جو اس کی نظر میں مشکوک تھے لیکن اس کا دل لرز رہا تھا یہ نام لیتے ہوئے یہ بہت خوفناک انکشاف تھا اگر وہ مرزا شاہد کے کہنے پر اپنی دولت کے بارے میں اعتراف نہ کرتا تو یہ نوبت نہ آتی لیکن اب وہ خود بھی مجرموں کی فہرست میں شامل تھا۔

”وہ انسپکٹر صاحب“ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا نام کہیں بھی سامنے نہیں آئے گا۔“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے جمشید پھر بول پڑا۔

”لیکن یہ لوگ آخر سمجھ ہی جائیں گے۔“

”وہ مجبوری سے جس کیلئے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اب یہ صرف ڈاکے کا کیس نہیں بلکہ کل کا کیس بن چکا ہے۔“

”ہاں مجھے اندازہ ہے۔“ عثمان نے کمزور لہجے میں کہا۔

”جھک ہے آپ چاہیں تو جا سکتے ہیں۔“ جمشید نے کہا اور عثمان اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ گردن تک دلدل میں پھنس گیا ہے۔ دولت چلی گئی تھی یہ ذات خود بہت بڑا لہجہ تھا۔ جس کا اسے بے حد درجہ قائلین فریڈ خان کے قتل کے بعد تو یہ کیس انتہائی سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا اور اب وہ خود بھی خطرے میں پڑ گیا تھا جس کا اسے پوری طرح احساس تھا۔

☆.....☆.....☆

ان میں سے صرف دو کل رات گھر سے نکلے تھے۔ ان کے علاوہ ان تینوں نے اپنے آپ کو اس مکان میں بند رکھا تھا۔ خوف کے احساس نے انہیں اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ لوٹی ہوئی رقم اور اشیاء انہوں نے گھر کے مختلف حصوں میں چھپادی تھیں۔ گھر میں انہوں نے کھانے پینے کی اشیاء کا کافی ذخیرہ کر رکھا تھا اس لیے انہیں اس کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ان تینوں میں سے کسی کی بھی عمر بیس یا بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

رات گہری ہو گئی تو وہ تینوں گھر کے ایک کمرے میں جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا "تم نے اپنے ماموں سے اس گھر کی چابی لے کر بہت اچھا کیا ہے ناصر۔"

"ہاں یہاں ہمیں بہت آرام ہے فرہاد۔"

"میں نے کرائے کے گھر کی اس لیے مخالفت کی تھی۔" تیسرے نے کہا۔

"پولیس سارے ہتھکنڈے جاتی ہے، کرائے کے گھر کا وہ آسانی سے سراغ لگا سکتی تھی۔"

"ماموں سے تم نے کیا کہا تھا؟"

"اتفاق سے وہ کچھ عرصے کیلئے ملک سے باہر جا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پرسکون رہ کر اسٹری کرنا چاہتا ہوں اس لیے گھر کی چابی مجھے دے دیں۔"

"ویری گڈ۔۔۔ اور تم خوب اسٹری کر رہے ہو۔" فرہاد نے ہنس کر کہا۔

"ہاں گھر کے لوگ یہی سمجھ رہے ہیں۔"

"ہم تینوں ہی بڑے ہونہار بنچے ہیں" ناصر نے کہا اور تینوں ہنسنے لگے۔

"تیسرے جو ان کو کمال نے کہا۔

"یقیناً ہوگی وہ ہماری پوری خبر گیری رکھتے ہیں اور پھر ڈاکے کی خبر اخبار میں بھی چھپ چکی ہے۔"

فرہاد نے کہا۔

"خبر نے اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں لکھا تھا۔"

"تو پھر؟ اس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب ہے جلیل خان صاحب نے اس معمولی ڈاکے پر غور بھی نہیں کیا ہوگا حالانکہ ہم دس لاکھ کا حصہ دے چکے ہیں۔"

"خان صاحب خوش نہیں تھے۔"

"وہ خوش کہاں ہوتے ہیں۔ سب کچھ خود ہی ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔"

"یاد رہے بڑا خبر آدمی ہے اسے اصل رقم کا اندازہ ہے، کمال نے کہا۔

"معلوم ہے تو معلوم رہے۔ سب اسے ہی تو نہیں دے سکتے ابھی تو دوسرا حصہ دار بھی آنے والا ہے۔"

"یاد رہے بڑے تکلیف کی بات۔"

"کیا؟"

"ہم تک تک حصے بانٹتے رہیں گے۔ محنت ہم کریں زندگی کی بازی ہم لگائیں اور آدھی سے زیادہ رقم بڑے دار لے جائیں ہمیں کیا ملتا ہے؟"

"نہیں ایسے مت سوچو ہماری حفاظت بھی تو کی جاتی ہے۔ اتنی رقم ہم ساری عمر نوکریاں کر کے بھی نہیں جمع کر سکتے تھے۔ بس تھوڑا وقت اور اس کے بعد ملک سے باہر نکل جائیں گے اور اس کے بعد عیش و عشرت۔"

"واقعی یہ خیال سب سے خوبصورت ہے۔"

"اور سب سے بھیانک بھی۔"

"بھیا نک کیوں؟"

"ڈیڑھ دو سال میں ہم ایک رات بھی سکون کی نیند نہیں سوئے ہیں۔"

"کچھ کرنے سے کچھ ملتا ہے دوست دنیا کو غور سے دیکھو اور خود کو دیکھو اپنی ہی بات لے لو چٹیک ڈیڑھ دو سالوں سے تم سکون کی نیند نہیں سوئے لیکن ان ڈیڑھ دو سالوں میں تم نے پوری شان و شوکت سے اپنی بہن کی شادی کی اپنے والد کی بانی پاس سرجری کرائی جس پر لاکھوں خرچ ہوئے اپنی ماں اور بھائی کو فلیٹ خرید کر دیا۔ یہ سب بیچہ ان بے سکون راتوں کا ہی صلہ ہے۔"

"ہاں تو ہے۔"

"وہ ایک کام بہت خطرناک ہوا ہے۔"

"کیا؟"

"ایک خون بھی ہمارے سر آ گیا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"یہ بھی تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ تمہارا بڑا دشمن تھا، بس ڈرامیٹر کے کیلئے میرا چہرہ کھل گیا، فادر اس نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن اس حد تک جانے کی کمازورت تھی؟"

"ضروری تھا یار! اور نہ خطرہ ہی خطرہ تھا۔"

"یار چھوڑو ان باتوں کو۔ آگے کی سوچا ب کیا کرنا ہے؟"

"ہاں یہاں سے منتقل کرنا ہے ویسے فی الحال یہ بیک محفوظ ہے۔"

"اور وہ دوسرا حصہ دار؟"

"ہاں! دوسرے نے گہری سانس لی پھر بولا "آج کی رات تو یہاں گر اداری ہوگی۔ فرید خان کے قتل کے بعد تو پولیس بری طرح ہماری تلاش میں لگ جائے گی۔"

"کوئی ثبوت تو نہیں چھوڑا ہم نے پولیس ہم پر خیر کیوں کرے گی؟"

"او یا بچوں کی سی بات نہ کرو پولیس کو معمولی نہیں ہوتی۔"

اس وقت دروازے کی تین بج چکی تھی اور ان کے روتے کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر شدید خوف کے آثار ابھر آئے۔ تینوں نے بھڑکی سے ریو اور نکال لیے تھے۔ اس گھر کا کوئی بچھلا دروازہ بھی نہیں تھا جہاں سے فرار ہوا جاسکتا تھا اور پھر کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ ناصر نے کمال کو اشارہ کیا اور کمال کی سی چال چلتا ہوا پورے بیچ میں آگیا جہاں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح آگے بڑھ کر ایک دیوار کے پاس پہنچ گیا۔

"تم ادھر" ناصر نے سرگوشی کی اور اس کے اشارے پر فرہاد ہیٹ پر چلا گیا۔

گھٹی دو بارہ بجی تو کمال نے ہولے ہولے سر اٹھا کر بڑی احتیاط سے باہر جھانک کر اس کی جان میں

جان آئی۔ اس نے گھٹی بجانے والے کو پہچان لیا۔ یہ پچاس بیس سال کی عمر کا ایک مجبور سا آدمی تھا اس کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ نشے میں دھت ہے۔

"خدا تمہیں غارت کرے آؤ مرد" کمال نے گیس کھول کر اسے اندر کھینچ لیا۔ وہ نشے میں لڑکھاتا اندر آ گیا۔ ناصر اور فرہاد نے بھی اسے پہچان لیا تھا وہ سب پھر اٹھنے ہو گئے۔

"تم اس وقت کیوں آئے چچا سکندر؟" کمال نے بتائی سے کہا۔

"ضرورت کا کوئی وقت نہیں ہوتا پیارے بچو گرم نے یہ اسلحہ کیوں نکال رکھا ہے۔ کیا چانداری کر رہے تھے؟ نشے میں ڈوبے شخص نے کہا۔

"تم یہاں کیوں آ ہو؟" ناصر غرایا۔

"کیوں۔۔۔ میرا حصہ نہیں دو گے؟"

"ہم نے کہا تھا تمہارا حصہ تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔"

"اور میں نے کہا تھا کہ میں خود اپنے آ جاؤں گا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ پولیس ہمیں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔"

"دو پولیس کا کام ہے۔ تم اپنا کام کرو کتنا مال نکلا؟" سکندر نشے میں ضرور تھا لیکن اپنے کام میں چوس نظر آ رہا تھا۔

"چھوڑو چچا نام ہے سکندر اور قدیر کے بندر۔" ناصر نے کہا۔

"کیوں کیا ہوا؟" سکندر نے پوچھا۔

"تمہاری اطلاع غلط تھی۔" ناصر بولا۔

"وہ کیسے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"آٹھ دس ہزار روپے اور چند زیورات۔ بس یہ نکلا۔ کہہ کر ناصر نے بیب سے ایک لفافہ نکالا اور سکندر کی طرف بڑھا دیا۔

"سکندر رو پے ہیں اس میں؟" سکندر نے پوچھا۔

"بانتھ بڑا بھتی تمہارا حصہ جتا ہے۔"

"دعوت میں نہیں ہے۔ غلط کہہ رہے ہو" سکندر نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بہی بچ ہے چچا سکندر تم نے بلا دیا ہم سے اتنی محنت کرانی۔ اتنا خطرہ مول لیا ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ یقین نہ آئے تو اخبار میں ڈاکے کی تفصیل پڑھ لینا۔ چلو شاباش پیسے رکھو اور چھوٹو بھاس سے۔“ ناصر نے ہاتھ میں دھیرے دھیرے لوہور کا انگلیں میں بچاتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ سکندر نے لفاظی جیب میں رکھا اور بولا ”چلتا ہوں“

”احتیاط سے جانا چچا اور کوئی اچھی سی ٹپ لاؤ تاکہ تمہارا بھی کام بنے اور ہمارا بھی۔“ بوڑھا خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

عثمان تین دن کے بعد دفتر آیا تھا۔ اس کے گھر پڑنے والے ڈاکے کی خبر سب کو سنی۔ دفتر کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے انفسوس کرنے لگے۔ بڑے افسران نے بھی اسے آفس بلوا کر اظہار انفسوس کیا۔ ظاہر ہے اس نے یہاں بھی لوٹی جانے والی رقم کی تفصیل نہیں بتائی لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ بات چھپوئی ہی نہیں جس سیٹ پر عثمان ہے وہاں دولت کی بارش ہوتی ہے۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور سکرادے تھے۔

”ساتم نے۔۔“ انور علی نے نوید شان سے کہا۔

”کیا؟“

”چند ہزار اور تھوڑے سے زور۔“

”ڈاکوؤں کو کوئی کر لینا چاہیے۔“

”ابے نہیں یارب ایک دوسرے کو ریٹ دے رہے ہوں گے یہ چند ہزار یعنی چند انہیں بیچیں پچاس لاکھ سے ضرب دے لو۔“

”چھوڑو یارب تم کیسا۔“

”بس اس بھجوت پر ہنسی آرہی ہے۔“

”بری بات“ الیاس بیگ نے کہا ”آج کل جھوٹ پر ہستہ نہیں۔“

”پس کس سبب نہیں پڑے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ عثمان ذہنی طور پر بہت پرانگندہ ہو چکا تھا اتنا بڑا مالی نقصان اور اس پر مستزاد یہ کہ اس نے اپنے قریبی حلقے میں سے پانچ افراد کے نام بھی انیسٹر جنسید کو بتا دیئے تھے۔ ان

پانچوں کا تصور ذہن میں آتے ہی عثمان کے اندر ایک احساس جرم بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ ان میں سے ایک نام ایسا تھا جو عثمان کے شبے کی بنیاد پر کم اور انتقام کے باعث زیادہ شدت رکھتا تھا۔ بانی چارنامہ ہٹانے پر اس لیے مجبور تھا کہ ان کے سوا اس کی دولت کا حقیقی اندازہ کسی اور نہ نہیں تھا۔ نادر اور عامر پر تو وہ رور کر کف انفسوس مل رہا تھا مگر وہ کیا کرتا ”انیسٹر جنسید نے اسے مجبور ہی اتنا کر دیا تھا۔“

اب اسے یہ خیال آرہا تھا کہ نادر اور عامر اگر بدنیت ہوتے تو انہیں اس ڈاکے کی پشت پناہی کی ضرورت کیا تھی۔ ان کے نام عثمان نے لاکھوں روپے مالیت کے پلاٹ خرید رکھے تھے اور اگر وہ دونوں چاہتے تو اس پلاٹ سے سکر جاتے کہ وہ جائیداد عثمان کی نہیں بلکہ ان کی ہے باقی دو نام دفتر کے ساتھیوں کے تھے جن سے عثمان کی دفتری رقابت تھی اور وہ لوگ جانتے تھے کہ عثمان کے پاس بے پناہ دولت ہے۔

جس بات نے عثمان کو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ دودن گزر جانے کے باوجود انیسٹر جنسید کی طرف سے کسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا نادر اور عامر سب تو اس کے گھر آرہے تھے اور آج اس دفتر میں آکر علم ہوا کہ اس کے دفتری رقیب بھی حسب معمول اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے کام میں مشغول ہیں۔ کل شام زار سے بھی بات ہوئی تھی اور وہ اس سے ملنے کیلئے اسی طرح جتا رہی تھی جیسے پہلے ہو کر تھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انیسٹر جنسید بھی اس کیلئے کچھ نہیں کر رہا تھا۔

عثمان دن میں دوسرے انیسٹر جنسید کو ضرور فون کرتا مگر وہ تھا نے میں موجود نہ ہوتا البتہ کل رات وہ فون پر مل گیا اس نے بتایا کہ وہ بہت جلد عثمان کو خوشخبری سنا دے والا ہے۔ یہ بات معمول کے لمحے میں کہی گئی تھی لہذا عثمان اسے غفلت کیلئے سے زیادہ گردانتا تو اس کی بیوقوفی ہوتی۔ سر مرزا شاید بھی اس دن کے بعد سے غائب تھا۔ آج صبح دفتر جانے سے پہلے عثمان اس کے گھر گیا تو وہ کسی ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ عثمان ان کے گھر پر اپنا زوننگ کارڈ چھوڑ کر گیا۔

عثمان اسی ادھیڑ میں بیٹا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف شاہد تھا ”ہیلو عثمان تم جلدی سے سی آئی اے سینٹر پہنچ جاؤ۔“

”کوئی خاص بات ہے شاہد؟“

”وقت برباد مت کرو یا راجو کہہ رہا ہوں وہ کرو میں تمہیں گیٹ پر مل جاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے شاہد نے فون بند کر دیا۔ عثمان نے اپنے سینٹر کو بتایا کہ وہ ضروری کام سے باہر جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی میں دیر ہو جائے یا پھر وہ آج لوٹ کر نہ آئے۔

تھوڑی دیر بعد عثمان کی گاڑی سی آئی اے سینٹر کی طرف برق رفتاری سے جاری تھی۔ اس کے دماغ میں شاہد کے الفاظ گونج رہے تھے اس کا مطلب ہے کہ معاملہ سی آئی اے تک پہنچ گیا ہے یہ بات عثمان کی سمجھ سے بالا تھی جب اس کی گاڑی سی آئی اے سینٹر کے قریب پہنچی تو خوف کی ایک لہر اس کے دل میں موجزن ہو کر رہ گئی شاہد حسب وعدہ گیٹ کے قریب کھڑا تھا۔

”مبارک ہو عثمان۔“ مرزا شاید نے اس کی طرف لپکتے ہوئے کہا ”مگر یا تم نے تین دن سے میرا مونا جاگنا حرام کر رکھا ہے۔“

”کیا ڈاکو پکڑے گئے؟“ عثمان نے جیتابی سے پوچھا۔

”باقی تفصیلات تھوڑی دیر بعد“ شاہد نے کہا اور اسے لیے ہوئے ایک بڑے افسر کے کمرے میں پہنچ گیا یہاں انیسٹر جنسید بھی موجود تھا۔ انیسٹر جنسید نے انیسٹر جمید کا تعارف عثمان سے کرایا۔ تھوڑی دیر بعد عثمان کو اندازہ ہو گیا کہ کمرے کا ماحول نسبتاً بے تکلف ہے اور دونوں انیسٹروں کی آپس میں خاصی اندر سٹینڈنگ ہے۔ انیسٹر جنسید نے شاہد کو مخاطب کر کے کہا۔

”عثمان صاحب کو مبارکباد دی ہے یا نہیں“

”مبارکباد کے حق تو آپ لوگ ہیں شاہد کے لمحے میں خوش اور طمانیت تھی۔ عثمان بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ انیسٹر صاحب۔“

”اگر انیسٹر جمید تعاون نہ کرے تو شاید یہ معاملہ اتنی آسانی سے قابو میں نہ آتا۔“

”ہاں جی اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“ شاہد نے توصیفی نظروں سے انیسٹر جمید کو دیکھتے ہوئے کہا جو منکسرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر انیسٹر جمید نے اپنے دائیں جانب رکے شیلف میں سے ایک پتلی اور ایک بریف کیس نکال کر عثمان کی طرف بڑھا تے ہوئے کہا۔

”آپ کی امانت ہے عثمان صاحب اگر اس میں کوئی کمی بیشی ہے تو اس کی ذمہ داری پولیس پر عائد نہیں ہوتی۔“

عثمان نے بے تابی سے بریف کیس کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور پھر حسیں میں زیورات کے ساتھ ساتھ وہ یادگار لاکٹ بھی تھا جو اس کی والدہ کی زندگی بھر کا حاصل تھا۔ خوشی سے عثمان کا پورا وجود زربہا تھا۔ اس نے ممنون نگاہوں سے باری باری کمرے میں موجود تینوں لوگوں کو دیکھا اور بولا ”میں آپ لوگوں کا کس طرح شکریہ ادا کروں؟“

”میں بھی زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔“ شاہد نے بھی دونوں انیسٹروں سے کہا ”آپ لوگوں نے واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔“

عثمان نے اپنے آپ کو سنہاتے ہوئے انیسٹر جنسید سے پوچھا ”کیا میرے بتائے ہوئے کسی کام بھی اس ذمہ میں تھا تھا؟“

”اگر ہم آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے تو شاید کبھی بھی جرموں کو نہ پکڑ سکتے۔“ انیسٹر جنسید نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ تو محض اتفاق ہے کہ۔۔۔“ انیسٹر جنسید ابھی اپنا جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ دوسرا بے پتھکڑی لگے ہوئے ایک شخص کو اندر کمرے میں لائے ”اسے خاص طور پر آپ کیلئے بلوایا ہے۔“ انیسٹر جمید نے عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”اس کا نام سکندر ہے اور یہی اس ڈاکے کا اصل محرک ہے۔“

عثمان کو جیسے کرنٹ لگ گیا ہو وہ اچھل کر اپنی

زہر عشق

خوف اور رگوں میں لہو جمادینے والے مناظر سے بھر پور عشق کی ایک ایسی ناقابل یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ جگہ کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 14

صنوبر اپنی ماما کے اس رویے پر ایک دم ہی پریشان ہو گئی مگر کوئی اس کے دل و دماغ میں گھس کر اس سے مسلسل یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو جماد کو اس گھر میں رکھنا ہے۔ کیوں؟ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

”ماما یہ جو نہیں ہے۔ یہ تو جماد ہے۔“ صنوبر نے سچل کر کہا۔
”میں جانتی ہوں یہ جماد ہے مگر یہ جس طرح یہاں سے گیا تھا۔ بتا سکی کو کچھ بھی بتائے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اس نے ضرور چوری کی تھی ورنہ اس طرح جانے کی کیا ضرورت تھی؟“ در شہوار نے جماد کی طرف بڑھتے ہوئے اور غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ جماد کو ایک ہی دھکے میں بیڑھیوں سے دھکیلنے والی ہے۔

ایک ایک صنوبر نے بیڑھیوں کا ایک اسٹیپ عبور کر لیا اور اب وہ عین جماد کے سامنے کھڑی ہوئی تھی جماد اس کی پشت پر تھا۔ وہ بولی۔

”یہ مجھے بتا کر گیا تھا ماما۔۔۔ آئیں میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر صنوبر واپسی کے لیے اس طرح مڑی کہ اس کے ہاتھوں میں اپنی ماں کا ہاتھ تھا۔ جماد بھی نیچے اترنے لگا اور پھر تینوں نیچے والے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

صنوبر اور در شہوار یہ مصروف پرہیز اوجھان ہو گئیں اور حماد چپکے سے وہاں سے کھسک کر بچن میں چلا گیا۔ وہ وہاں آیا تو اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔ جس میں سیلنڈر سے دو کپ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے چائے میز پر رکھی اور کہوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ در شہوار اس کی طرف دیکھنے لگی حالانکہ وہ کہتا چاہتی تھی کہ ابھی تو اسے رکھنے کا فیصلہ بھی نہیں ہوا اور اس نے کام شروع بھی کر دیا مگر وہ کہہ نہ سکی اور چپ رہی اسے چائے کا وہ ٹیسٹ یاد آ چکا تھا جو جماد کے ہاتھ کی چائے میں دنیا میں سب سے جدا تھا اور اس ٹیسٹ کو محسوس کر کے اسے جیسے جماد کی چائے اور اس کا کیا ہوا ہر کام یاد آنے لگا۔ اسے لگا کہ اس جادو گر لڑکے کو نہ رکھنے کی غلطی اسے نہیں کرنی چاہیے ورنہ یہ کہیں اور چلا گیا تو وہ ان سب چیزوں سے محروم ہو جائے گی جن کی وجہ سے اسے زندگی میں ایک نئے لطف اور روانی کا سوا آنے لگا تھا۔

چائے کا ایک کپ لیتے ہی وہ جیسے ایسے سرور ہوئی کہ اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ جلدی جلدی وہ ساری چائے پی گئی اور جماد کی طرف دوسرے کپ کی جاہت سے دیکھنے لگی۔ جماد کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی اس لیے اس نے پہلے سے ہی کافی بنائی تھی۔ صنوبر ابھی چائے پی رہی تھی اور دل ہی دل میں یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ جو کام اتنی دیر سے اس

کے سارے دلائل اور اس کی تائید نہیں کر پائیں وہ حماد کی ایک کپ چائے نہ کر دیا تھا۔ وہ حماد کی اس ہوشیار پر اس کی صلاحیت کی قابل ہوجی تھی کہ وہ جانتا تھا اس کی چائے میں کیا جادو چھپا ہوا ہے۔ اسے خود بھی حماد کی چائے میں بہت لطف و سرور ملتا تھا لیکن یہ شاید اس سرور سے کچھ کم تھا جو اس کی ماما کو مل رہا تھا۔ چائے کا دوسرا کپ ختم کرنے کے بعد در شاہوکار روپہ کا بی مصنوعی کا ہو گیا وہ بوئی ہوئی۔

”تم کیا سمجھتے ہو چائے پلا کر مجھے راضی کر لو گے اور میں بھول جاؤں گی کہ تم کیسے چوروں کی طرح یہاں سے گئے تھے۔“

صنوبر نے ہاں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مجھے معلوم ہے آپ اسے معاف کر چکی ہیں اب کیوں بے چارے کو پریشان کر رہی ہیں۔“ دیکھتے ہی حماد نے فوراً اپنی حرکت کی معافی مانگنا شروع کر دی اور در شاہوکار کو یقین دلایا کہ اب وہ ایسا بھی نہیں کرے گا۔ یوں حماد کی فکری پھر سے اس گھر میں بکھری۔

حماد نے صنوبر کے چہرے سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے اور اپنی اس پریشانی میں بھی اس نے اس کی مجبوری کو سمجھا اور اسے اپنے گھر میں پھر سے ملازمت دلوانے میں دل و جان سے کوشش کی۔ صنوبر پریشان سے مگر وہ نہیں جانتا کہ کیوں؟ اب وہ سوچ رہا تھا کہ صنوبر کی پریشانی کیسے معلوم کرے۔۔۔ اسی سوچ و بچار میں دن ختم ہو گیا اور شام ہو گئی۔ کوئی بھائی نہیں مل رہا تھا کہ وہ صنوبر کے پاس جائے اور اس سے اس کی پریشانی کی بابت پتا کرے۔ سوچ کے دائرے بنتے اور بڑھتے چلے جاتے۔

صنوبر ادا کی اور فکروں میں گھری ہوئی تھی جاتے ہوئے وہ شرنیل سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی کہ اس سے مسلمان نے کیا کہا تھا جس سے اس کا موذی خراب ہو گیا تھا۔ اسی پریشانی میں اس نے شرنیل کو فون کیا۔ شرنیل جو خود صنوبر کو فون کرنے کا سوچ رہا تھا صنوبر کا نام اپنے موبائل پر دیکھ کر فوراً ہی فون رسپونڈ کر کے بولا۔

”ہاں صنوبر کبھی ہو تم؟“

”تم اسکول کیوں نہیں آئے؟ مجھے تم سے ملنا تھا۔“ صنوبر نے جواب دیا۔

”ملنا تو مجھے بھی تھا تم سے۔ لیکن کچھ ایسی پریشانی رہی کہ سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں؟“

”کوئی نئی بات ہوئی ہے کیا؟ جس تم سے پوچھا چاہا وہی کسی مسلمان نے تم سے کیا کہا تھا؟“

صنوبر نے ایک ہی سوال میں دو سوال کر دیے۔ دونوں سوالوں کا جواب ایک ہی تھا۔

”مسلمان نے کیا کہا یہی ہے وہ بتی پریشانی اس لیے میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔“

شرنیل نے سوچ کی لڑائی سے ایسے کہا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ اس سے پہلے کہ صنوبر کوئی اور سوال دے سکی وہ پھر بولا۔

”مسلمان نے مجھ سے کہا اچھا تو وہ تم کو جو صنوبر کی زندگی کا مشکل بنا رہا ہے۔ جانتے ہو فاروق تمہیں پانچوں کی طرح دھونڈ رہا ہے۔ اسے اگر تم کہیں بھی مل گئے تو تمہیں شاید اندازہ بھی نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔۔۔ بندہ غائب کرنا تو اس کے لیے چیلوں کا کام ہے۔“

”کیا۔۔۔ مسلمان نے یہ کیا تم سے؟“ صنوبر کی پریشانی جیسے چھت سے لگ گئی۔

”ہاں۔۔۔ ایک بار سے ہوئے آدمی کی آواز کی جو اس وقت شرنیل کے منہ سے نکلی۔

”اس لیے تم آج اسکول نہیں آئے؟“ صنوبر اس سوال کا جواب ہاں میں دینے کا مطلب تھا کہ وہ فارس سے ڈر گیا ہے۔ کچھ دیر وہ چپ رہا کیونکہ وہ نہیں تو صنوبر خود ہی بولی۔

”پھر تو تم نے بہت اچھا کیا شرنیل۔ ہمیں کسی سے بھی لڑنا نہیں ہے۔“

”ایسا نہیں ہے صنوبر کہ میں فارس کے ڈر سے اسکول نہیں آیا۔ میں یہ سوچتا رہا ہوں کہ اگر تمہارا اور میرا اشتہا ہونے سے پہلے اگر میرا فارس سے سامنا ہو گیا اور بات بڑھ گئی تو میرے لیے وہ ایک راستا بھی مشکل ہو جائے گا گوٹ میرج والا اس لیے میں احتیاطاً نہیں آیا۔ اس سے بچنا ہونے کی صورت میں یہ بات میرے اور اس کے بیٹس کو پتا چل

جائے گی اور فارس کے والد یہ جاننے کے بعد میرے والد سے شکایت کریں گے۔ اس سب کے بعد اگر میں نے تم سے کوٹ میرج کی تو وہ سمجھیں گے میں نے تنبیہ کے بعد بھی ایسا کیا ہے تو وہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیں گے اور اس طرح برا خانہ اندازہ ہو جائے گا۔ میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں مگر میرے خاندان کا تو اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ انھیں کیوں سزا ملے۔ اس لیے میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ شرنیل نے تفصیل سے اپنی پریشانی اور اپنے اسکول نہ آنے کے بارے میں بتایا۔

یہ سب سن کر صنوبر گہری سوچ میں چلی گئی اسے شرنیل کی باتوں میں سچائی اور احتیاط دونوں نظر آئے اور اسے لگنے لگا کہ ایسی صورت حال میں تو کوٹ میرج کے علاوہ اور کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ تو کیا اس کی محبت کے لیے بس یہی ایک راستا باقی بچا ہے؟“

وہ سوچتی رہی اور اوجھتی رہی۔ ایک مڈل کلاس لڑکی کے لیے کوٹ میرج کرنا جتنا مشکل ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل اس وقت صنوبر کے لیے تھا۔ وہ کبھی بھی صورت میں اپنے ماں باپ کو اس بات پر راضی نہیں کر سکتی کہ وہ اس کی کوٹ میرج کو سپورٹ کریں اور اپنی رشتا یا شادی ہونے کی صورت میں فارس اور اس کے خاندان کو پتا چلنا لازمی تھا۔ دونوں طرف کچھ دیر تک خاموش رہی پھر صنوبر نے کہا۔

”مجھے تم سے ملنا ہے شرنیل“

”میں بھی تم سے ملنا چاہتا ہوں صنوبر“ شرنیل کی گہری اور بھاری سی آواز میں جو بے بسی چھپی ہوئی تھی اسے صنوبر نے محسوس کر لیا۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس سے کیسے اور کہاں مل سکتی ہے۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم نہاں گھر ملیں؟“ صنوبر نے اپنی دوست کا نام اپنا تو شرنیل فوراً ہی سمجھ گیا کہ صنوبر کس نہاں کی بات کر رہی ہے۔

”اچھا ایک بات بتاؤ کیا میرا بھائی مسلمان تم سے ملنے کے بعد یہ جان چکا ہے کہ تمہارے والد کو ان میں اور تم کس خاندان سے ہو؟“ صنوبر کے ذہن میں اچانک ایک اور پریشانی نے سر اٹھایا۔

”کیوں۔۔۔ تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“ شرنیل نے سمجھتے ہوئے بولا۔

”اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اگر وہ یہ بات جانتا ہے تو وہ یہ بات اب تک فارس کہنے کو بتا چکا ہوگا۔“

”اوہ ہاں۔۔۔ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ شرنیل ایک دم ہی جیسے اچھل سا گیا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان میرے بارے میں کتنا جانتا ہے۔“ شرنیل کی آواز میں جو تشویش تھی اسے محسوس کر کے صنوبر کو لڑکے پھر تو شرنیل کا کہیں بھی نگنا خطرناک سے خالی نہیں ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اب کیا کرے۔ اس طرح تو وہ شرنیل سے مل ہی نہیں سکتی۔ اور یہ بات اس کی روح تک اترنے والے دکھ کی طرح تکلیف دہ تھی۔ وہ ابھی سوچوں کی لکھاؤں میں اتری ہوئی تھی کہ شرنیل بولا۔

”چنانچہ تمہارا بھائی کس سوچ کا مالک ہے جو تمہیں ایک غنڈے کے ہاتھوں سوخیے پر راضی ہے۔ کیا بھائی بھی ایسے ہوتے ہیں۔ میری کوئی بہن ہوتی تو چاہے مجھے کوئی قیمتی اقدار کی پڑتی میں ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہونے دیتا۔ یہ بات میں نے مسلمان سے سمجھی کبھی تھی۔“

”تو اس نے کیا کہا؟“ صنوبر نے اپنے بے حس بھائی مسلمان نے بارے میں سوچتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”کہ نہیں ہے وہ یہ سن کر بس چپ رہا۔“ شرنیل نے کہا تو صنوبر کا دل زور سے دھڑکا اور وہ بولی۔

”میں تمہیں کچھ دیر بعد پھر سے فون کر لی ہوں“ اس سے پہلے کہ شرنیل یہ پوچھتا کہ کیا وہ اوادہ کیوں بات کو درمیان سے منقطع کر رہی ہے صنوبر نے فون بند کر دیا۔

فون بند کرتے ہی صنوبر کے دل میں جس خیال نے اپجمل چائی تھی وہ اس کے تصدیق کے لیے مسلمان کے کمرے کی

”تمہیں یاد ہے سلمان بچپن میں جب ماہر پایا کی ٹرائی ہوتی تو ہم دونوں ایک ہی کمرے میں ہم کدک کر ایک دوسرے کو پکڑ کے اس طرح چھپ چایا کرتے تھے ہم دونوں ایک دوسرے کو ان کے غضب سے بچانا چاہتے ہوں۔ ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے ان دونوں کا جھگڑا ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور وہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تو ضرور باوجود اپنے غضب ہم پر نکالے گا اور ہمیں مار پستی سے۔ تب مجھے یاد ہے تم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں تمہیں کچھ نہیں بولنے دوں گا تم بالکل مت ڈرو۔ تمہیں شاید یہ بات نہیں معلوم ہوگی میں تمہیں آج بتاتی ہوں جس قسم تم مجھے تسلی دیا کرتے تھے تو مجھے تمہاری بات پر اتنا یقین ہوتا تھا جیسے تم واقعی مجھے دنیا میں کسی سے بھی بچا لو گے اور مجھے تمہیں بولنے دو گے،“ صنوبر اس کے بیڑ پر بیٹھی ہوئی اپنی بات ایسے کہے چلی جا رہی تھی جیسے وہ کسی اسٹاپر کسی کدو کے یاد کے ہوئے مکالمے بول رہی ہو۔ سلمان اس کی طرف دیکھ کر شدید حیرت میں غوطے کھانے لگا۔

”ایسا لے گا کہ بچے بھی جانوروں اور پرندوں کی طرح ہوتے ہیں جو اپنے جیسے اپنی اپنی طرح کے پرندوں سے نہ بے ڈرتے ہیں اور نہ ہی انھیں اتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں کہ وہ ان سے خوف زدہ ہو جائیں۔ بچے بھی ایسا ہی سمجھتے اور سوچتے ہیں۔ اسی لیے بچوں میں ہمیشہ دوستی ہو جاتی ہے بچے بڑوں کے مجمع سے نکل کر اپنے جیسے بچوں کو تلاش کرتے ہیں اور ان کے ساتھ پہلے سے شناسائی نہ ہونے کے باوجود بھی ایک ہی بل میں ایک ایک دوسرے کے ساتھ آ کر کھینچے لگتے ہیں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔“ وہ جیسے سانس لینے کو رکھ کر، ”بچپن واقعی زندگی کا سب سے خوبصورت عہد ہوتا ہے“

”یہ آج تمہیں اس قسم کی پرانی باتوں کا خیال کیوں آیا ہے صنوبر؟“
 ”میں سوچ رہی تھی کہ کیا میرے وہ ہی بچپن والے بھائی ہو؟“ صنوبر نے آنکھیں پھیل کر چہرے کو اور بھی وسیع کر رہے ہوئے کہا۔

”تم غلط سوچتی ہو۔ یہاں اس دنیا میں سب کسی نہ کسی شکل کے غنڈے ہیں۔ سب اپنے مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اور اسی کی پروا کرتے ہیں۔ فارس میں کچھ بری عادتیں ہیں لیکن اس نے مجھے یقین دلا یا ہے کہ وہ سب عادتیں شادی کے بعد

ایک سال میں ماہرِ غفران نے اسے سزا دے کر دھڑا دھڑا چھوڑ دی۔ مگر اس کی حیثیتِ غافل کے مقابلے میں بہت نیچے ہے۔ غافل کے والد کے چاہنے پر شریل نے شریل کے والد کے چاہنے پر شریل کو اپنی بیٹی پر جب چاہے چھو کر لیں اور جو ان کی کمرہ بانی ہے جو انھوں نے شریل کے والد کو فری دینا دیا ہوا ہے۔ اسی لیے میں تم کو کہتا ہوں کہ جو تم کو چھو نہیں غافل سے شادی کر کے مل سکتا ہے وہ شریل شادی کر کے کبھی نہیں مل سکتا۔“

”اسی لیے تیرے خیر خلیل کے بارے میں سب کچھ اس کہنے فارس کو بتا دیا ہوگا یہ نا؟“
 سلمان اس کی بات نہ کر چبے لمحے کو چپ سا ہو گیا۔ وہ ہنسنے لگا اس نے اب تک یہ سب فارس کو کیوں نہیں
 بتا کر خلیل اس کے گھر اپنی ماں کے ساتھ رشتے کر آ تھا۔ اور یہ خیر خلیل مرزا ملک کا بیٹا ہے جو فارس کے والد کے
 باپ ہیں۔

جذبہ تھا۔ اس نے مسطورہ کو ایک ایسی تحریر کے پن سے دیکھا اور بے ہوش ہو گئے۔
 ”تم؟“ جبکہ انڈین فلمیں زیادہ دیکھ رہی ہو۔ اس قسم کی جذباتی باتیں ان فلموں میں جھوٹے اور معمولی لوگوں کو بے
 وفائی لانے کے لیے کی جاتی ہیں۔ ان کا زندگی کی اس حقیقت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔
 ”میں حقیقتی طور پر تم سے کوئی اچھی توقع رکھتا ہوں۔ تم اس قسم کی باتیں کر کے میرا دل اڑا دو گے۔“ یہ کہہ کر وہ
 ”میں حقیقتی طور پر تم سے کوئی اچھی توقع رکھتا ہوں۔ تم اس قسم کی باتیں کر کے میرا دل اڑا دو گے۔“ یہ کہہ کر وہ
 ”میں حقیقتی طور پر تم سے کوئی اچھی توقع رکھتا ہوں۔ تم اس قسم کی باتیں کر کے میرا دل اڑا دو گے۔“ یہ کہہ کر وہ

کھانا کھا کر وہ اس سے کہی ہو چھپنے کے لیے آئی تھی۔ تمہیں یقین دلانا ہوں کہ میں فارس کو شہر جیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

مسلمان نے یہ نہیں کیا کہ جب بے قوتی کی بات کی ہو تو وہ صرف اس کے سینے سے پلٹی ہوئی آواز کے مسلمان کے سینے سے چٹ گئی۔ ایک خبیث اور شیطان صفت انسان کو مسلمان کو اس وقت صنوبر کا اس کے گلگانا ایتنا چھانکا کہ اسے نکلنے لگا جسے اسے پتا نہیں کیا کہ اسے کیا ہے۔ کتنے عرصے سے وہ ایسی ہی کی جی بھی پیار کر رہا ہو کہ جسے ترسا ہوا تھا۔ لیکن بار بار وہ احساس ہے جو کسی سے شاپ کے گلاس کی طرح نہ تو خیر یا بد آسکتا ہے۔ اور نہ ہی مانگا جا سکتا ہے۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے گھر میں کسی چیز کی کمی ہے۔ اور یہ چیز قدرت نے صنوبر کو دی ہوئی ہے وہ شاید چھپ چکی ہو۔ اسے اس وقت اور بینک بینکنس سے زیادہ محبت کی پروا ہے اور محبت کے لیے وہ کتنی بھی دولت اور حیثیت کو کھو کر مار سکتی ہے۔

ایسے فارس کہتے ہی دن سے پاگلوں کی طرح اوھر اوھر مارا پھرا ہوا تھا وہ اسے اس طرح مل جائیگا ہی تو اس نے ہانپا ہانپا نہیں تھا لیکن اس کے بعد بھی اسے سلمان پر غصہ تھا کہ اس کی باتوں سے اپنے پاس یہ بھی منگولیات دبا کر اور کچھ گرجی ہوئی تھیں اور اسے دانستہ نہیں بتا رہا تھا یہ تو شراب کا کمال تھا جس نے سلمان بھی منگولیاں ڈالنے کے سارے سہیل چھوٹے کر دیے اور اس کی رنگوں سے سارے راز ایک ایک کر کے بہرہ کر باہر نکالنے چلے گئے۔

بھائی کم سے کم یہ ایک وعدہ تو نبھایا دے گا۔ اسی لیے اس نے شریل کو ندا کے گھر ملنے کے لیے بلالیا۔ جب وہ گھر سے نکلے تو حماد نے بہت کڑے اس سے کہا۔

”صنوبر بی بی آپ بہتر نہیں تو مجھے بھی ساتھ لیتے جائیں“
صنوبر اس کی اس بات پر کوئی اور موقع نہ تھا تو زور سے ہنسی کہ یہ اتنا سار لڑکا اس کی کیا مدد کر سکتا ہے مگر اس وقت تو اسے یہ سوچنے کی فرصت بھی نہیں تھی کہ حماد نے اتنی اچانک یہ بات کیوں اور کس لیے کہی۔ اسے کیا معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر نکتے سے بولی۔
”اچھا تم لوں کرو جلدی سے تیار ہو کر جاؤ“ حماد اس وقت گھر میں کام کرنے والے ملازموں کے حلیے میں تھا۔ حماد سر سے لے کر اور دوسرے ہی لٹے واپس آیا صنوبر چونکی تو ضرور کہ اتنی جلدی وہ کیسے کیا اور پہنچ کر کے واپس آ گیا لیکن بولی کیجئے۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ راستے میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے حماد نے اس خاموشی کو توڑنے کی خاطر کہا جو کتنی ہی دیر سے گاڑی میں موجود تھی۔ اس کی بات سن کر ایک صنوبر چونکی اور اس نے بنا پیچھے دیکھے ہوئے کہا۔
”اپنی ایک دوست کے گھر جا رہی ہوں“ حماد جانتا تھا کہ وہ ندا کے پاس جا رہی ہے اور وہاں شریل آنے والا ہے۔ اس نے صنوبر کی ساری باتیں سن لی تھیں لیکن وہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ سلمان تھا اور سلمان میں یہ شتی موجود تھی کہ وہ موٹی اور ساؤنڈ پروف دیواروں کے پیچھے ہونے والی گفتگو بھی با آسانی سن سکتا تھا۔
”آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ کیا آپ مجھے اپنی پریشانی نہیں بتائیں گی؟“ صنوبر کو اس کی یہ بات بہت عجیب سی لگی۔
”جب چاپ بندوق میں جھپٹیں پتا نہیں کیوں ساتھ لے آئی“

صنوبر کی بات حماد کے لیے توقع کے عین مطابق تھی وہ جانتا تھا کہ وہ حماد نہیں سلمان ہے۔ وہ سلمان جو صنوبر پر عاشق ہے لیکن صنوبر یا کوئی اور یہ بات نہیں جانتے تھے کہ وہ کون ہے۔ اور ایک گھر کی ملازم کو وہ بھی سولہ سترہ سال کے کمسن لڑکے کو کوئی صنوبر جیسی حیثیت کی مالک لڑکی کیوں اپنی پریشانی یا باتیں بتانا چاہے گی۔
”نہیج سے بہت تباہ ہے۔۔۔ مگر میں آپ کے کام آ سکتا ہوں۔“ ایک دم ہی صنوبر کے پاؤں پر بیک پر پڑے اور گاڑی دوڑنے لگت گئی۔ شکر ہے کہ آگے پیچھے کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی اور ویسے بھی یہ ایک سنسان سڑک تھی جو میں شاہراہ کی زلی سڑک میں شمار ہوتی تھی اندازہ نہیں آئے ہی والا تھا۔
”تم مجھے کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ کیا جانتے ہو تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“ گاڑی روک کر وہ مڑی اور غصے سے پیچھے مڑ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے حماد پر رہے گی۔

”میں نے کہا تھا نا بچپن میں میں نے کچھ علم سیکھا تھا اسی علم کی وجہ سے میں یہ جانتا ہوں کہ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں اور اس وقت آپ ایک قسم کی مشکل میں ہیں۔“

حماد نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھ کر نظر کھینچ کر رہے ہوئے کہا۔
”کیا۔۔۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو میں سمجھ نہیں پاری۔ صاف صاف کو تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“
”یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیا۔۔۔ مگر مدد کر ضرور سکتا ہوں۔ میں یہ بات جانتا تھا اسی لیے میں نے آپ کے ساتھ آنے کی درخواست کی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ ضرور لے کر جائیں گی، چاہے کبھی انکار نہیں کر سکیں گی۔“ حماد کی باتوں نے صنوبر کو آہستہ میں ڈال دیا۔
”جانتیں تم کیا کہو اس کر رہے ہو۔ میں تو تمہیں ساتھ لاکر پیچھا رہی ہوں“ صنوبر نے دوبارہ سے گاڑی اسٹارٹ کی۔

حماد نے سوچا اس وقت کوئی بھی بات کہنا فہمول ہے اس لیے وہ چپ ہو گیا۔
گاڑی ندا کے گھر کے پاس کی اور صنوبر جلدی سے نیچے اڑی حماد جی اترنے لگا تو وہ بولی۔

”نہیں تم یہیں بیٹھے رہو سمجھے۔“ وہ اترتے اترتے رک گیا۔ اور اس عایشان گھر میں جو صنوبر کے گھر کی طرح اس کی زبان کا آئینہ دار تھا۔ وہ اپنی ہی طرح ایک امیر کبیر لڑکی سے ہی ملنے آئی ہے۔ صنوبر گھر کے گیٹ کے باہر لگی ڈور بیل پر کچھ ہی دیر میں اندر چلی گئی۔ نزدیکی غلام کرش میں ہی اسے ندا کی جو اس کی آواز سن کر اسے لینے کے لیے ہی آئی تھی۔

”کیا وہ شریل آ گیا؟“ صنوبر نے یہ صبری سے پوچھا۔
”نہیں وہ تو ابھی نہیں آیا۔“ ندانے جواب دیا تو صنوبر نے جلدی سے گھڑی دیکھی۔
”کیا وقت ہوا ہے۔“ گھڑی دیکھنے کے بعد وہ کہنے لگی۔
”ارے ابھی تو آدھا گھنٹا باقی ہے میں یہ کچھ جلدی آگئی۔“ یہ کہہ کر دونوں سہیلیاں ندا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ آج ندا کے والدین اس کے بھائی کے ساتھ اس کی پسند کی لڑکی دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ اس کا بھائی عاطر بھی ساتھ تھا۔ اس لیے گھر میں کوئی نہیں تھا۔

”مجھے بتا ہے نہیں بھی اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ جاتا تھا اور تم میری وجہ سے نہیں گئیں۔ میں تمہارا کس زبان سے شکر ہے ادا کروں ندا“ صنوبر نے اس کی کمرہ نوازی کے احساس میں ڈوب کر کہا۔
”ارے کیوں اس قدر فارل ہو رہی ہو، میری دوست ہے میں اس سے اکثر ملتی رہی ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تم خود خواہ خود اپنی فارل ہو رہی ہو۔ میں نے شریل کو ندا کر دیا تھا وہ برا نہیں مانے گی۔ ہم دونوں میں کافی اندر فرینڈنگ ہے۔ اچھا تم مجھ کو تمہارے لیے چائے لے کر آئی ہوں۔“ ملازموں کو کہیں نے خود ہی چینی دے دی تھی۔

صنوبر اس کی مزید مہمانداری احسان ہو گئی۔ جس کا اظہار اس نے اپنی آنکھوں اور چہرے سے کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چائے والے تکلف سے ندا کو روک دیتی لیکن اس وقت اسے شریل کا انتظار اور وہ جانتی تھی انتظار کرنا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ وقت گزرتا گیا اور انتظار طویل ہوتا چلا گیا کئی کرات کے دس بج گئے اور ندا کے گھر والوں کے آنے کا وقت ہو گیا۔ صنوبر نے کئی بار فون لگانے کی کوشش بھی کی لیکن شریل کا فون مسلسل بند آتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر شریل وعدہ کر کے بھی آیا کیوں نہیں اور اب وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔ اسے تو آج اس کے کورٹ میرن کے بارے میں بات کرنا تھی۔ اور یہ آئندہ یا تو خود شریل کا ہی تھا پھر وہ اس بات سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

پریشانی دھیرے دھیرے غصے میں بدل گئی اور وہ ندا کے سامنے بار بار شرمندگی سے کہتی رہی کہ شریل نے ایسا کیوں کیا؟ وہ ایسا کرتا تو نہیں ہے ایسا کیا کام آں بڑا کسان کے اپنا فون بھی بند کیا ہے۔ اسی کم کی باتیں کرتے کرتے جب وہ پوری طرح تھک کر مایوس ہو گئی تو اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا۔ اسے ایسا مان کی یہ بات یاد آنے لگی کہ یہ لڑکا پہلے بھی بزدلی کا مظاہرہ کر چکا ہے اور اب بھی جانتیں کب تمہیں راستے میں چھوڑ کے چلا بنے۔

اسی قسم کے خیالات کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے چلنے لگی اسے تو یہ یک دہائی تھا کہ اس کی گاڑی میں اس کا ملازم حماد بیٹھا ہوا ہے جسے وہ انتظار کرنے کا کہہ کر کتنی ہی اذیت اور اب اس بات کو نہیں گھٹنے سے بھی زیادہ ہو چکے تھے۔
”وہ نہیں آئے؟“ حماد کی آواز پر وہ بری طرح چونکی اور ایک بار پھر اس کی گاڑی ایک تنہا درخت سے ٹکراتے گھبراتے پئی۔

”تم۔۔۔ اوہ میں تو تمہیں چھوڑ کر بھول ہی گئی تھی۔“ پھر وہ سنبھلی اور بولی۔
”تم کس کے بارے میں بات کر رہے تھے؟“
”وہ ہی جن سے آپ ملنے آئی تھیں۔“ نہرت کا ایک اور چھکے صنوبر بھروسے ہوا۔
”میں کس سے ملنے آئی تھی۔ حماد تمہیں کسے جانتے ہو؟ میں تو اپنی دوست کے گھر اسی سے ملنے آئی تھیں۔“ اور جس ”یہ شیک ہے کہ آپ اپنی دوست کے گھر آئی تھیں مگر آپ اپنی دوست سے نہیں کسی اور سے ملنے آئی تھیں۔“ اور جس

سچی کہانیاں 237

اور جہانی بیسے لے کر آئے۔

”اگر تم نہیں رکنا چاہتے تو کوئی بات نہیں جہانی۔ میں رک جاتا ہوں۔ تم بینک سے جا کر پیسے لے آؤ“ فارس نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ یہاں اس کو رکنا ہوگا۔“ صابو کا ایک ساتھی جو بڑی دیر سے مسلسل جہانی کو دیکھ رہا تھا۔ بولا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف دیکھنے میں ہی خوفناک نہیں تھا اس کی آواز بھی ایسی تھی جیسے کوئی جھیل یا بول رہا ہو۔ یہ سنتے ہی جہانی کے جسم کا سارا انون خوش ہونے لگا حلق میں جیسے کانٹے سے پڑ گئے۔ صابو اس ساری صورت حال سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنے ساتھی سے مخرے بنے بولا۔

”کیوں بے دوشی تجھے اس لوٹنے میں کیا وجہ ہے یہ رک کے یا وہ دوسرا والا اس سے فرق کیا پڑتا ہے“

”فرق نہیں پڑتا تو استاد پھر اسی کو روک لوں گا۔ کبھی کبھی تو ہماری بات بھی مان لیا کرو“ وحشی نے کچھ عجیب سے انداز سے کہا تو جہانی کو اپنی روح قبض ہوئی ہوئی معلوم ہوئی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ فارس میں یہاں نہیں رکوں گا۔ تم مجھے یہاں چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔“ بڑی مشکل سے جہانی نے اپنی بات مکمل کی۔

”ڈرنا کیوں ہے ہم کوئی کچھ تو نہیں جانیں گے۔ بس کچھ ہی دیر کی تو بات ہے“ صابو نے اس کا ہاتھ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے جھڑا خود جہانی کا ہاتھ آرام سے پکڑ کر اپنے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بٹھایا۔ جہانی میکینیکل انداز میں ہنسنے لگا مگر وہ مسلسل اس آدمی کو دیکھ کر ہاتھ جس کو صابو نے وحشی کمرہ پکڑ رکھا تھا۔ فارس کی آنکھوں میں جہانی نے بے بسی دیکھ لی تھی اور وہ جہانی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد فارس واپس لوٹا تو اسے وہاں جہانی پہلے کے مقابلے میں کافی مطمئن دکھائی دیا۔ فارس نے پیسے دے کر اور جہانی کے ساتھ وہاں سے باہر نکل آیا۔

جہانی نے گاڑی میں بیٹھ کر ایک طویل پرسکون سانس لی اور فارس کو کچھ دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے تمہارے ان چیکروں میں بڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میری عقل کو چٹانیں کیا ہو گیا تھا جو میں تمہارے ساتھ یہاں ان غنڈوں کے ٹھکانے پر چلا آیا۔“

”انتہا راض کیوں ہو رہے ہو یا مجھے کیا پتا تھا کہ وہ چیک ریسو نہیں کرے گا۔“ فارس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

جو کچھ ہوا وہ سب اتفاق تھا میں نے کچھ بھی جان بوجھ کے نہیں کیا۔ تمہیں کچھ کہا ان لوگوں نے؟“ فارس نے جہانی کی دلچسپی کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں جہانی چپ رہا۔

”بتاؤ نا کیا کہا ان لوگوں نے ضرور تم سے کچھ پوچھ رہے ہوں گے“ فارس نے پھر اصرار کیا۔ اور جہانی کو یاد آ کر اس ایک گھنٹے میں ان لوگوں نے اس کی ہر طرح سے خاطر مدارات کیں۔ بس وہ وحشی اسے مسلسل گھورتا رہا۔ لیکن اس کی خون آلود آنکھوں میں اس کے لیے نفرت نہیں کوئی اور ہی جذبہ تھا۔ جسے جہانی سمجھ نہیں سکا۔ البتہ اس کے باقی ساتھی اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اور کہتے رہے کہ وحشی نے بھی زندگی میں انتہا حسین لڑکا نہیں دیکھا اس لیے کئی باندھ کر بس دیکھ ہی جا رہا ہے۔ تاہم اس نے پھر جہانی کو ہاتھ نہیں لگا یا اور نہ کوئی اور بات کہی۔

”نہیں کچھ نہیں پوچھا۔ بس اتنا کہ میں تمہارا کون ہوں؟“ جہانی نے خیالات کے سمندر سے نکل کر جواب دیا۔

”تو تم نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا کہنا تھا وہی کہا جو ہم میں یعنی دوست“

جہانی کا لہجہ اب بھی اکٹھا ہوا تھا اسے اس بات پر غصہ تھا کہ فارس اسے ان کے پاس گروی رکھ کر کیوں چلا گیا تھا۔

اسے نہیں جانا چاہیے تھا۔

”تم شاید میرے ہمیں یہاں چھوڑ کے جانے پر ناراض ہو؟“ فارس نے پوچھا۔

”ہاں اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہارا ہوں ان اگلے سیدھے کاموں میں کبھی ساتھ نہیں دوں گا۔“

”ایسے تو مت بولو یا۔۔۔ تمہیں پتا تو ہے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ تو بول کیا کرتا میں۔ میں نے تو آخر کی جی کہ میں رک جاتا ہوں اور تم پیسے لے کر آ جاؤ مگر وہ نہیں مانے تو اس میں میرا کیا قصور ہے تم کو بھی بتاؤ“ فارس کے رویے میں جہانی کو مٹانے اور مطمئن کرنے کی جو کوشش تھی وہ اس کے لیے سے مترشح تھی۔

جہانی نے غور کیا تو اسے فارس کی بات غلط نہیں معلوم ہوئی۔ البتہ وہ ضرور سوچ رہا تھا کہ مجھے فارس کے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا گاڑی چلاتے ہوئے فارس مسلسل اس کے جواب اور رد عمل کا منتظر رہا۔ وہ جہانی کا مودہ اچھا کرنا چاہتا تھا اس کے منہ سے سنتا چاہتا تھا کہ اب سب ٹھیک ہے اور جہانی اس سے ناراض نہیں ہے۔

”بس کر دے نا یا را۔ اب ہم ہر کام میں تو ساتھ ہوتے ہیں ایک ذرا مختلف کام میں بھی ساتھ ہوئے تو کیا ہو گیا؟“

فارس نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”گاڑی سامنے دیکھ کر چلاؤ۔ میں ٹھیک ہوں اب۔“ جہانی نے مشکل اپنے لیے گونم اور روٹن کا بنانے کی کوشش کی۔

”تو اب تم مجھ سے ناراض نہیں ہو؟“ فارس کو جیسے اب بھی اطمینان نہیں ہوا تھا۔

”کہنا نا اب ٹھیک ہے“ جہانی نے بڑی مشکل سے سترانے کی کوشش کی۔

”وہی میں بہت ڈر گیا تھا۔ پوری زندگی میں پہلی بار مجھے اتنا ڈر محسوس ہوا۔ سارا وقت بس یہی سوچتا رہا کہ پتا نہیں

وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں مگر بے یار و مددگار بہت خیریت رہی۔“ فارس کا اطمینان اب واپس آنے لگا۔

”اچھا یہ بتاؤ انھوں نے تم سے شیشل کے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔۔۔ مجھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں بلا وجہ کی کھوج میں نہیں پڑتے۔“ جہانی کا ہاتھ وحشی واپس آ چکا تھا۔

”کیون اب ذرا یہ سوچو اگر شیشل سرگیا تو کیا ہوگا؟“

”کتنی ہی دیر سے بات نہیں انداز کر رہی تھی اور جہانی کی ناراضگی میں وہ اس بات کو جیسے قبول کیا تھا اب جو جہانی

اقبال بانو کے جادوگر قلم سے نکلا وہ
 شاعر کا جلا زوال ٹھہرا۔
 دو شیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل 20 ماہ شائع
 ہوئے والا یہ نمونہ ناول اقبال بانو کی پہچان بنا۔
 ”شیشہ گر“ وہ ناول، جس کا ہر ماہ انتظار
 کیا جاتا تھا۔ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔
 کتاب ملنے کا پتا:
 انٹر لین پبلی کیشنز، سرکلر روڈ اردو بازار لاہور۔

بہی کی خبریت ہو چھنے آگئی تھی۔ چلتی ہوں، اتنا کہ وہ چلی گئی اخلاقا در شہوار نے ان سے کہا کہ جیسے ہی کچھ پتا چلے انھیں بھی ضرور بتا دیں۔۔۔۔۔

”کیا کہاؤ اگر نہ؟“ جیسے ہی سر فرزا ملک دکھائی دیے تو شرجیل کی ماں نے ان سے پوچھا۔

”آپریشن تو تم ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ابھی کچھ بھی کہنا مشکل ہے اگر شرجیل کو۔۔۔۔۔ جو پسینوں میں ہوش آگیا تو کچھ یقین سے کہا جاسکتا ہے۔ بس دعا کرو وہ جلدی سے ہوش میں آجائے۔“ سر فرزا ملک نے بیوی کو جو کچھ انھیں معلوم تھا اس میں سے یہ ایک بات نہیں بتائی کہ ڈاکٹر نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان کی حالت کافی بری نہیں ہے اس لیے چانسز بہت کم ہیں۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہونے والی پریشانی کو بھی وہ بیوی پر ظاہر ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میں ابھی آتی ہوں“ شرجیل کی ماں نے کہا۔

”کم کہاں جا رہی ہو سر خاں؟“ سر فرزا ملک کو بھی جیسے اکیلے ہونے سے ڈر لگنے لگا۔

”تمہارے بچے۔۔۔۔۔ بیٹے کی زندگی کا دعا مانگتے، انھوں نے ایسے کہا کہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

”میں بھی چلتا ہوں“ اور یوں وہ بیوی کے ساتھ نماز پڑھنے اور شرجیل کے لیے دعا مانگنے چلے گئے۔

ساتھ ہی کمرے میں لپٹی ہوئی صنوبر کو ہوش آگیا۔ اور اس نے ماں کو اپنے قریب دیکھ کر کچھ اطمینان محسوس کیا۔

”اب کیسی ہو؟“ در شہوار نے محبت سے پوچھا۔

”کافی بہتر ہوں۔ شرجیل کیسی ہے؟“

”اس کی ماں آئی تھی کہیں دیکھتے۔ تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ بتا رہی تھیں کہ ابھی شرجیل کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں پتا چل رہا شاید آپریشن چل رہا ہے ابھی۔“ در شہوار نے چائے نکالی اور صنوبر سے پوچھا کہ وہ چائے پیے گی۔ صنوبر نے منع کر دیا۔

”کیا آپ کو ہمارے کپڑے نظر آیا؟“ صنوبر کو لگا کہ اب اگر وہ شرجیل کے بارے میں اب ڈیٹ لینے کی کوشش میں جاتا چاہے تو اس کی ماں اسے کی قیمت پر جانے نہیں دے گی۔ اس لیے اس نے حماد کے بارے میں پوچھا وہ جیسے ہی اسے ساری معلومات لا کر دے سکتا تھا۔

”نہیں کیوں؟ وہ تو ان پیر شام سے ہی غائب ہے اور اس وقت رات کے بارے میں کچھ زیادہ جہجکے ہیں پتا نہیں یہ لوہا کن پیکر میں رہتا ہے میں اب اسے نہیں رکھوں گی نکال دوں گی۔“ در شہوار کو دھیرے دھیرے غصہ آنے لگا۔

”وہ میرے ساتھ تھا اسی نے مدد کی میری شرجیل کو یہاں تک لانے میں۔“

”کیا! تم کیا کہہ رہی ہو؟“ در شہوار کو جیسے خاک لگا۔

”شک کہہ رہی ہوں وہ نہ ہوتا تو شرجیل۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ صنوبر کچھ اور نہیں کہہ سکتی۔

”تم کہیں اسے کیسی اسے اپنے ساتھ؟“ در شہوار کا دماغ گھومتا لگا۔ وہ بھی شرجیل کی ماں کی طرح اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ صنوبر شرجیل کے ساتھ تھی۔

”میں اپنی دوست ندا کے گھر گئی تھی شرجیل بھی وہاں آئے والا تھا مجھ سے ملے مگر وہ نہیں آیا۔ رات کو دس بجے تک جب وہ نہیں آیا تو ہم وہاں سے چل دیے اور اسے میں ہمیں شرجیل زخمی حالت میں ملا۔“

”تمہارے ساتھ تھا اور میں پتا نہیں کیا سوچتی رہی۔“ در شہوار کا غصہ فوراً ہی کافی ہو گیا۔

”تو اس وقت وہ کہاں ہے مجھے تو کبھی نظر نہیں آیا؟“ در شہوار نے بات پوری کی۔

”یہ تو میں بھی سوچ رہی ہوں کہ وہ مجھے ہسپتال میں چھوڑ کے چلتا نہیں کہاں چلا گیا۔ شروع میں تو یہیں تھا۔“ صنوبر نے جواب دیا۔

صنوبر نے غدارا کیا دل ہی دل میں کہ اس کی ماں نے یہ نہیں پوچھا کہ حماد کو ندا کے گھر جانے کی کیا ضرورت

تھی۔ اس سوال کا خود اس کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔ آج سب کچھ بہت عجیب عجیب ہو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد صنوبر کو شرجیل کے بارے میں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے اگر شرجیل کو وہیں گھٹنے میں ہوش نہیں آتا تو۔۔۔۔۔ اس کے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیرانی ڈیرا ڈال چکی تھی۔ آنسو پتا نہیں کیسے خود بخود خشک ہو چکے تھے۔ اس وقت کوئی بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا کہ شرجیل کے ساتھ یہ حادثہ کیسے ہوا، کون تھا جو اسے اس طرح زخمی کر کے اس کی گاڑی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

دوسروں کے مقابلے میں صنوبر تو مزید یہ بھی جانتی تھی کہ یہ ایک ہیٹ نہیں تھا بلکہ شرجیل کو مارنے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ اس کا زخمی جسم جھانپوں میں چھپا دینا اور اس کی گاڑی بھی ساتھ لے جانا اس طرف اشارہ کر رہا تھا کہ جو کوئی بھی ساتھ یہ

چاہتا تھا کہ شرجیل کو کوئی مدد نہ ملے اور وہیں پڑے پڑے جان سے چلا جائے۔ لیکن اس وقت صنوبر یہ بات کسی کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ اسے اس وقت صرف شرجیل کی زندگی کی پروا تھی۔ شرجیل بچ جائے تو وہ بانی باتوں کے بارے میں اس

کے بعد فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس اضافی بات کا ایک گواہ البتہ تھا اور اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ یہ بھی صنوبر کو حماد کا خیال آتا تو وہ سوچنے لگے کہ اس بہت ہی عجیب لڑکے کو پتا نہیں کیا کیا معلوم ہے۔ وہ کسی فریادی

آیات کے بارے میں بھی جانتا ہے جن کے اثر سے بہت سے کام لے جاسکتے ہیں۔ اسے کسی واقعے کے بارے میں بھی شاید پہلے سے یا واقعہ رونما ہونے کے بعد پتا چل جاتا ہے۔ ایک ایسی کوئی خبر یا کیا حماد اس کے ساتھ ندا کے ہاں

اصرار کر کے گیا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بسوکتا ہے آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ تو کیا وہ پہلے سے جانتا تھا

کہ کیا ہونے والا ہے!!!

یہ خیال آتے ہی وہ مہتر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور در زور سے سانس لینے لگی۔

☆☆☆

شرجیل کے آپریشن کے پورے وقت میں حماد جو دراصل مسلمان تھا آپریشن ٹیم میں موجود رہا۔ وہ دیکھتا جانتا تھا کہ شرجیل کی جان کتنی خطرے میں ہے۔ وہ اسے بچانا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے دائرہ اختیار سے باہر البتہ وہ بل بل بٹلے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جس وقت صنوبر نے شرجیل کے بارے میں سوچ کر ہلکے ہلکے روٹا شروع کیا تو وہ چند لمحوں کے لیے صنوبر کو دیکھنے آ گیا تھا۔ در شہوار کو ہاں دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا کہ صنوبر اکیلے نہیں

ہے۔ وہ دوبارہ آپریشن ٹیم میں چلا گیا۔ آپریشن طویل تھا اور کافی دیر میں ختم ہوا۔ ڈاکٹروں نے جو کچھ آپس میں کہا وہ

سب مسلمان نے سن لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ شرجیل کو کوئی مجروحہ ہی نہیں پہنچا ہے۔ اس لیے وہ اسے ججز سے کو اپنی

آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اس وقت میں شرجیل کے پاس موجود تھا۔ کچھ کچھ دیر بعد ایک وارڈ بوائے اور ایک نرس شرجیل

کی کنڈیشن دیکھنے آ رہے تھے۔ اور پھر آخر میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے مشینوں کی طرف دیکھ کر شرجیل کا معائنہ کیا۔ اس

کے چہرے پر چھٹی مایوسی کو مسلمان نے دیکھ لیا اور اسے بتا دیا کہ شرجیل ایک آخری چھلنے لے کر اس جہان فانی سے کوچ

کر چکا ہے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر نے اس کا چہرہ غصہ چادر سے ڈھانک دیا اور افسردگی سے باہر نکل گیا شرجیل کے ماں باپ کو یہ

دلزدہ خبر دینے کے شرجیل اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ابھی ڈاکٹر گھومتے ہی والا تھا سر فرزا ملک اور شرجیل کی ماں کے تے

ہوئے چہروں پر وہ مزید رکھوں کی بات کرنے والا تھا کہ ایک نرس بھاگتی ہوئی آئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

”ڈاکٹر صاحب پیشہ کو ہوش آگیا ہے!“

”ڈاکٹر جلدی سے آئی ہو ی کی طرف چل دیا۔ شرجیل کو واقعی ہوش آچکا تھا۔ مگر یہ کوئی

نہیں جانتا تھا کہ جو زندہ ہے وہ شرجیل نہیں مسلمان ہے۔ شرجیل مرنے چکا تھا۔ مسلمان اس کے سرہ جسم میں طویل کر گیا تھا!!!

(ایک جن اور دہائی محبت لے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے

سطر سطر ہر عشق ہو میں دوڑا، اس ناول کی آگلی کڑی ماہی میں پڑے)

مسئلہ یہ ہے

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و ترجمہ کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے بچے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد ہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں بہرہ ور ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو سمجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمانوں و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں بہرہ ور ڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلہ کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جو اپنی لفافے کے ساتھ =300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مدد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے محروم ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجئے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات نوکری منی =300 روپے کو آخری حد تک سمجھیں، وہ جب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجئے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1) مسئلہ کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے مجموعی خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2) منی آرڈر، بینک ڈرافٹ یا ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3) اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابان جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

پریشان ہوں مجھے جلد از جلد جواب دے۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کو صحت اور سکون عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے رہے۔

○ بیٹی شمیمہ! تعویذ لینے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فنزین کر کے معلوم کر لو۔

□ نظریاتی رہائی کراچی

○ محترم باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوش رکھے۔ آپ کو اور زیادہ توفیق عطا فرمائے تاکہ آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ آمین۔ باباجی ہم ماشاء اللہ چھ بھائی ہیں۔ سب سے بڑے تین بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ میرا تیسرا نمبر ہے اس لیے میری بھی ہو چکی ہے۔ جو تیسرے نمبر والا جو بھائی ہے میرے بعد والا اس کی ابھی نہیں ہوئی لیکن اس سے چھوٹا جو پانچویں نمبر پر ہے اس کی شادی کو اللہ کے فضل و کرم سے ایک سال ہو چکا ہے۔ باباجی اس کی بیوی کے ساتھ چلتا نہیں کیا مسئلہ ہے کبھی کھڑے کھڑے اور کبھی بیٹھے بیٹھے اس کو چکر آ جاتے ہیں اور وہ کراچی کے اور اس کے سر میں بہت چوٹ لگتی ہے اور ابھی نہیں صرف سر میں چوٹ آئی ہے اور اتنی زیادہ چوٹ آئی ہے کہ بہت خون نکلتا ہے۔ باباجی شادی سے پہلے بھی اس کو ایک دو بار چکر آ چکے تھے۔ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا باری ہے اور یہ چکر کیوں آتے ہیں۔ بہت سے بیروں، فقیروں کو دکھایا ہے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا ہے۔ باباجی اگر کوئی زمین پر بیٹھے بیٹھے گرجائے تو اس کو زیادہ چوٹ نہیں آتی لیکن یہ بیٹھے بیٹھے گرجا لے بھر بھی اس کو سر میں بہت چوٹ

غریب چکو! میرے بچوں اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میں اپنے ان بچوں کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کہانیت پابندی سے ضرورت مند خاندانوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ کسی ایک انسان کا بھی بھلا ہو جائے تو اس سے بڑی کوئی نیکی نہیں۔ میرے پاس تم لوگوں کے لیے صرف دعائیں ہیں اور یقیناً اللہ کے پاس بہترین اجر۔ میں شائدہ آسڑیلیا کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جس نے میرے کہنے پر ضرورت مند خاندانوں کے لیے حقیقت کا بندوبست کیا۔ بیٹی اللہ تمہیں دین اور دنیا کے خزانے عطا فرمائے۔ آئے والا ہمیں دے جب کا ہے۔ میں تمام بڑھتے والوں کو نصیحت کروں گا کہ اس ماہ میں خوب صدقہ خیرات کریں۔ روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ اور چڑیوں کو انانی ضرور ڈالیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اس کے بندوں کے کام آتے ہیں۔

□ شمیمہ قریشی - مقام نامعلوم

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں ”سچی کہانیاں“ بہت خوش سے پڑھتی ہوں اور آپ کا کالم مسئلہ یہ ہے سچی بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ خط لکھنے کی جرأت پہلی بار کر رہی ہوں۔ آپ سب کے مسئلے بڑی خوش اسلوبی سے حل کرتے ہیں۔ مجھے بھی ایک مسئلہ درپیش ہے۔ بری عمر 23 سال ہے۔ رشتے بہت آتے ہیں۔ لیکن نہیں پریمی بات نہیں بنتی۔ آپ جو تعویذ رشتوں کے لیے دیتے ہیں۔ میں بھی وہ تعویذ لینا چاہتی ہوں۔ اچھے اور شریف گھر میں میرا رشتہ طے پا جائے۔ تعویذ کس طرح لیا جائے گا۔ طریقہ بتادیں میں بہت زیادہ

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجئے کے لیے ہمارا پتہ جانوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دے گئے۔ سنے ایڈریس پر روانہ کیجئے۔

نیا پتہ: 88-C II - فرسٹ فلور - خیابان جامی کراشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجئے۔ 35893122 - 35893121 - 021

گتے ہے اور یہ تحاشخون نکلتا ہے۔ بابا جی ہم سب بہت پریشان ہیں کہ آخر یہ مسئلہ کیا ہے اور ہم اس کا علاج کہاں سے کرائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بابا جی برائے مہربانی آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور پلیز ہمیں بتائیں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے اور اس کا کوئی حل بھی بتائیں۔

○ بیٹے! نظر! جو صورتحال تم نے تحریر کی ہے وہ مجھے سمجھ آ رہی ہے مگر مکمل وضاحت سے میں تعویذ دینے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں گا۔ تعویذ دینے کے بعد کچھ کو حسد میں لے لوں گا۔ تم سچی کہانیاں کہ دفتر فون کر کے تعویذ منگوانے کا طریقہ معلوم کر لو۔ انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔

□ س۔ م۔ ا۔ حیدر آباد

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی امید کرتی ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔ بابا جی آپ نے مجھے تعویذ دیا تھا وہ میرے پہلے اور سورہ فاتحہ کا ورد بھی کیا تھا۔ بابا جی میرے شوہر کے رویے میں تھوڑا بہت فرق آیا ہے۔ بابا جی جس کے لیے اللہ کا بہت شکر ہے اور بابا جی میں نے آپ کو اولاد و نرینہ کے لیے بھی کہا تھا تو بابا جی آپ نے کہا تھا خاموشی اختیار کرو سب اچھا ہوگا۔ بابا جی میں اپنی ساس سسر کی بہت خدمت کرتی ہوں۔ بابا جی اب جو ایک مسئلہ ہو گیا ہے وہ میری بڑی نند کو طلاق ہو گئی ہے۔ بابا جی وہ ہمارے گھر آ گئی ہے۔ بابا جی شروع سے ہی ان کی مجھ سے نہیں بنی۔ بابا جی اب میرے شوہر کا رویہ پھر مجھ سے خراب ہو رہا ہے۔ بابا جی میں سارا دن چین کا کام کروں۔ بابا جی میری نند کا بیٹا جو کہ 5 سال کا ہے بہت گالیاں دیتا ہے۔ بابا جی گھر کے اس ماحول کی وجہ سے میری بیٹی جو کہ 4 سال کی ہے اس پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ بابا جی میں بہت پریشان ہوں۔ بابا جی سارا دن بچے آپس میں کھلتے رہتے ہیں بابا جی مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ بابا جی یہ تو وہ پھر کبھی لڑکا۔ مجھے کیا پتا کون سے کھیل کھیل رہے ہیں۔ بابا جی یہ سوچ کے دن رات مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ بابا جی میری مدد کریں اللہ کوئی اسباب نکالے۔ آپ کو اپنا مسئلہ بتا رہی ہوں مجھے سچی کہانیاں میں جواب دیجئے گا۔ بابا جی میرے لیے اولاد و نرینہ کے لیے بھی دعا کریں۔ بابا جی گھر کا ماحول بہت خراب ہے امید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

○ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ مثبت تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ ورد جاری رکھو۔ معاملات میں خاموشی رکھتے ہیں کامیابی ہے۔ اس وقت تمہاری نند اور اس کے والدین شدید مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ طلاق بہت دھک دینے والا فعل ہے۔ بہر حال تم سب کا خوش السلونی سے خیال رکھو۔ اپنی نند کا خاص طور سے بہت خیال رکھنا۔ 5 سال کا بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے تم بلاوجہ کی فکر میں مت آؤ۔ اولاد و نرینہ کے لیے تعویذ منگوانا خیر ہوتا۔

□ افضلہ ناز۔ منڈی وار برٹن

السلام علیکم! بابا جی! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش اور سلامت رکھے۔ بابا جی میرا مسئلہ بڑا شدید ہے۔ میں جس لڑکے کو پسند کرتی ہوں وہ مجھ سے کسی بات سے ناراض ہو گیا ہے اور ناراض ہونے کی وجہ بھی نہیں بتاتا۔ پلیز بابا جی! میری مدد کریں میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں پر وہ مجھ سے بات بھی نہیں کرتا۔ مجھے کوئی ایسا جلائی وظیفہ بتائیں جس سے اس کی ناراضگی بھی دور ہوجائے اور اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر رشتے کے لیے بھی بھیج دیں۔ اور ہماری جلد شادی ہوجائے۔ پلیز بابا جی میرا مسئلہ حل کر دیں میں زندگی بھر آپ کو دعائیں دوں گی اور مارچ شمارے میں جواب دے دیں گے تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

○ بیٹی! انفصال! ناراضگی تو دور ہوجائے گی مگر شادی میں مسئلہ ہے تم مجھ سے تعویذ منگوا لو تاکہ رکاوٹیں دور ہوں۔ تفصیل سچی کہانیاں کہ دفتر سے حاصل کر سکتی ہو۔

□ شہانہ۔ جہلم

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکی ہوں۔ مسئلہ وہی شادی کا ہے۔ آپ نے ایک وظیفہ تم تینوں بہنوں کے لیے ارسال کیا تھا جس کو پڑھ کر میری ایک بہن اللہ تعالیٰ کے کرم سے اپنے گھر کی ہو گئی۔ اسی وظیفہ کو پھر میں نے پڑھا۔ اسی دوران ایک رشتہ آلا لیکن ذات بات کے چکر کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ شادی کے وقت خرچہ چڑھ جاتا ہے۔ اس کو

اتارنے میں دو سال لگ جاتے ہیں۔ اس دوران کوئی شادی کرنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ اگر رشتہ اچھا اور قابل قبول ہو تو منگنی وغیرہ تو ہوجائے۔ لوگوں کے اتنے اچھے رشتے طے ہوجاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور حیرت کی کیا بات ہے، دینے والا اللہ ہے۔ خیر! اب آپ مجھے بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ابھی میری ایک اور بڑی بہن ہے اور میں ہوں۔ ہماری عمریں بھی زیادہ ہو رہی ہیں۔ آپ برائے مہربانی ہمارے لیے دعا کیجیے۔ ہم لوگ آپ کو بہت دعا دیں گے۔

☆ بیٹی شہانہ! اللہ کی ذات سے یامیں نہیں ہونا چاہیے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر اور عشاء کے بعد ۳۴ بار الحمد للہ شریف پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور حاجت بیان کرو۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! اپنی بہن سے کہو کہ نماز فجر کے بعد یا جنم یا ریحہ کی تسبیحات پڑھ کر حاجت بیان کرے۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ اور ہو سکے تو فوراً مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ کرم ہوگا۔

□ نگہت۔ چارسدہ

○ بابا جی! السلام علیکم! میں بہت لمبا چوڑا خط لکھنا نہیں چاہتی اس لیے مختصر انداز میں لکھ رہی ہوں۔ جو کچھ میں لکھوں گی، اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر لکھوں گی۔ اس سے زیادہ سچائی کا ثبوت میرے پاس نہیں ہے۔ ابھی مجھے ایک ایسا دکھ ملا جو کہ نظریہ پر کچھ نہیں مگر اس دکھ کی وجہ سے میں اذیت کا شکار رہی۔ میں بہت حساس ہوں۔ میں وہ دکھ کس طرح بیان کروں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میرے اپنے ہی میرے لیے اذیت کا سامان کرتے گئے۔ میرے وہ اپنے جن کو میں نے نوٹ کر چاہا، وہ رشتہ جو کہ ایک مقدس رشتہ تھا۔ بس یوں سمجھیں کہ اس کو کشت سے چاہا تھا۔ کبھی بچپن میں لیکن اب اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ نہ صرف میں نے اپنے اس مقدس رشتے کے اچھوں تکلیف دہی بلکہ مجھے اس گناہ کا احساس ہوا۔ بابا جی! اب میری دنیا میں وراثتی ہی وراثتی ہے اور میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ انسانیت کی خدمت میں گزارنا چاہتی ہوں اور دوسروں کے دکھ درد کو شہر کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن ایک

چاہے۔ کوشش کیا کرو کہ وظیفہ نامکمل نہ چھوڑ دو۔ اس طرح حاجت بھی نامکمل رہ جاتی ہے۔ وظیفہ مکمل کرنے کے بعد مجھے نتائج سے ضرور آگاہ کیا کرو۔
اللہ تبارک و تعالیٰ دنا ضرور ہے۔ (آمین)
امیر خان۔ واسطی

۵: جناب بابا جی! السلام علیکم! تقریباً دو ماہ پہلے میں نے اپنی مشکلات کے سلسلے میں آپ سے براہ راست رابطہ کیا تھا۔ آپ نے تعویذ ارسال فرمایا تھا۔ ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ میرے تینوں مسائل بخیر و خوبی حل ہو گئے۔ مجھے پہلے سے بھی اچھی ملازمت مل گئی ہے اور گھریلو مشکلات بھی ختم ہو گئی ہیں۔ میں آپ کا بہت بہت مشکور ہوں۔ بابا جی! آپ جس طرح مشکلات میں بھٹنے ہوئے لوگوں کے کام آتے ہیں، خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔

۶: بیٹے امیر خان! مشکلوں سے نجات دلانے اور مسائل حل کرنے والی ذات تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہے اس لیے میرا شکر یہ نہیں بلکہ اس رحیم و کریم کا شکر ادا کرو۔ اور اس کے نام پر خیرات بھی کرتے رہو۔ نماز کی پابندی بھی نہ بھولنا۔

۷: شکر۔ میرے کدے
۵: محترم جناب بابا جی! السلام علیکم! آپ مجھے پہچان گئے ہوں گے۔ کیوں کہ میں آپ سے پہلے بھی رابطے میں رہ چکی ہوں اور آپ کے بتائے ہوئے وظیفے سے مستفید ہو چکی ہوں۔ دیکھی انسانیت کی جو خدمت آپ کر رہے ہیں، خدا آپ کو اس کا اجر عطا کرے۔ (آمین) میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں رات کو سوتے وقت دانت بہت زیادہ چپاتی ہوں۔ یعنی دانت جھٹکتی ہوں۔ میں پچھلے کئی سال سے اس طرح کر رہی ہوں جس کی وجہ سے میرے دانتوں میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ مجھے کوئی وظیفہ بتائیں تاکہ میرا یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

۸: بیٹی! شرا! خوش رہو! (آمین) نماز کی پابندی کے ساتھ کثرت سے بات حق کا ورد کرتی رہو۔ دانتوں پر رات کو سوتے وقت مسروں کا تیل اور نمک اچھی طرح لگالیا کرو اور بغیر کسی کیسے سو جاؤ۔ یہ عمل نہایت

پابندی کے ساتھ دو ماہ کرو پھر مجھے مطلع کرو۔
۱: امین۔ کراچی
۲: بیٹی! امین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ (آمین)۔ نماز کی پابندی رکھو۔ وظیفہ تحریر کر رہا ہوں۔ ۱۴ دن کرنے کے بعد مجھے مطلع کرو۔ نماز عصر اور مغرب کے بعد ۷، ۸ بار سورۃ قلقل، سورۃ الناس اور آیت الکرسی پڑھ کر دم کرو اور گھر کے تمام افراد ایک ایک گھنٹہ یہ پانی پی لیں۔ نماز عشاء کے بعد ایک مرتبہ سورۃ جن پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ یہ عمل ۱۴ دن تک نہایت پابندی کے ساتھ کرو۔ جمعرات کے دن کچھ رقم ضرور خیرات کر دیا کرو۔ کرم ہوگا۔

۳: اطلاع۔ یسعی ملوک
۴: بیٹی! انیلا! تمہاری ہدایت پر مسئلہ خالق نہیں کیا جا رہا۔ تمہارا خط پڑھا۔ بے انتہا دکھ ہوا۔ اللہ تمہاری والدہ کو راہ راست پر لائے۔ (آمین) بیٹی! تم معاملات اللہ کے سپرد کرو۔ ٹی بی قابل علاج مرض ہے۔ تم اپنے والد کا علاج کراؤ۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بیٹی! تم نماز کے ساتھ ساتھ، قرآن مجید پڑھتی ہو۔ بہت اچھی بات ہے۔ روزانہ رات کو اور صبح میں آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گرد حصار کر لیا کرو۔ نماز عصر کے بعد ۷، ۸ بار سورۃ توبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور حاجات بیان کرو۔ اللہ ضرور کرم کرے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

۵: بشیر احمد۔ ساہیوال
۶: بزرگوار بابا جی! السلام علیکم! میں نے اپنے بچے کے علاج کے لیے آپ کو خط لکھا تھا اور آپ سے کسی دوا کی درخواست کی تھی۔ اس کے جسم پر داد نہ ڈال کر علاج سے ختم ہوئی تھی نہ ہوسیتھی اور دیکھی علاج سے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے جو ہمہ جہت سمجھا تھا، اس سے داد بالکل ختم ہو گئی ہے۔ خدا آپ کو عمر دراز عطا کرے تاکہ آپ کی طرح مایوس ضرورت مند لوگوں کے کام آتے رہیں۔ (آمین)

۷: بیٹے! بشیر! شفا دینے والا تو رب العزت ہے۔ اسی کا شکر ادا کرتے رہو جس کا سب سے بہترین طریقہ بیچ وقت نماز کی ادائیگی ہے۔ اپنے بچے کا صدقہ

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ کئی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں اس صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے مجھے بھی دیکھے۔ ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدا نے بزرگ و برتر سے ہر پہل بھی دکھا کر دکا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے تیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دیکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزق حلال کمائیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دیکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دیکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کے نام کی خیرات ضرور دیتے رہنا مگر مستحق لوگوں کو۔

□ روشن: جلال پور پیر والا

o: السلام علیکم! بابا جی! میرا مسئلہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ہے۔ میری عمر بڑھتی جا رہی ہے مگر ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا جس کی وجہ سے میں اور میرے گھر والے بہت پریشان ہیں۔ میں تقریباً مایوس ہو چکی ہوں۔ آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں اور وظیفہ بتاویں جس سے میرا رشتہ بھی آئے اور بات بھی طے ہو جائے۔

☆: مینی روشن! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ (آمین) مایوسی کا مطلب ہے، ناامیدی اور جو لوگ اللہ پر بھروسہ رکھتے رہیں، وہ بھی ناامید نہیں ہوتے ہیں۔ تم فوری طور پر تعویذ منگوالو۔ تفصیلات آفس فون کر کے معلوم کرو اور ہاں مینی تمہیں ایک نہایت سہل وظیفہ بھی دے رہا ہوں۔ ہر نماز کے بعد 100 مرتبہ یا صبیح کا ورد کرو اور حاجت بیان کرو۔ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ 14 دن تک کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ خیال رہے، اس دوران نماز بالکل نقصانہ ہو۔ تعویذ کا اسی لیے کہتا ہوں چونکہ مجھے پتا ہے کہ اکثر وظیفہ پابندی سے نہیں ہوتا اور ناغہ آجاتا ہے۔

□ حمیدہ۔ صادق آباد

o: بابا جی السلام علیکم! آپ دکھی انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ میرے بھی کچھ مسائل ہیں۔ بابا جی! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بہت تیزی سے گرتے ہیں۔ بالوں میں خشکی بھی ہے۔ بال اتنے اترتے ہیں کہ کھروالے بھی پریشان ہیں۔ بالوں میں زیادہ تیل بھی نہیں لگا سکتی۔ زیادہ تیل لگانے سے بال اور زیادہ اترنے لگے۔ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرے بال گرنا بند ہو جائیں۔ ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر اتنی کشش نہیں ہے۔ میں چہرہ پر کشش کرنے کے لیے لیکیا کروں پلینر بتائیں! میں بہت پریشان ہوں۔

☆: مینی حمیدہ! بالوں کے لیے مجھ سے تیل منگوالو۔ تیل بالوں کی جڑوں میں لگاؤ۔ آملہ اور بیضا جیسے کرکیلے بالوں میں لگاؤ اور آدھے گھنٹے کے بعد

دھولو۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔ چہرے کے لیے دو تیار ہے۔ آفس فون کر کے تفصیلات لے لو۔

□ عروہ۔ لاڑکانہ

o: بابا جی! السلام علیکم! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ امید ہے آپ میرا مسئلہ بھی حل کر دیں گے۔ بابا جی! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر جنھوں نے دو جگہ کیے ہوئے ہیں، عمرے بھی کیے ہیں مگر وہ نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے شوہر نماز پڑھنا شروع کر دیں۔ میری دو بیٹیاں قرآن پاک حفظ کر رہی ہیں۔ میرا بیٹا بھی انشاء اللہ نمازی ہے اور میں خود بھی نماز پڑھتی ہوں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے دونوں چھوٹے بچے بیٹا اور مینی بہت تنگ کرتے ہیں۔ بیٹیاں سات سال کا ہے۔ وہ ذہن کا تیز ہے مگر پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا۔ بہت ضدی ہے اور بہت بدتمیز بھی ہے۔ کسی کا کہنا بھی نہیں مانتا اور مینی جو گیارہ سال کی ہے، ماشاء اللہ حفظ کر رہی ہے۔ وہ بھی بہت ضدی اور بدتمیز ہے۔ کسی کا کہنا نہیں مانتی۔ انہیں بہت سچی میں ڈانٹ کر پڑھوائی ہوں۔ بابا جی! کوئی ایسا تعویذ بھی دے دیں جس کی برکت سے میرے شوہر نماز پڑھنا شروع کر دیں اور بچے نیک سیرت ہو جائیں۔

☆: مینی عروہ! خوش رہو! نماز کی تلقین کرنا تمہارا فرض ہے۔ وہ گرتی رہو۔ بچوں پر چاروں قل پڑھ کر دم کرتی رہا کرو۔ گھر کا ماحول خوش گواریں۔ نماز نہ پڑھنے پر کسی کو بھی برا بھلا مت کہو۔ تم خود پابندی سے نماز پڑھو۔ بچے جب والدین کو عبادت کرتا دیکھتے ہیں تو خود بھی عمل کرتے ہیں۔ زبردستی سے بعض اوقات مقصد تو حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر وہ مستقل نہیں ہوتا ہے اور مذہب میں تو بہت نرمی اور محبت سے چلنا چاہیے۔ بچوں کو خود وقت دو اور نماز عصر کے بعد سورۃ کافرون 21 بار پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ مدت 21 روز ہے۔ شوہر اور بچوں کے لیے مجھ سے تعویذ بھی منگوالو۔ اللہ کریم کرے گا۔

□ رخشندہ۔ ڈسک

o: بابا جی! آداب و نیاز! میں نے جس کام کے لیے براہ راست آپ سے تعویذ منگوا یا تھا، خدا کے

دھوکے سے وہ پورا ہو گیا ہے۔ آپ نے اطلاع دینے کو کہا تھا لہذا اطلاع بھی دے رہی ہوں اور شکر یہ بھی ادا کر رہی ہوں۔ خداوند کریم آپ کو اجر دے کہ آپ نے دو گھروں کو برادر ہونے سے بچا لیا ہے۔

☆: مینی رخشندہ! گنگرے کا موندی ریم و کریم اور قادر مطلع بنی جاتا ہے۔ میں تو اس کا ناجیز بندہ ہوں اس لیے میرا لشکر یہ ادا کرنے کی بجائے اسی کا لشکر ادا کرو اور نماز کی پابندی کرتی رہنا۔

□ شہناز۔ چنڈی

☆: مینی شہناز! اللہ تمہاری دعا میں قبول فرمائے۔ (آمین) زندگی بے شک بہت مشکل ہے اور بعض اوقات تو بہت ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر کامیابی صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو ہمت اور صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تم کہیں ہرنماز کے بعد 222 مرتبہ پڑھو۔ "اللہ اللطیف الرحیم" مدت 41 دن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھ سے تعویذ بھی منگوالو۔ حسب استطاعت خیرات کیا کرو۔ انشاء اللہ کریم ہوگا۔

□ جنید۔ خیر پور

☆: مینی جنید! تمہارا خط طوالت کے باعث شائع نہیں کیا جا رہا۔ انسان کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو باہر آنا چاہیے اور اس کے لیے لفظ دوست بہت ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ دوست کوئی ہم عمر ہی ہو۔ تمہارے والد، بھائی، بہن یا والدہ کوئی بھی تمہارا اچھا دوست بن سکتا ہے۔ اصل دوستیاں وہی ہوتی ہیں جو بچپن سے چلی آ رہی ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ صرف ضرورت کے تحت دوست کرتے ہیں۔ لوگوں سے خوش اخلاقی سے ملا کر دو اور ایک فاصلہ رکھا کرو کہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ تم ان پر مسلط ہو رہے ہو۔ ہنسنا بولا کرو۔ اگر کوئی بات انہیں نہ لگے تو ضروری نہیں ہوتا کہ کل کر مخالفت کی جائے۔ سب سے بہتر طریقہ خاموش ہو جانے کا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور صرف یا حید کا کثرت سے ورد کرو۔ اپنی کتب کا فرض میں مطالعہ ضرور کیا کرو۔ فارغ وقت کا اس سے اچھا مصرف اور کچھ نہیں

□ ارم۔ کراچی

☆: مینی ارم! نماز کی مکمل پابندی کرو اور ان تمام افعال سے پرہیز کرو جن میں اللہ جل شانہ، اور اس کے حبیب ﷺ نے ناپسند فرمایا ہے۔ بعد نماز فجر سورۃ

آل عمران کی آیت نمبر 14 سے 18 تک ایک مرتبہ ضرور تلاوت کر لیا کرو۔ اگر بعد نماز فجر موقع نہ ملے تو مجبوراً بعد نماز عشاء بھی ان آیات کی تلاوت کر سکتی ہو۔ ان آیات مبارک کو مستقل طور پر اپنا ورد بنالو۔ جب دل زیادہ گھبرائے یا پاپی کا غلبہ ہو تو ان آیات جلیلہ کو بلند آواز سے تین مرتبہ پڑھ لیا کرو کیونکہ دل میں مختلف قسم کے دوسو سے اوپر پاپی شیطان پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ در ذیل عمل بھی کرلو۔

بعد نماز عشاء و رکعت نماز نفل نماز حاجت کے طور پر ادا کرو۔ نماز حاجت کے بعد ایک مرتبہ ”سبح فاطمہ“ پڑھو پھر ایسی جگہ تہ رخ پیچ کر۔ ”سورۃ آل عمران“ کی آیات نمبر 26-27-40 مرتبہ ورد کرو۔ جب چالیس مرتبہ پڑھ چکے تو ایک سفید کاغذ پر خوش خط انداز میں لفظ ”نجوم“ لکھو اور اسے اس جگہ پر چسپا کر دوں جہاں تم نماز ادا کرتی ہو۔ ایک بات کا دھیان رکھنا کہ اس کمرے میں کبھی جاندار کی تصویر نہیں ہونا چاہیے۔ یوں تو کھرے کی کبھی حصے میں تصویر کا ہونا جائز نہیں ہے لیکن اس کمرے میں خاص طور پر اس بات کا دھیان رکھنا۔ اب آئندہ سے اس لفظ ”نجوم“ کے حروف کو غور سے دیکھو اور سورۃ آل عمران کی مذکورہ آیات مبارک کا ایک مرتبہ ورد کرو۔ اسی طرح اس لفظ کے حروف کو 40 مرتبہ دیکھو اور ہر مرتبہ سورۃ آل عمران کی مذکورہ آیات مبارک کا ورد کرتی رہو۔ اس سربلغ الاثر عمل کی مدت چالیس روز ہے۔ ناشے کے دن شمار کر کے بعد میں پورے مگر لیما۔ چالیس روز کے بعد تم خود اس رب رحیم کی رحمت کے نظارے دیکھو گی۔ وہ مہربان آقا ایسی رحمتیں نازل فرمائے گا کہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ بس اس رب رحیم کی ذات برکات پر پختہ یقین اور اعتماد شرط ہے۔ (وہ تمام احباب جو تکہ دینی میں مبتلا ہیں یہ عمل کر سکتے ہیں، میری طرف سے اجازت ہے، بس نماز کی مکمل پابندی اور دروغ گوئی، حسد، غیبت اور دوسروں کا دل دکھانے سے پرہیز کریں)

فاطمہ۔ لاہور

بہن فاطمہ! ہر نماز کے بعد ایک ”سبح“ (ایک تعبد و ایک تسبیح) پڑھنے کے بعد انتہائی خضوع و خشوع اور

خلوص نیت سے اپنی حاجت اس مہربان آقا کے حضور پیش کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ ”سورۃ طہ“ کی آیات نمبر 131-132 ہر نماز کے بعد کثرت پڑھو۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری جائزہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ اس عمل کی کوئی مدت نہیں۔ جب تک حالات میں بہتری کے آثار پیدا نہ ہوں، یہ عمل کرتی رہو۔ دو ماہ بعد مجھے نتائج سے مطلع کرنا۔ دوسرے مسئلے کے لیے تمہیں تعویذ دیکھوانے کا کہوں گا۔

سورہ۔ انک

○ بابا بی! السلام علیکم! میں نے دو ماہ قبل آپ سے اپنے مسئلے کا حل دریافت کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں کے طفیل میرا مسئلہ حل ہو گیا ہے اور مجھے بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ بابا جی! میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں۔ جن سے آپ کا شکر یہ ادا کر سکوں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق خیرات بھی دے رہا ہوں۔

☆ بیٹے سرور! شکر یہ میرا نہیں بلکہ اس مالک حقیقی کا ادا کر جس نے مجھ جیسی دکھناہ گار کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہر دم اس رب رحیم کا شکر ادا کرتے رہنا اور نماز سے غفلت بھی مت برتنا۔ اپنی جائز آمدنی میں سے حسب استطاعت خیرات ضرور کرتے رہنا اور اس بات کا دھیان رکھنا کہ خیرات مستحقین تک پہنچے۔

□ ارشد خان۔ KPK

○ محترم و کرم بابا جی! السلام علیکم! آپ نے اب تک لاکھوں افراد کے مسائل حل کیے ہیں۔ میں بھی اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کزشتہ 15 سال سے بے روزگاری کا عذاب جھیل رہا ہوں۔ صرف ایک مہینہ اسکول میں پڑھائی ہے، اسے گھر کا خرچ چلانا ہے۔ مکان بھی کرائے کا ہے۔ خود خدائے دہا کے لئے کہ نفسا نفسی کے اس دور میں اپنا پر پاپی بھی ساتھ نہیں دیتا اور کوئی بھلاک تک ساتھ دے سکتا ہے۔ بابا جی! ابھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی اس فصول اور ناکارہ زندگی کا خاتمہ کر لوں مگر پھر ماں اور بہن مجھ کو کھینچ آجاتا ہے۔ میرے بعد تو وہ بالکل بے اسرا ہو جائیں گے۔ بابا جی! اب آپ ہی میری آخری امید ہیں۔ اللہ

کے واسطے مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ مجھے بے روزگاری کے اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔

☆ بیٹے ارشد! زندگی میں اس قسم کے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے یہ گویا بندے کی آزمائش ہوتی ہے۔ انسان کو کسی بھی صورت میں مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ پاپی کا شکار ہونا کفر کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ تم نے نماز بھی ترک کر دی ہے۔ اس غفور الرحیم سے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگو اور نماز کی پابندی کرو۔ یہ ایسی فرض عبادت ہے جو کسی بھی حال میں ترک نہیں کی جاسکتی۔ اسی کے ذریعے اللہ اور بندے میں تعلق قائم ہوتا ہے۔ تم اپنے دل سے یقین تو پیدا کرو کہ سب کچھ اسی کے در سے اور اسی کے حکم سے ملتا ہے اور ہر مانگنے والے کو ملتا ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ تم مجھ سے مانگو، میں تمہیں دوں گا اور یہ بات ذہن میں اچھی طرح سمجھا لو کہ اللہ رب العزت اپنے وعدے کے خلاف

علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! اس کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی دشمن کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خور سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکلیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دواؤں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفاء ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جواہر افغانی کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

88-C II حضرت فلور خانبان جامی کراچی۔ ونیش باؤ سنگ اتھارٹی۔ فیروزہ، کراچی

ہائیت پارک

دلی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

اعتبار و خلوص

اعتبار و خلوص کا راستہ بھی برا عجیب ہے۔ اس میں انسان آٹھیں بند کرے دوسرے شخص پر اپنا اعتبار و خلوص لٹا رہا ہوتا ہے۔ پر یہ آنکھیں جب کھلتی ہے جب وہی شخص دور کھڑے آپ کے خلوص کا مذاق اڑاتے ہوئے آپ کے اعتبار کو زیر و برز کر دیتا تو ایسے میں افسردہ نہ ہووے شخص تو اینٹا نظر دکھا کر چلا گیا۔ آپ اپنے خلوص و اعتبار کو سنبھال کر رکھیے اور اس اعتبار و خلوص کو وہاں لٹائیں۔ جو اس کے قابل ہے۔

زور قلم: فرخ آئیں کراچی

حکمت کی باتیں

☆ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو اسے نیک لوگوں کی عیب جوئی میں مشغول کر دیتا ہے۔ ☆ اگر تمہارے اعمال اور کردار سے اللہ کی مخلوق خوش ہو تو سمجھ لو کہ تمہارا بھی تم سے راضی ہے۔

☆ زندگی تب بہتر ہوتی ہے جب آپ خوش ہوتے ہیں لیکن زندگی تب بہترین ہوتی ہے جب آپ کی وجہ سے کوئی دوسرا خوش ہوتا ہے۔

☆ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھلا دے پر کسی کی دی ہوئی محبت اور عزت کبھی نہ بھلائے۔

☆ اپنا فائدہ سوچے بناسب کے ساتھ اچھائی کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

کنکری سونا ہو گئی

حضرت خالد بن عبدالعزیزؓ سے روایت ہے کہ پرانے وقت میں ایک حافظ اللہیث بہت ہی منطوق الحال اور حکمدار تھے۔ اور خوفِ خداوندی سے دن رات رویا کرتے تھے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عالم تنہائی میں انتہائی گریہ زاری کے ساتھ دعا مانگ رہے ہیں۔ مجھے ان کی غریبی پر بڑا ترس آیا تو میں نے عرض کیا کہ کیوں نہیں آپ خداوند عالم سے دعا مانگتے کہ وہ آپ کو اتنی دولت عطا فرمائے کہ آپ کی تنگ دستی دور ہو جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت نے دائیں بائیں مڑ کر دیکھا اور زیر سے کچھ کنکریاں اٹھائیں تو وہ سونا بن گئیں اور انھوں نے ان کو میری طرف پھینک دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصیحتوں کو خوب جانتا ہے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ان سونے کے ٹکڑوں کو کیا کروں۔ تو فرمایا کہ تم ان کو اپنے اہل و عیال پر خرچ کر دو۔ خالد بن عبدالعزیزؓ کا بیان ہے کہ میں اس حال اور ان کے جلال سے اس قدر خائف ہو گیا کہ ماسے ڈر کے ان کے فرمان کو مانا نہ سکا۔ اور میں ان سونے کے ٹکڑوں کو ساتھ لے کر بھلا آ گیا۔ ان واقعات سے ان متکبرین کو عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ جو اہلِاء اللہ کے خدا اور کرامات کے انکار اور بزرگانِ دین کی توہین کرتے ہیں۔ ان کو کیا خبر کہ وہ لوگ جو اپنی ایک نظر ذال کر سکیں کو سونا بنا دیتے ہیں۔

مراسلہ: ملک علی رضا۔ اسلام آباد

☆ زندگی میں اچھے لوگوں کی تاش مت کرو خود اچھے بن جاؤ شاید کسی کی تاش پوری ہو جائے۔ ☆ خوبصورتی ایک نعمت ہے لیکن سب سے خوبصورت آپ کی زبان ہے چاہے تو دل جیت لے اور چاہے تو دل حیر دے۔

انتخاب: ممتاز احمد۔ سرگودھا

یاد آتے ہو

ہمیں ایسا کیوں لگتا ہے بہت مصروف رہنا ہے تمہارے واسطے نعمت کہ یوں مصروف رہنے سے تمہیں پچھلی کوئی باتیں کوئی قصہ کوئی یادیں اذیت دے نہیں پائیں بہت مصروف رہتے ہو صبح سے شام ہونے تک سبھی جہم کہہ نہیں پاتے بہت تم یاد آتے ہو قسم سے یاد آتے ہو۔

شاعر: عہد سین انصاری۔ کراچی

پرہیز کی مہمان

مہمانوں کی جان کیواں قسم تو وہ ہوتی ہے۔ جو پرہیز غذا کھاتی ہے اور یہ کتنی نظر آتی ہے کہ ناجی چائے تو میں نہیں پیتا۔ دھابہ دیر کی کمی اور دو قلعے تو برے لیے زہر ہیں۔ لقمہ اندر گیا اور استریاں سوچی۔ چھڑی اور دلے کے سوا کچھ کھا ہی نہیں سکتا۔ رات سونے سے پہلے دودھ تو میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ہر کھانے کے بعد دو سیب..... میرے لیے کوئی تکلف نہ سمجھیے گا۔ میں کہاں یہ مرغن کھانے ہضم کر سکتا ہوں؟

پھر یہ کہتے ہی نظر آتے ہیں کہ میں مہمان تھوڑا سی ہوں۔ یہ تو میرا اپنا کھر ہے۔ آپ تکلف نہ کریں میں تو صرف دو وقت دودھ پیتا ہوں۔ ناشتے کے ساتھ ذیل روٹی، مکھن اور دو ہاف بوائل انڈے..... البتہ شام کو

حجامت

سے جو ادا نور اسلام آباد کا انتخاب

فوجی کمائڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی تقریر شروع کی۔ چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا۔ ”بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔“ لمبے بال رکھنے والے فوجیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کمائڈر نے کہا۔ ”آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں مگر ان کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ نہ ہو۔“ اس نے اپنے سر سے ٹوٹی اٹھا کر اپنی سولجر کٹ حجامت لکھائی۔ ”اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔“ سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوٹی اٹھائی وہ بھانچا تھا۔

ایک وعدہ

مرسلہ: شہناز احمد۔ کراچی
کتنے وعدے کئے تھے اس نے
یاد دلایا تو چونک گیا
اُسے وعدوں سے کیا بنا ہوا تھا
جو ایک وعدے کی آس رکھ نہ سکا
اپنے کہنے کا پاس رکھ نہ سکا

دفاع

شاعرہ: نوشہا صدیقی
مقدمے کی سماعت آخری مراحل میں تھی طرمن نے مطالبہ کر دیا کہ وہ اپنے وکیل صفائی کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے۔ اس لیے اسے وکیل تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے۔
جج صاحب بولے۔ ”پولیس نے تمہیں ڈاکا ڈالنے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ دکان دار نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے۔ زیورات بھی تمہارے قبضے سے برآمد



قارئین

اپنی شہنہ کو آزمائے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو بارہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں نوٹ قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار تجھے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

انعام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک کچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا

دعا نہ مانگو تو غم سے رہائی دیتا نہیں
سناں دیتا ہے کین دکھائی دیتا نہیں
نہدیم کویت ملی
اگرچہ پیار کا قصہ ہے دو دلوں کا مگر
ہے ایک تیسرا کردار بھی کہانی میں
پھر اس کے بعد یہی دھجیاں کتیریں گے
ابھی جو لوگ لگے ہیں قصہ خوانی میں
نیم شفیق..... اسلام آباد
ہوا سے کوئی تو کرتا ہے مخبری جاکر
چراغ جب بھی جلاتا ہوں روشنی کے لیے
کہ دشمنی تو ہماری سرشت ہی میں نہیں
ہمیں خدا نے بنایا ہے دوستی کے لیے
اکم افضل آزاد..... ساہیوال
کہاں تک بے ارادہ خوش رہیں گے
بھڑک کر ہم زیادہ خوش رہیں گے
یہ سوچا تھا کہ اگلے شہر میں جب
مکان ہوگا کشادہ خوش رہیں گے
رضوانہ کوثر..... لاہور

کھلتا نہیں آنکھوں پر افلاک گردش سے
سورج ہے کہ شعلہ ہے تارا ہے کہ چنگاری
آہ بچکم غزالاں ہے بشار ذرا رہنا
اک بچکم غزلتہ ہے مصرف طرصداری
کبھی چراغ بجھائے گا راستوں کے تمام
ترتیب انٹ کر جو دیکھے حروف کی
بارش سے ربط کوئی تو ہوگا شراب کا
آہم حبیہ..... اسلام آباد
اب دل کی دشتوں سے مرا واسطہ نہیں
اک نبض رازداں تجھی سو وہ بھی خوش ہے

ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تم آٹھ مرتبہ کے سزایافتہ ہوئے تمہارے خیال میں اب کوئی دوسرا دلیل تمہارے دفاع میں کیا کہہ سکتا ہے۔
مذہم نے جواب دیا۔ ”یہی تو میں جانا چاہتا ہوں۔“

وقت

مرسلہ: اسامہ ہلال اعوان۔ لاہور

ایک مسافر نے اسٹیشن پر کھڑے گاڑے سے پوچھا۔
”گاڑہ صاحب! کیا گاڑی چلنے میں اتنا وقت ہے کہ میں
چائے پی کر جاؤں۔“ گاڑہ نے مسافر کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔

”گاڑی آنے میں ابھی وقت ہے اور اس بات کا
یقین دلانے کے لیے میں خود آپ کے ساتھ چائے پینے
کے لیے جا سکتا ہوں۔“

غزل

مرسلہ: ممتاز اقبال اعوان۔ داروغہ والا لاہور

ابھی تو رات باقی ہے یہ دھل جائے تو سوجانا
میرے ہمدم دل نادان نہ بھینچل جائے تو سوجانا
سناؤں تم کو جی بھر کے میں اپنی داستانِ غم
تسے ہے ارمان اس دل کا نکل جائے تو سوجانا
مٹل بچکیاں، جینے کی حسرت، ٹوٹی سانس
گھڑی یہ سخت ہے تنہی یہ ٹل جائے تو سوجانا
تسارے مٹسکرائیں چاند کی سرگوشیاں سن کر
میری جاں یہ حسیں منظر بدل جائے تو سوجانا
مرے دلبر مرنے جانی ہمارے وصل کا لمحہ
یہ تنہائی کی ناکہ کو نکل جائے تو سوجانا
بہت سہا ہوا رہتا ہے خالد یہ دل نادان
یہ دل اک لمحہ بھر کو بھی بھل جائے تو سوجانا

اولاد کی پرورش کرنے کے چند اصول

شاعر: خالد یوسفی۔ سرگودھا

بچپن میں جو عادت بھلی یا بری پختہ ہو جاتی ہے وہ عمر
بھر نہیں جاتی۔ لہذا اس لیے چند باتوں کا خیال رکھیں۔
☆: عورتوں کی عادت ہے کہ بچوں کو ہمیں سیاسی
سے ذرا تفریق نہیں کہیں ڈراؤنی چیزوں سے۔ سو یہ بری بات

میل پیکل

حسن انتخاب: محمد ندیم عباس میوٹی۔ چوکی
خلیل جبران کا ایک دھوبی کھاتے سے گزر ہوا۔ وہاں
ایک دھوبی کپڑے دھوئے میں مصروف نظر آیا۔ خلیل جبران
نے اس سے پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو؟
دھوبی نے جواب دیا۔ ”میں کپڑوں سے میل پیکل
نکالتا ہوں۔ دھوبی نے خلیل جبران سے پوچھا آپ کیا
کرتے ہو؟
خلیل جبران نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم
کپڑوں کا میل پیکل نکالتے ہو اور میں دلوں کا میل
پیکل نکالتا ہوں۔“

دیر آید

مرسلہ: ریاض حسین عظیم چوہان۔ فصل آباد
میکسیکو کی ایک رومانی جو اہلہ بازی میں کوئی
فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ ان دونوں کا خیال تھا
کہ ہر کام بہت غور و خوض کے بعد کرنا چاہیے۔ لہذا وہ
دونوں منگلی کے بعد 62 برس تک شادی کے سوال پر
غور کرتے رہے اور آخر جب وہ ایک دوسرے سے
مطمئن ہو گئے تو انھوں نے شادی کر لی۔ شادی کے
وقت ان کی عمر 82 برس تھی۔

مرسلہ: کاشف عید۔ بٹگرام

کاشفِ فی خان..... کراچی
جیسے دھاگہ ہو کوئی تسبیح کا
میری سانسوں کے درمیاں تو ہے
شعبانِ کھوسہ..... کوئٹہ
تو نے اے عشق! یہ سوچا کہ ترا کیا ہوگا
میں ترے سر سے اگر ہاتھ اٹھا لیتا ہوں؟
عادل گلزار..... فیصل آباد
بخت جب سازگار ہوتا ہے
زرد موسم بہار ہوتا ہے
کرن شہزادی..... راولپنڈی
میں ہوں اخبارِ محبت مری پیشانی پر
روز اک آس کے مرنے کی خبر لگتی ہے
زینب علی..... ملتان
اب تو بس تیرا خیال آتے ہی
صرف احساسِ زیاں ہوتا ہے
یوں تو چھوڑ آئے ہیں ماں کا آنگن
دل مگر اب بھی وہاں ہوتا ہے
مقصود بلوچ..... دادو
طوفان کے باوجود سمندر ہے پرسکون
کشتی سے بادباں کا تعلق کچھ اور ہے
فائزہ تاز..... پری
بے حسی کا علاج کون کرے
آدی بھی مشین جیسا ہے
سلطان عمرانی..... سجادول
جو زندہ لوگ ہیں وہ دھیان رکھیں
مگر آباد اک زیرِ زمیں ہے
زمانہ شہر کی رونق میں ہے گم

بس اک شاداب ہی گوشہ نشین ہے
نعمان الطاف..... کراچی
اتنی ساری ضرورتوں کے بیچ
کسے ہوتا ہے خود کفیل کوئی
رہا ہے دل اس کی جانب کیوں
پاس اپنے نہیں دلیل کوئی
شاہدہ سعید..... پرورد
محدود کر نہ ذہن کی ہنگامہ خیزیاں
وہ آئینہ تراش کہ دنیا دکھائی دے
عابدہ بیگم..... کراچی
درد دل میں اٹھا تھا اچانک
کچھ نہ کچھ ہو رہے گا اچانک
میں ہوں رافعی عدم کا مسافر
ہار جائے دنیائی اچانک
جلیلہ کنول..... لیاری ایکسپریس کراچی
بغیر ہار جیت کے اگر کوئی فریق بھی
شکت اپنی مان لے تو پھر فساد کیسے ہو؟
نصابِ عشق کے سوا کچھ اور یاد کیسے ہو؟
ہمارے قول و فعل میں بھلا تضاد کیسے ہو؟
حاصم وقاص..... لاہور
ہم بے خبر تھے اور وہ زمانہ شناس تھا
ہر بار جیتنے کا ہنر اس کے پاس تھا
شازیہ رضوی..... کراچی
خواب ہی خواب بھیلی پہ لیے پھرتی ہوں
میرا یوسف کوئی تعبیر بتاتا ہی نہیں
خیمہ زن ہونے کو ہے پھر کسی صحرا میں حسن
میرا دل میرے قیلے میں ساتا ہی نہیں

میرا یہ پسندیدہ شعر ”سچی کہانیاں“ کی نذر ہے

کوپن برائے

تیرنیم
کش

اپریل 2016ء

نام:

پتا: